فروری 2020
خواتین ڈائجسٹ
www.pklibrary.com

کہی سُنی، مدیر 10
کرن کرن روشنی، ادارہ 11
ہمارے نام، نادرہ خاتون 28

آپ سے کیا پردہ

خاموش رہو، انشا جی 16

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 248

مجھ سے ملئے

باتیں عالیہ علی سے، شاہین رشید 17

انٹرویو

عابدہ احمد سے مُلاقات، شاہین رشید 22

ناول

تتلی جیسا پیار، راحت جبیں 36
رنگ ریز میرے، عفت سحر 172
حالم، نمرہ احمد 200

مکمل ناول

لمحوں کی خطا، نسیمہ ناز 70
سب جھوٹ نہیں ہوتا، گل ارباب 132

ناولٹ

خوشبو کا پیغام، ثمرہ بخاری 114

افسانے

میرے پر غمال، اجرہ ریحان 62
ایک کروڑ، حنا بشریٰ 109
خلاء، نور نظر 129
غلطی، شازیہ الطاف ہاشمی 191
تیّت، تحسین گل 195
راستہ دیکھتی مائیں، طاہرہ کاظمی 236

نظمیں غزلیں

غزل، ادا جعفری 239
غزل، ساغر صدیقی 240
نظم، مسباس گل 239
غزل، ناصر ملک 240

رنگا رنگ پھول

رنگا رنگ سلسلہ ، شگفتہ حیاء 241

خبریں وبریں ، واصفہ سہیل 250

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے ، خالدہ جیلانی 247

پکوان

آپ کا باورچی خانہ ، ارجمند شاہین 254

موسم کے پکوان ، خالدہ جیلانی 252

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں ، عدنان 256

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے ، امت الصبور 258

راحت جبیں

تتلی جیسا پیار

اس گھر میں دو بھائی زبیر اور سرمد اپنی بیویوں ثمینہ اور ساجدہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ زبیر اور ساجدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا دانیال تھا۔ بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی جبکہ سرمد اور ثمینہ کی دو بیٹیاں تھیں روشانے اور زوباریہ۔ روشانے کی منگنی دانیال سے ہو چکی تھی۔

زوباریہ پورے گھر کی لاڈلی میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ پڑوس میں رہنے والا صائم، فائقہ اور ابراہیم کی اکلوتی اولاد تھا۔ زبی اور صائم میں بچپن سے بہت دوستی تھی، دونوں لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ فائقہ کو زبی کا یوں چھت پھلانگ کر اپنے گھر آنا اور صائم سے بے تکلف ہونا برا لگتا تھا، ان کے خیال میں وہ اب بڑے ہو گئے تھے، اس لیے زبی کو خاص طور پر احتیاط کرنا چاہیے۔

صائم کالج کے دوستوں کی پارٹی میں زیبی کو لے جاتا ہے۔ جہاں ایک دوست زیبی سے فری ہوتا ہے پھر اس کا نمبر لے کر زیبی سے بات کرتا ہے۔ زیبی صائم کی غلط فہمی میں شہیر سے بات کرتی ہے اور تحفے وصول کرتی ہے، پتا چلنے پر پریشان ہوتی ہے۔ صائم کا شہیر سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔

زوباریہ کے کہنے پر صائم اپنا گٹار توڑ دیتا ہے۔ صائم اس سے معافی مانگتا ہے۔ زیبی اس کے لیے اپنی پاکٹ منی سے گٹار خرید لی ہے۔ اور صائم کی بالکونی میں کارڈ کے ساتھ رکھ دیتی ہے۔ صائم جان لیتا ہے کہ یہ کس کا تحفہ ہے۔

صائم اور زیبی چھت پر بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ فائقہ وہاں آ جاتی ہیں اور زیبی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر لے جاتی ہیں اور اس کے گھر والوں خاص طور پر ثمینہ کو کھری کھری سناتی ہیں۔ دانیال بھی وہاں آ جاتا ہے۔ فائقہ دانیال کو کہتی ہیں کہ اپنے گھر کی عزت سنبھالو۔ دانیال کہتا ہے کہ رائی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ ثمینہ زوباریہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی ہیں۔

گھر پہنچنے پر صائم فائقہ سے بحث کرتا ہے۔ ابراہیم بھی فائقہ پر ناراض ہوتے ہیں۔ صائم زوباریہ کے گھر معافی مانگنے جاتا ہے مگر ثمینہ اسے سخت سست سنا کر دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

روشانے کی شادی ہو رہی ہے زیبی اداس ہے کہ اس نے تو تمام پروگرام صائم کے ساتھ بنائے تھے۔

سب کے سونے کے بعد زیبی کھانا پلیٹ میں لے کر چپکے سے بالکونی میں جاتی ہے صائم وہاں موجود ہوتا ہے۔ فائقہ بھی ان کے پیچھے آتی ہیں اور سیج کر کے دانیال کو اوپر بلاتی ہیں، دانیال دونوں کو آ کر تھپڑ مارتا ہے اور زیبی کو لا کر روشانے کے کمرے میں اس کے سامنے پھینکتا ہے۔

صائم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست مراد کے گھر میں کمبائن اسٹڈی کے بہانے رہتا ہے۔ اس کے والد کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ مراد کا گھر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک فون کال آتی ہے کہ صائم کو گولی لگی ہے۔ وہ ہاسپٹل جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے گولی اس کے بازو کو چھو کر گزری ہے، وہ اسے گھر لے آتے ہیں۔ زیبی کے لیے صائم کا رشتہ آتا ہے۔ وہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ فائقہ کے اصرار پر زیبی کو بلایا جاتا ہے۔ وہ انکار کر دیتی ہے۔ صائم دنگ رہ جاتا ہے۔

صائم فائقہ سے معافی مانگ کر کہتا ہے کہ وہ اب اپنی پڑھائی پر توجہ دے گا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ دونوں پھر ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ تب فائقہ ان سے کہتی ہیں کہ وہ دونوں دو تین سال ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ پھر وہ ان کا ساتھ دیں گی۔

صائم ماں سے وعدہ کر لیتا ہے کہ وہ ان کی بات مان کر پڑھائی پر توجہ دے گا اور زوباریہ سے ملے گا نہیں، ابراہیم صاحب کہتے ہیں کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں ایسا کیسے ممکن ہے۔ زوباریہ کو صائم پر غصہ آتا ہے کہ اس نے ماں کی بات کیوں مان لی۔ فائقہ فون پر بات کی اجازت دے دیتی ہیں۔

روشانے اس بات پر بہت خوش ہوتی ہے کہ اب ان کے ملنے پر پابندی لگ گئی ہے اور صائم کا کمرہ نیچے شفٹ کر دیا گیا ہے۔

زوباریہ ایک دن سب سے نظر بچا کر صائم کے گھر پہنچ جاتی ہے سرمد صاحب بخار کی وجہ سے گھر میں ہوتے ہیں۔ روشانے غصے میں دروازے کی کنڈی لگا دیتی ہے ارباب سے کہتی ہے گھنٹی بجے تو دروازہ آپ کھولیے گا۔ ثمینہ کو پتا چلتا ہے تو وہ دم بخود رہ جاتی ہیں۔ زیبی صائم سے مل کر واپس آتی ہے دروازہ بند دیکھ کر گھنٹی بجاتی ہے۔ دروازہ پر زرد چہرہ لیے باپ کو کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ وہ موبائل لے کر ــــ دیکھتے ہیں اور اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ صائم سے کس حد تک رابطے میں ہے۔

گھر میں سب کو پتا چل جاتا ہے کہ صائم کا رشتہ زیبی کی مرضی سے آیا تھا۔ سرمد صاحب ابراہیم اور فائقہ کے پاس جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اتنی کم عمری میں اس کی شادی یا رشتہ نہیں کر سکتے۔ ان کے انکار پر وہ زوباریہ کا رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ صائم کو نانا کے پاس دوسرے شہر بھیج دیا جاتا ہے۔

سرمد بیٹی کے لیے کھانا لے کر کمرے میں جاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ وہ باپ یا صائم میں سے کسے چنے گی۔ صبح وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ زیبی کی خوشی کا خیال کریں گے اس کی شادی صائم سے ہی کریں گے۔ زیبی صائم سے رابطہ کر کے اپنی منگنی کا بتاتی ہے دونوں بھاگ کر نانا کے پاس لاہور جا کر نکاح کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ زیبی اور صائم گھر چھوڑ دیتے ہیں۔

چوتھی قسط

فائقہ نے تلاوت کے بعد قرآن پاک رکھا ہی تھا کہ باہر مسلسل گھنٹی بجنے لگی۔
''خدا خیر کرے.....اس وقت کون آ گیا۔'' فائقہ نے دہل کر ابراہیم کو دیکھا۔
''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ جوتا پہن کر باہر کی طرف بڑھے تو رہا فائقہ سے بھی نہیں گیا۔ ابھی برآمدے میں ہی پہنچی تھیں کہ دانیال اور ثمینہ بوکھلائے ہوئے اندر آئے۔
''کیا ہو گیا دانیال! خیر تو ہے تم اتنی صبح۔'' حیران پریشان ابراہیم ان کے پیچھے تھے۔
''صائم کہاں ہے؟'' کیسا کھا جانے والا انداز تھا۔ فائقہ دہل سی گئیں۔
''کیا ہوا، صائم کا کیوں پوچھ رہے ہو؟''
''فائقہ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ بتا دو، ان دونوں کو کہاں چھپایا ہے۔'' ثمینہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ساری اکڑ تو بیٹی کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی۔
''کن دونوں کو.....؟''
''انجان مت بنیں۔'' دانیال چلایا۔ ''وہ دونوں گھر سے بھاگ گئے ہیں۔ خدا انہیں غارت کرے۔''
''بد دعائیں مت دو۔'' فائقہ تڑپ اٹھیں۔ ''ہمیں کیا پتا کس کے ساتھ بھاگی ہے۔ صائم کو تو کئی دن ہوئے ہم اس کے نانا کے گھر بھجوا چکے ہیں۔''
''مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں.....'' دانیال دیوانہ وار آگے بڑھا.....اور ایک ایک کمرہ دیکھنے لگا۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی.....ثمینہ بیٹھ کر رونے لگیں۔ فائقہ نے ابراہیم کو دیکھا۔
''اباجی کو کال کر کے صائم کا پوچھو۔'' ابراہیم کے لہجے میں کئی خدشے بول رہے تھے۔ فائقہ کو غصہ آ گیا۔
''آپ بھی حد کرتے ہیں۔ ان کی بیٹی کی منگنی بغیر کسی ڈسٹربنس کے ہو جائے۔ ہم نے صائم کو دوسرے شہر دھکا دے رکھا ہے اور آپ کہتے ہیں۔''
''جو کہا ہے، وہ کرو.....'' ابراہیم کے لہجے میں ہلکی سی سختی در آئی۔
فائقہ نے ہونٹ چباتے ہوئے موبائل تلاشا اور ان کے پاس آ کر نمبر ملانے لگیں۔ دانیال گھر کو خالی پا کر ان کے پاس آ کھڑا ہوا.....بند مٹھی کھولتا، بند کرتا وہ کتنا مضطرب تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا۔
''ابراہیم صاحب! یہ وقت پردے ڈالنے کا نہیں ہے۔ ہمارے گھر کی عزت داؤ پر لگی ہے۔ اگر کچھ پتا ہے تو پلیز بتا دیں۔''
''اباجی السلام علیکم.....'' ابراہیم کی توجہ فائقہ کی طرف ہو گئی.....انہوں نے بس دانیال کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
''میری صائم سے بات کروا دیں۔'' فائقہ کے لہجے میں پورا یقین تھا۔ جیسے اب فون صائم کے ہاتھ میں جائے گا اور وہ اگلے لمحے اس کی آواز سن رہی ہوں گی۔ مگر اباجی کی بات سن کر ان کی رنگت فق ہوئی۔ ان کی رنگت دیکھ کر ابراہیم کا دل دھک سے رہ گیا۔
''صائم تو کل ہی واپس آ گیا تھا۔'' انہوں نے مرے مرے لہجے میں بتایا۔
یہ سن کر ثمینہ نے مزید اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔
''دیکھا! میں کہہ رہا تھا اتنا پارسا نہیں ہے آپ کا بیٹا کہ شرافت سے وہاں بیٹھا رہتا.....وہ آیا اور زیبی کو ورغلا کر ساتھ لے گیا۔''
''وہ پارسا نہیں تو کیا تمہاری زیبی پارسا ہے.....وہ کیوں بھاگی.....ننھی بچی ہے جو ٹافی کے لالچ میں ساتھ چلی گئی۔'' فائقہ پھٹ پڑیں۔

اس نئی افتاد نے سب کو بوکھلا دیا تھا۔ قصوروار دونوں کے بچے تھے..... اور دونوں گھر ایک دوسرے پر الزام رکھ رہے تھے۔

''خدا کے لیے آپ لوگ چپ ہو جائیں۔'' ابراہیم نے بلند آواز میں دونوں خواتین کو خاموش کروایا۔

''کیا یہ وقت آپس میں لڑنے جھگڑنے کا ہے۔ اگر آپ کے گھر کی عزت داؤ پر لگی ہے..... تو میرا بیٹا بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ ہمیں مل کر انہیں ڈھونڈنا ہے۔''

''صائم اسے کہاں لے کر جا سکتا ہے۔ یہ صرف آپ لوگ بتا سکتے ہیں۔'' دانیال کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

''میرا موبائل لاؤ۔ میں اس کے دوستوں سے پتا کرتا ہوں۔'' ابراہیم نے فائقہ سے کہا تو وہ ناگواری سے ثمینہ کو دیکھتی اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

تب ہی روشانے ہانپتی کانپتی بھاگتی ہوئی آئی۔

''امی! دانیال! جلدی گھر چلیں ابو کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔''

گھر سے بھاگنے والے یہ تھوڑی سوچتے ہیں کہ پیچھے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔

☆☆☆

زوباریہ کمرے میں موجود اکلوتے پلنگ پر چوکڑی مارے دیوار سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ گود میں رکھے خاموشی سے سامنے بیٹھے صائم کو دیکھ رہی تھی۔ جو بیڈ کے کنارے دونوں پاؤں ٹکائے کرسی پر بیٹھا موبائل پر مصروف تھا۔ یہ مراد کے گھر کا سرونٹ کوارٹر تھا۔

مراد کو قائل کرنا کہ وہ انہیں چند گھنٹوں کے لیے یہاں ٹھہرنے دے۔ بہت مشکل مرحلہ تھا اور صائم ہی جانتا تھا کہ اس نے مراد کو کن دقتوں سے منایا تھا۔ مراد کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اور صائم جانتا تھا کہ مراد گھر میں اکیلا ہوگا۔

دونوں رات کے دو بجے وہاں پہنچے تھے۔

مراد چوکیدار کی نظر بچا کر انہیں اندر لایا تھا۔

انہیں صبح پانچ بجے کی ٹرین سے نکلنا تھا۔ اور تب تک کے لیے یہ ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔

''سوری، میں گیسٹ روم بھی کھلوا سکتا تھا۔ مگر میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔'' مراد کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ جیسے وہ ان کی مدد کر کے پچھتا رہا ہو۔ وہ بات کرتے ہوئے زوباریہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اسے یہ لڑکی بہت بری لگ رہی تھی۔

وہ صائم کی خاطر گھر والوں کو چھوڑ آئی تھی۔

یہ بات اسے موویز میں جتنی بھی اٹریکٹ کرتی ہو۔ اس وقت اسے یہ سب بہت برا لگ رہا تھا۔ بس وہ دوستی کے نام پر بلیک میل ہو گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر ردا کا خیال آ رہا تھا۔

''نہیں یار! تم نے ہمارے لیے بہت کیا ہے۔ ہم صبح ہونے سے پہلے ہی نکل جائیں گے۔'' صائم نے ممنون انداز میں مراد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

مراد نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ چاہتا تھا۔ یہ چند گھنٹے منٹوں میں گزر جائیں۔

''تم لوگ ریسٹ کرو۔ میں کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔''

''کھانے کی ضرورت نہیں ہے مراد بھائی.....'' زوباریہ نے جلدی سے کہا۔ بھائی کا لفظ بھالے کی طرح

مراد کو لگا تھا۔ تب ہی وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ صائم نے موبائل سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''گھر میں کیا ہو رہا ہوگا؟''

''رات کے دو بجے سب سکون سے سو رہے ہوں گے۔'' صائم نے موبائل پاور ڈ آف کر دیا۔

''تمہیں اپنے گھر والوں کی ذرا پروا نہیں۔'' وہ چڑ گئی۔

''کیونکہ میں اس وقت تمہارے ساتھ ہوں۔ صرف تمہارے لیے سوچ رہا ہوں اور تم آدھی یہاں ہو اور آدھی وہاں.....''

صائم کے ایک جملے نے لڑکے اور لڑکی کی فطرت کو کھل کر بیان کر دیا تھا..... تب ہی تو لڑکیاں ایسی صورت حال میں ثابت قدم نہیں رہتیں ہمیشہ دو حصوں میں بٹی رہتی ہیں۔

''میں نے تو کبھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ گھر سے بھاگ کر شادی کروں گی۔'' زوباریہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

''اور میں تو بچپن سے پلاننگ کرتا آ رہا ہوں۔'' زوباریہ کی براؤن آنکھوں میں تیکھا سا تاثر ابھرا۔

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔''

''میری مجال..... ویسے سچوئیشن تو کچھ فلمی فلمی سی ہے۔'' صائم نے ٹرے پاس کھینچ کر ڈھکن اٹھایا۔

''دعا کرو۔ زیادہ فلمی نہ ہو جائے۔ ابھی مراد کے گھر والے شادی سے واپس آ جائیں۔ یا اسٹیشن پر دانیال بھائی آ جائیں۔'' زوباریہ کو صائم کا اطمینان غصہ دلانے لگا تھا۔ صائم نے بدمزہ ہو کر اسے دیکھا۔

''اللہ نے صورت کیا اچھی دے دی۔ تم نے تو قسم ہی کھالی ہے..... بات اچھی نہیں کرنی۔''

''صائم! سب ٹھیک ہو جائے گا نا.....'' اندر کی کیفیت سے گھبرا کر اس نے صائم کا ہاتھ تھام لیا۔

''مجھے سو فیصد یقین ہے..... ہم کوئی دھکے کھانے تو جا نہیں رہے۔ نانا کو منا کر نکاح کریں گے اور فوراً واپس آ جائیں گے۔ بلکہ آنے سے پہلے نانا سے کہیں گے، وہ گھر میں بات کر لیں..... اور مجھے پورا یقین ہے، وہ سب ٹھیک کر لیں گے۔''

اس کا ہاتھ تھپتھپا کے وہ تسلی دینے لگا۔ زوباریہ ہلکا سا مسکرائی۔

''تھینک گاڈ، اب یہ میکرونی کھالیں..... جو ہم آل ریڈی ٹھنڈی کر چکے ہیں۔'' اس نے چمچہ بھر کے ذوبارہ کی طرف کیا..... تو اس نے منہ کھول کر نوالہ لیا۔

''ابھی زیادہ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔''

☆☆☆

ٹھیک تو کر رہے ہیں۔ جب کوئی ان کی نہیں سنے گا تو وہ یہی کریں گے..... یہ ان کی زندگی ہے۔ وہ جس طرح چاہیں گزاریں۔ کسی کو ان کے راستے میں نہیں آنا چاہیے۔

کھڑکی میں کھڑے مراد نے سرونٹ کوارٹر پر آخری نظر ڈالی اور سلائڈ برابر کر کے مڑا۔ وہ کب سے خود کو تسلیاں دے رہا تھا..... تاکہ یہ چند گھنٹے سکون سے گزار لے۔ سامنے دیوار پر تصویریں لگی تھیں۔

ان کی فیملی پکچرز، جس میں ماما، پاپا تھے، مراد خود تھا اور ردا۔

اس کے کندھے سے لگتی ردا، منہ چڑاتی، ہنستی مسکراتی۔ ایسی ہی تصویریں زوباریہ کے گھر کی دیواروں پر بھی لگی ہوں گی۔

وہ بے چین ہو کر بیڈ کے کنارے آ بیٹھا۔

تب ہی اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ فائقہ کی کال تھی۔
نہیں، وہ یہ کال نہیں ریسیو کرے گا۔ یوں بھی رات کے اس پہر وہ سو رہا ہے۔ خود کو دھوکا دینے کے لیے وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ مگر بیل وقفے وقفے سے ہوتی چلی گئی۔ اس نے جھنجھلا کر کال لی۔
"آنٹی! اس وقت خیریت....."
"صائم کہاں ہے؟" فائقہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ وہ ایک لمحے کو گڑبڑا گیا۔
"گھر پر نہیں ہے؟"
"گھر پر ہوتا تو میں رات کے اس وقت اسے ڈھونڈنے کے لیے تمہیں کال کر رہی ہوتی وہ اور زوباریہ..... انہوں نے گھر چھوڑ دیا ہے..... تم اس کے دوست ہو کوئی اشارہ کوئی بات اس نے کچھ تو کہا ہوگا۔"
مراد نے بے چینی سے پیشانی سہلائی۔
اف، مشکل ہی مشکل تھی۔ وہ کس طرح التجا کر رہی تھیں۔
"صائم نے ہمیں بہت بری سچویشن میں پھنسا دیا ہے..... اور زوباریہ وہ جانتی ہی نہیں اس کے گھر پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔"
"ک..... کیا ہوا؟" مراد کی آواز پھنس گئی۔
"اس کے ابو ہاسپٹلائز ہیں۔ نجانے ہارٹ اٹیک ہوا ہے یا۔"
انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا..... مراد نے بے بسی سے طلوع ہوتی صبح کو دیکھا۔ اس کی سوچوں کے گرداب میں پھنسی رات کب بیتی کب اذان ہوئی، اسے کچھ خبر نہیں تھی وہ سمجھ رہا تھا، فائقہ نے اسے رات میں کال کی مگر باہر دھند سے پاک روشن صبح تاریکی کی گود سے جنم لے رہی تھی۔ بہت بھیانک خواب تھا۔ زوباریہ ہڑبڑا کر جاگی۔ کرسی پر جھولتا صائم بھی گھبرا کر اٹھا۔
"کیا ہوا؟" زوباریہ حواس باختہ سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔
"ک..... کوئی رو رہا تھا۔"
"کوئی بھی نہیں ہے۔ زی میری طرف دیکھو یہاں صرف ہم ہیں۔"
"صائم، صائم گھر کال کرو۔" زوباریہ کی نظر تکیے پر رکھے صائم کے موبائل پر پڑی تو جھپٹ کر اس کی طرف بڑھایا۔ صائم نے موبائل ہاتھ سے لے کر جیب میں ڈال لیا۔
"میں تم سے کہہ رہی ہوں گھر کال کرو۔"
صائم نے پاس بیٹھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔
"ہم اس وقت گھر کال نہیں کر سکتے....."
زوباریہ بے بسی سے اسے دیکھے گئی۔
"آئی ہوپ وہاں سب ٹھیک ہوگا۔ پھر بھی پھر بھی اگر تمہارے دل میں کوئی ڈاؤٹ ہے تو ہم واپس جا سکتے ہیں۔"
زوباریہ کچھ لمحے اسے دیکھے گئی پھر نفی میں گردن ہلا دی۔
"نہیں میرے اندر کوئی ڈاؤٹ نہیں ہے۔"
"تمہیں اب جانا چاہیے۔" مراد کی آواز پر دونوں چونکے صائم کھڑا ہو گیا۔ مراد کی آنکھیں سرخ اور چہرے پر اضطراب تھا۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو وقت زیادہ ہو گیا ہے۔"

''سوری، ناشتہ نہیں کروا سکوں گا۔ راستے میں کچھ لے لیں گے۔''
''کیا بات کر رہے ہو یار۔ تم آل ریڈی ہمارے لیے بہت کچھ کر چکے ہو..... تھینکس یار تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔'' صائم جذباتی ہو کر اس کے گلے آ لگا۔
زوباریہ نے اپنی جیکٹ پہنی اسکارف لپیٹا۔
مراد خاموشی سے زوباریہ کو دیکھ رہا تھا۔
کیا میں بتاؤں کہ اس کے فادر ہاسپٹلائز ہیں۔ شاید یہ رک جائے۔
''کیا ہوا؟'' صائم نے اس کی بے توجہی بری طرح محسوس کی۔
''کچھ نہیں، تم لوگ فریش ہو جاؤ۔ میں تم لوگوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کرتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا۔
ہو سکتا ہے باپ کی بیماری کی خبر سن کر وہ رک جائے۔ مگر وہ اپنے گھر میں کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تب ہی اس نے انہیں اسٹیشن ڈراپ کرنے کے بعد فائقہ کو کال کی تھی۔

☆☆☆

ہسپتال کے سرد کاریڈور میں کالی شال اوڑھے روشانے اتنی حواس باختہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بیمار باپ کے لیے دعا مانگے۔ زوباریہ کی تلاش میں نکلے شوہر کی فکر کرے جس کی آنکھوں میں خون اترا تھا۔ یا فون کر کے ماں کی خیریت پوچھ لے جسے وہ عجیب سی حالت میں چھوڑ آئی تھی۔
ساجدہ ثمینہ کے پاس رک گئی تھیں۔ دانیال سرمد کو ہسپتال چھوڑ کر فائقہ کی کال پر جا چکا تھا اور تایا ابا، اس نے جھرجھری سی لے کر دور سے آتے تایا ابو کو دیکھا تو دوسرا ہٹ کا احساس ہوا۔ ساری دوڑ دھوپ زبیری صاحب کر رہے تھے۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔
''تایا ابو! ابو ٹھیک ہو جائیں گے نا.....''
''ہاں ان شاء اللہ.....'' وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گئے۔
''دانیال کی کال آئی؟''
''نہیں میں نے کی تو انہوں نے جھڑک دیا۔'' روشانے نے آنسو پیے اور پاس بیٹھ گئی۔
''اب مت کرنا کچھ پتا چلا تو بتا دے گا۔'' انہوں نے آنکھیں موند لیں۔
روشانے کا دل چاہا ان کے کندھے پر سر رکھ کر سارے آنسو بہا دے اور وہ نرمی سے اس کا سر تھپکتے رہیں مگر وہ ڈر گئی۔
اگر تایا ابو بھی رو پڑے تو.....
''ایک بار فون کر کے اپنی ماں کا پوچھ لو۔'' انہوں نے بند آنکھوں سے کہا تو وہ ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھنے لگی۔
کیا پوچھتی جانتی تو تھی کہ ماں کی حالت کیا ہے۔
ساجدہ ثمینہ کو سنبھالتے سنبھالتے ہار گئیں۔ ثمینہ کے اندر کا خوف امڈ امڈ کر باہر آ رہا تھا۔ خود ہی سوال کرتیں..... اور جواب کا سوچ کر ہی ڈر جاتی تھیں۔
''ابھی لوگ سرمد کی عیادت کو آئیں گے۔ روشانے کا پوچھیں گے تو کہہ دوں گی باپ کے پاس ہسپتال میں ہے۔ لیکن، لیکن اگر انہوں نے زوباریہ کا پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گی۔''
انہوں نے ڈر کر ساجدہ کا پلو پکڑ لیا۔

''ان کی لمبی زبانیں کیسے کاٹوں گی۔ یہ کام تو عزت دار لوگ کرتے ہیں اور ہماری عزت تو وہ اپنے ساتھ لے گئی..... بے عزتی کا اشتہار لگا گئی ہے۔ اب بتا میں آپا کس کس کو جواب دیں گے؟''

''وہ آجائے گی۔'' ساجدہ نے بے بسی سے اس کے بین سن کر تسلی دی۔

''نہیں آئے گی..... اور اللہ کرے کبھی نہ آئے۔''

''کیا کہہ رہی ہو.....''

''آپا! سب سے کہہ دیں۔ باپ ہسپتال گیا تھا۔ مگر میت زوباریہ کی آئی ہے۔'' وہ بین بھول کر سفاکی سے گویا ہوئیں۔ ساجدہ دہل گئیں۔

''اللہ نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہو۔ ناخن سے گوشت جدا ہوتا ہے۔ نہ کوکھ جنی اولاد کو جیتے جی مارا جا سکتا ہے..... نادانی کر گئی ہے۔ دانیال ڈھونڈنے گیا ہے۔ واپس لے آئے گا۔''

''دانیال سے کہیں واپس آجائے۔'' ثمینہ نے سختی سے گال رگڑ کر آنسو صاف کیے اور کھڑی ہو گئیں۔

''مجھے اب زوباریہ نہیں چاہیے۔ میں نہیں جانتی زوباریہ کون ہے، میری صرف ایک ہی بیٹی ہے روشانے.....''

ثمینہ نے اپنا کلیجہ نوچ کر اس پر ایڑی رکھ دی تھی۔

ساجدہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

''آج وہ لڑکی اپنی ماں کی دعاؤں سے بھی نکل گئی تھی۔''

☆☆☆

ٹرین کھڑی تھی اور اسٹیشن کی مخصوص گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ چائے ناشتے کی آوازیں..... اترتے چڑھتے مسافر، بچوں کا شور شرابا۔ بکسے گھسیٹتے، وزن اٹھاتے قلی..... وہ دونوں بھی ایک ڈبے میں سوار ہو گئے تھے۔ زوباریہ نے بیگ پیک اتار کر گھٹنے تلے دبا لیا۔

''میں کچھ کھانے کو لے آؤں۔'' صائم کو یاد آیا..... مراد نے کہا تھا ناشتہ راستے سے لے لیں گے۔ بعد میں نہ مراد نے کہا نہ صائم کو خیال آیا۔

''نہیں مت جاؤ۔'' زوباریہ نے گھبرا کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''اگر ٹرین چل گئی۔'' سامنے بیٹھی اونی ٹوپی اور لنڈے کی اونی چادر اوڑھے بھاری بھرکم عورت نے دلچسپی سے سامنے بیٹھے صائم اور زوباریہ کو دیکھا، اپنی وضع قطع اور حال حلیے سے دونوں خاصے امیر گھرانے کے لگ رہے تھے۔

''ایسے تھوڑی چلے گی..... میں آجاؤں گا۔''

''اگر تم ڈبا بھول گئے۔'' وہ مزید حواس باختہ ہوئی۔

''یار! میں کوئی بچہ ہوں۔'' صائم نے جھنجھلا کر بازو چھڑایا اور سامنے بیٹھی خاتون سے مخاطب ہوا۔

''آنٹی! پلیز تھوڑی دیر اس کا خیال رکھیے گا۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں تسلی سے بیٹھو۔ ٹرین چلنے میں ابھی وقت ہے۔ بھائی کو چیزیں لے آنے دو۔''

خاتون نے اپنی سمجھ کے مطابق کہا اور بھائی کا لفظ سن کر دونوں جی بھر کے بدمزہ ہوئے۔ تبھی ڈبے میں بھانت بھانت کی چیزیں بیچنے والے داخل ہو گئے تو صائم نے وہیں سے بسکٹ اور آلو والا نان خرید لیا۔

زوباریہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

جن رستوں کو قدم پہچانتے تھے۔ وہ اب پیچھے رہ گئے تھے۔

اور اجنبی راستوں پر وہ ایک قدم بھی صائم کی مرضی کے بغیر نہیں رکھ سکتی تھی۔

''لگتا ہے پہلی بار ٹرین میں سفر کر رہے ہو.....'' خاتون کی دلچسپی بڑھی اور انٹرویو شروع ہو گیا۔
''جی.....'' زوباریہ نے مختصر جواب دیا۔
''کہاں جا رہے ہو؟''
''نانا کے پاس۔''
''چائے والا.....'' کی آواز پر صائم چائے لینے لگا۔
''یہ جو تمہارا بھائی ہے۔ یہ ہی ساتھ ہے یا کوئی اور بھی ہے۔''
''وہ میرا بھائی نہیں ہے۔'' زوباریہ نے دانت پیسے۔
صائم دھپ سے زوباریہ کے برابر بیٹھا۔ چائے سے زیادہ زوباریہ کو سمجھانا تھا کہ وہ مزید پول مت کھولے۔ خاتون کی آنکھیں ابل آئیں۔
''تو پھر کون ہے۔''
''میرا کزن ہے۔''
''ہائے ہائے..... گھر والوں نے جوان لڑکی کو کزن کے ساتھ اتنے لمبے سفر پر بھیج دیا۔''
''دیکھیں آنٹی، ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ہمارے نانا بیمار ہیں۔ اس لیے ہم ان کے پاس جا رہے ہیں۔ آپ کے سوال جواب ختم ہو گئے ہیں تو ہم سکون سے بیٹھ جائیں۔'' صائم نے کوشش کی کہ لہجہ نرم رہے۔ مگر لہجہ اچھا خاصا بدلحاظ ہو گیا تھا۔ خاتون بڑبڑانے لگیں۔ صائم زوباریہ کے کان پر جھکا مگر سرگوشی کرنے سے پہلے نظر بھٹک گئی۔ ٹرین جیسے پوری رفتار سے دوڑی تھی۔
زوباریہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں کھڑکی سے باہر..... دونوں جیسے برف کے مجسمے ہو گئے تھے۔
دانیال اور ابراہیم کو نہیں۔ گویا موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا تھا۔
اگر وہ سیدھا اسی ڈبے کی طرف آئے تو.....
مگر دونوں کا رخ غالباً بزنس کلاس کی طرف تھا۔
اور ٹرین ابھی ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔
کتنا وقت لگتا انہیں وہاں سے یہاں آنے میں۔ صائم کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔
''ہمیں یہاں سے نکلنا ہے.....''
مگر اس تیزی سے زوباریہ کا ذہن کام نہیں کر پایا تھا۔ صائم کا ہاتھ تھامے ٹرین سے اترتے اور تیزی سے ہجوم میں گم ہوتے اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اس نے اپنا بیگ پیک نہیں اٹھایا تھا۔ جس میں اس کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان تھا۔

☆☆☆

دونوں اسٹیشن سے کچھ دور ایک نیم پختہ مکان کی اوٹ میں رکے تھے۔ زیبی تھک کر زمین پر ہی بیٹھ گئی۔ صائم نے اپنا بیگ اس کے قریب پھینکا۔
''سمجھ میں نہیں آتا۔ انہیں کیسے خبر ہوئی ہم ٹرین کے ذریعے جائیں گے۔ میں نے سوائے مراد کے اور کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اگر اسے بتانا ہوتا تو ہمارے لیے اتنا کچھ کیوں کرتا۔''
زوباریہ نے خاموشی سے صائم کا بیگ کھولا۔ پانی کی چھوٹی بوتل نکالی۔ پھر ایک دم چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

''صائم میرا بیگ.....''
صائم نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔
''کہاں رکھا؟''
''وہ.....'' زہی نے دماغ پر زور ڈالا۔ ''ٹرین میں رہ گیا۔''
''حد کرتی ہو یار۔'' صائم نے جھنجھلا کر دونوں ہاتھ جھٹکے۔ ''شکر ہے، میں نے اپنا بیگ تمہارے حوالے نہیں کر دیا تھا۔''
''اب کیا ہو گیا۔''
''کچھ نہیں۔'' اس کی اتری صورت دیکھ کر صائم کو ترس آ گیا۔ ''پانی پیو۔''
زوباریہ نے خاموشی سے بوتل منہ کو لگا لی۔
صائم نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا۔ میسجز اور کالز کی بھرمار تھی۔ آخری میسج فائقہ کی طرف سے تھا جسے پڑھ کر صائم کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔
''مجھے بھی پانی دو۔'' حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔ زوباریہ نے بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ صائم نے دو گھونٹ لیے۔ اور ڈھکن لگا دیا۔
''اب کیا ہو گا۔ اگلی ٹرین کب آئے گی!''
صائم خاموشی سے آ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔
''یہاں کیوں بیٹھ گئے ہو۔ جانا نہیں ہے۔''
''کہاں؟'' صائم نے بے توجہی سے زمین پر لکیر کھینچی۔
''نانا کے پاس۔'' زوباریہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔
''وہ ہمارا سن کر یہاں آ رہے ہیں۔ مما نے میسج کیا تھا۔''
زوباریہ نے پورا منہ کھول لیا۔
''کیا؟ صائم اب ہم کیا کریں گے۔'' مکڑی آپ اپنے جالے میں پھنس گئی تھی۔
''صائم! اب ہم کیا کریں؟'' زوباریہ نے اس کا کندھا دبوچ کر اپنا سوال دہرایا۔
''میں نہیں جانتا۔'' اس نے بے بسی سے دور کچے پکے مکانوں پر اترتی دھوپ کو دیکھا..... دھوپ جس میں ابھی حدت نہ تھی۔

☆☆☆

ثمینہ، سرمد صاحب کے بے جان ہاتھ پر پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ سرمد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر نے منع کیا تھا انہیں کسی قسم کا ذہنی دباؤ نہیں دینا مگر وہ انہیں پرسکون رکھیں تو کیسے؟
''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اچھی ماں نہیں بن سکی۔ اس کی تربیت نہیں کر سکی۔ اچھے برے کی تمیز نہیں سکھا سکی۔''
''امی، بس کریں۔ اب خود کو کوسنے کا کیا فائدہ۔ وہی بے عقل نکلی۔ اس سب میں آپ کی کیا غلطی۔'' روشانے نے تسلی دینا چاہی۔
''میری تو غلطی ہے۔ نہ اللہ کا حکم یاد رہا نہ معاشرے کے تقاضے۔ جوان لڑکے کو کھلم کھلا اپنے گھر میں آنے جانے کی اجازت دی۔ لڑکی کو خود اس کے ساتھ بھیج دیتی تھی..... ہائے سرمد صاحب! فالج تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔''

ثمینہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ''گناہ گار تو میں تھی۔''
سرمد نے اذیت کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔
روشانے بامشکل ثمینہ کو کمرے سے باہر لائی۔ جہاں زبیر صاحب کے پاس دانیال کھڑا تھا۔ ثمینہ کو بٹھا کر وہ ان کے پاس چلی آئی۔
''عزت و غیرت کے معاملے تھانے میں حل نہیں ہوتے۔''
روشانے کا دل دھک سے رہ گیا۔
''تو کیا کروں؟ میرے پاس کوئی اور آپشن ہے۔'' دانیال بگڑا۔
''دانیال! تحمل سے کام لو۔'' انہوں نے بیٹے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر دانیال کا ضبط جواب دے چکا تھا..... اور اس کے تیور ابراہیم نے بھی دیکھے تھے۔ تب ہی تو فون کر کے مراد کی منتیں کر رہے تھے۔
''وہ اسے لے کر ناتا کے پاس نہیں جا سکتا۔ فائقہ نے اسے میسج کر دیا تھا۔ مگر مراد بیٹا وہ تم سے رابطہ ضرور کرے گا۔ اس سے کہو مجھ سے بات کرے۔ میں اس کا باپ ہوں دشمن نہیں۔ دانیال اس پر اغوا کا الزام لگا رہا ہے۔ ماں باپ کے دباؤ میں زوباریہ نے بھی یہی کہا تو وہ بہت بری طرح سے پھنسے گا۔''
''مگر زوباریہ ایسا کیوں کہے گی۔ وہ تو اس سے محبت کرتی ہے۔'' مراد ہکلایا۔
''جہنم میں جائے محبت۔'' وہ پھٹ پڑے۔ ''دانیال اور پولیس سے پہلے میرا صائم تک پہنچنا ضروری ہے..... تمہاری سمجھ میں میری بات آ رہی ہے یا نہیں۔''
''جی، جی انکل! میں صائم سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔ آئی ہوپ وہ مجھ سے کانٹیکٹ ضرور کرے گا۔''
مگر صائم نے مراد سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے شک تھا کہ دانیال کو ان کے بارے میں مراد ہی نے بتایا تھا۔

☆☆☆

سادہ سا کمرہ اسلامی، تاریخی اور قانونی کتابوں سے بھرا ہوا تھا..... کمرے میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ کمرے کی واحد کھلی کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ مگر سرد ہوا دھوپ کی شدت کو کملا رہی تھی۔
مولانا عبدالرحمٰن ایک موٹی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔
ان کے عین سامنے صائم اور زوباریہ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھے، نئے طالب علموں کی طرح گھبرائے ہوئے تھے۔
گھبراہٹ میں انگلیاں مروڑتی زوباریہ نے کن اکھیوں سے عبدالرحمٰن صاحب کو دیکھا۔ صائم اپنا مدعا بیان کر چکا تھا۔ انہوں نے سنایا نہیں۔ بس وہ مسلسل ورق گردانی کر رہے تھے۔ زوباریہ نے بے چینی سے سر پر موجود اسکارف کو مزید ٹھیک کیا۔
''سر۔'' صائم نے انہیں متوجہ کیا۔
''کھڑکی بند کر دو بیٹا! ہوا سرد ہے۔'' انہوں نے نرمی سے کہا تو صائم نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ ہوا کا رستہ رک گیا تھا مگر کھڑکی کے شیشے دھوپ اور روشنی کو نہیں روک سکتے تھے۔
''میرے بارے میں کس نے بتایا؟''
''ایک دوست نے۔ اس نے آپ سے قرآن پاک پڑھا تھا۔''
''کون؟'' انہوں نے کتاب سے نظر اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔
''نام نہیں بتا سکتا۔ اس سے وعدہ کیا ہے۔'' صائم تذبذب بھرے انداز میں بولا۔
مولانا صاحب مسکرائے اور کتاب میں نشانی لگا کر کتاب بند کر دی۔

''ماشاءاللہ! وعدہ نبھانا آتا ہے۔ اچھی بات ہے۔'' پھر وہ زوباریہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''بیٹی! آپ کا کیا نام ہے۔''

''زوباریہ.....''

''پورا نام.....؟''

''زوباریہ سرمد.....''

''ماشاءاللہ! پیارا نام ہے۔ سرمد صاحب کہاں ہیں۔''

''جی.....'' زوباریہ ان کے اچانک سوال پر گڑبڑا گئی۔

''نکاح کرنے آئی ہیں۔ تو باپ، بھائی کوئی تو ساتھ ہوگا۔''

زوباریہ نے گھبرا کر صائم کو دیکھا۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''سر! ہمارے پیرنٹس راضی نہیں ہیں۔ اس لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ میں عاقل و بالغ ہوں۔ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ ہمیں پورا حق ہے کہ ہم اپنی مرضی سے زندگی گزاریں۔''

''بالکل.....'' انہوں نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ صائم کے اندر طمانیت کا احساس جاگا تو اپنا موقف مزید مضبوط کیا۔

''اس بات کی اجازت تو ہمارا مذہب بھی دیتا ہے۔''

''بالکل دیتا ہے۔ لڑکے اور لڑکی کی مرضی کے بغیر نکاح غلط ہے..... مگر۔'' انہوں نے ہلکا سا وقفہ دیا۔

''مگر ولی کی اجازت بھی تو ضروری ہے.....''

''ولی.....'' زوباریہ نے تعجب سے دہرایا۔

''جی بیٹی۔ آپ کا باپ بھائی یا کوئی بھی محرم رشتہ..... کنواری لڑکی کے نکاح کے لیے ولی کی اجازت ضروری ہے۔ ہاں بیوہ یا مطلقہ کو اپنی مرضی کی اجازت ہے۔'' انہوں نے دھیمے لہجے میں سمجھایا۔

''وہ لوگ مان رہے ہوتے تو پرابلم کیا تھی؟'' صائم جھنجھلایا۔

''تو انہیں مناؤ۔ مگر اس طرح گھر سے بھاگ کر والدین کی رضامندی کے بغیر نکاح کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ جبکہ ماں باپ کی ناراضی اللہ کی ناراضی ہے۔'' انہوں نے دونوں کے چہروں پر پھیلی ناگواری کو بغور جانچا۔

''صائم! گھر سے بھاگنے کا حوصلہ ہے تو گھر میں رہ کر اپنی بات منوانے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ ابھی کم عمر ہو۔ جا کر اپنی اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ ایک وقت آئے گا۔ جب وہ لوگ تمہاری بات سنیں گے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اور بیٹی تم برداشت کرلوگی۔ ساری زندگی تمہارے نام کے ساتھ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا لیبل لگے۔''

زوباریہ کی نظریں جھک گئیں۔

''سر! آپ سمجھتے نہیں ہیں۔'' صائم جھنجھلا گیا۔

''اس کے گھر والے زبردستی اس کی منگنی کہیں اور کر رہے ہیں۔''

''بیٹا! تقدیر ہم نہیں لکھتے۔ تقدیر اللہ لکھتا ہے۔'' انہوں نے زوباریہ کو دیکھا۔

''یہ اگر تمہارے نصیب میں لکھی ہے۔ تو اسے کوئی اور نہیں لے جا سکتا اور اگر تمہاری تقدیر میں تم دونوں کا ساتھ نہیں تو گھر سے بھاگنا بھی بے فائدہ ہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے سر آپ کا شکریہ۔ ہم نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔''

صائم ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ اس کے نوعمر چہرے پر ناگواری نمایاں تھی۔ زوباریہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''زوباریہ چلو.....''

زوباریہ نے سر اٹھا کر عبدالرحمن صاحب کو دیکھا۔

ان کی شفقت بھری مسکراہٹ پر سرمد صاحب کی مسکراہٹ کا شائبہ ہوتا تھا۔ وہ ذرا سا آگے کو جھکے اور اپنا ہاتھ زیبی کے سر پر رکھا۔

''میرے بچو! اللہ تم دونوں کو سیدھا رستہ دکھائے۔ میرا رب تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

وہ کسی بھاری سل کی طرح وہیں گر گئی تھی۔

☆☆☆

دور وہ لمبے درختوں سے گرتے پتوں کی آہٹیں۔

کائنات پر چھائی خزاں کی سرسراہٹیں۔

کولتار کی سرمئی سڑک شام کے دھندلکے میں ڈوبی کچھ اور سیاہ لگ رہی تھی۔

''اتنی دیر میں تو نکاح کا خطبہ تین بار پڑھا دیتے۔ جتنی دیر میں انہوں نے ہمیں لیکچر دیا ہے۔'' صائم نے جھنجھلا کر خشک پتوں کو اپنے قدموں تلے روندا۔

''نکاح ہو جاتا تو دونوں اپنے اپنے گھر کی حدت بھری فضا میں بیٹھے گھر والوں کی گرما گرم سن رہے ہوتے۔''

زوباریہ کی مسلسل خاموشی پر صائم نے گردن موڑ کر دیکھا..... وہ گم صم، خاموش اسی اداس شام کا حصہ لگ رہی تھی۔ صائم نے محسوس کیا۔ وہ ایک پاؤں دبا کر رکھ رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے ہلکی سی تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر آ جاتے۔

''کیا ہوا؟'' وہ فکرمندی سے رک گیا۔

''کچھ نہیں۔'' زیبی کی تھکی تھکی نگاہوں نے بیٹھنے کے لیے جگہ تلاشی۔ پھر وہیں فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ کر اپنا جوتا اتارنے لگی۔ صائم نے دیکھا اس کے پاؤں کا انگوٹھا سوج رہا تھا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' صائم نے بے اختیار اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھا۔

''رہنے دو۔''

''یار! دیکھنے تو دو۔''

''شاید کہیں بھاگتے ہوئے ٹھوکر لگ گئی۔''

''یہ تو بہت سوجن ہو رہی ہے، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہم کوئی میڈیسن لے لیتے۔'' صائم نے نرمی سے انگوٹھے کو سہلایا۔ زوباریہ کے منہ سے سسکاری نکلی۔

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر آئیں۔

صائم دکھی سا ہو گیا۔

زیبی کا اترا چہرہ۔

مدھم رنگت۔

آنکھوں میں بھنور۔

''صائم! اپنے نانا کو کال کرو۔ وہ جہاں ہیں، ہم وہاں چلے جاتے ہیں اس طرح سڑکوں پر کب تک بھٹکیں

گے۔"

"تم تھک گئی ہو۔" صائم نے آہستہ سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"مجھے ڈر بھی لگنے لگا ہے۔ رات ہو جائے گی۔ ہم کہاں جائیں گے۔"

زبی نے سر اٹھا کر درختوں کو دیکھا اور خوف زدہ ہو کر شام کی آخری ہچکی کو سنا۔

صائم تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو، ہمیں رات ہونے سے پہلے پہلے کچھ کرنا ہوگا۔ مگر پہلے تمہارے انگوٹھے کے لیے میڈیسن لینا ہوگی۔"

"اس کو بھول جاؤ۔ وہ کرو۔ جس کے لیے ہم نے اتنا بڑا رسک لیا ہے۔" زوباریہ پھٹ پڑی تھی۔

"جسٹ ریلیکس۔ آؤ میرے ساتھ۔" صائم نے ضبط سے کام لیا۔ زوباریہ کی حالت بتاتی تھی وہ کسی بھی لمحے ہسٹریک ہو کر چلانے لگے گی۔ پتا نہیں کیوں صائم کو لگتا تھا نکاح کرنا اتنا آسان ہے۔ کوئی بھی مولوی صاحب دو بول پڑھائیں گے۔ تین بار قبول ہے۔ اور وہ آرام سے گھر جا کر ماں کے ہاتھ کی بنی اسپیگھٹی کھا رہا ہوگا۔

مگر اس چھوٹی مسجد کے چھوٹے قد والے مولوی صاحب مدعا سن کر یوں چلائے کہ ان کی سفید لمبی داڑھی کانپ کانپ گئی۔

"تم نے کیا مسجد کو اپنی آوارگیوں کا مرکز سمجھ رکھا ہے۔ یہ مسجد، اللہ کا گھر ہے، گھر سے بھاگنے والوں کی پناہ گاہ نہیں....."

"لیکن شریعت ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہے۔"

"شریعت پڑھی ہوتی تو یوں لڑکی بھگا کر لاتے۔" انہوں نے سیدھا سیدھا اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا---اور ساتھ ساتھ پکارنے لگے۔

"سراج، محمد علی، انہیں اٹھا کر اندر بند کرو۔ میں انہیں شریعت کا سبق پڑھاؤں۔"

صائم نے زوباریہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

"تم یہیں سائیڈ پر کھڑی ہو جاؤ۔ میں میڈیسن لے کر آتا ہوں۔"

صائم نے نسبتاً کم رش والے میڈیکل اسٹور کا انتخاب کیا۔ وہ دونوں اپنے علاقے سے بہت دور خود کو قدرے محفوظ سمجھ رہے تھے۔ صائم اسٹور کے اندر چلا گیا تھا۔

زوباریہ نے اپنا دکھتا ہوا پاؤں جوتے سے نکال کر جوتے کے اوپر رکھا۔ اس کے انگوٹھے سے خون بہنے لگا تھا۔

"امی....." تکلیف کے احساس کے ساتھ اسے ماں یاد آئی۔ اب تک تو اس نے گھر سر پر اٹھا لینا تھا اور گھر والوں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لینا تھا۔

"سب کیا کر رہے ہوں گے۔"

ابھی تصور جما بھی نہ تھا کہ نسرین کی آواز نے اسے دہلا دیا۔

"ہائے ہائے۔ زوباریہ بی بی۔"

یہ نسرین تھی۔ ان کی کالونی میں گھر گھر کام کرنے والی نسرین۔

یہ بھی قسمت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ زوباریہ کو اسی وقت یہاں کھڑے ہونا تھا۔ جب نسرین اپنی بہن کے گھر

سے واپس اپنے گھر جانے کے لیے نکلی تھی اور شامت اعمال بہن کا گھر یہیں پچھلی گلی میں تھا۔

''ہیں..... زیبی بی بی! تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو..... میں نے تو سنا اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھیں وہ کہاں ہے؟'' نسرین نے ادھر ادھر گردن گھمائی..... زوباریہ اسکارف کھینچتی آدھا منہ چھپاتی پیچھے کو کھسکی۔

''نکاح کیا یا ویسے ہی ساتھ رکھا ہوا ہے..... توبہ توبہ..... میرے منہ میں خاک مگر تم جیسی لڑکیوں کا انجام تو یہی ہوتا ہے۔''

اس سانولی رنگت، ٹھگنے قد والی میلی عورت کو اس نے کبھی سلام کرنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا، آج وہ سڑک کے کنارے کھڑی زوباریہ سرمد کو دو کوڑی کا کر رہی تھی۔ اس سردی میں زوباریہ کے پسینے چھوٹنے لگے۔

حلق میں کانٹے اگ رہے تھے۔

''ایسی باتیں مت کریں.....''

''سارا زمانہ تھوتھو کر رہا ہے۔ ایسی بدنامی..... باپ بے چارا ہسپتال پہنچ گیا۔ گھر والے منہ چھپا کر بیٹھے ہیں۔''

''ا..... ابو کو کیا ہوا؟'' زوباریہ نے تڑپ کر پوچھا۔

''تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہسپتال پہنچے یا قبر میں۔ تم جیسی اولاد کے پیدا ہونے سے تو بہتر ہے بندہ بے اولاد ہی رہے۔''

صائم نے باہر آ کر گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔

ٹیکسی رک گئی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ زیبی کے پاس کسی عورت کو بات کرتا دیکھ کر وہ تیزی سے پاس آیا۔ زیبی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ نسرین کانوں کو ہاتھ لگاتی رہی۔

''آئے ہائے..... تو یہ اس لڑکے کے ساتھ بھاگی ہے۔''

☆☆☆

اور پھر جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیلی۔

زوباریہ اور صائم کا قصہ۔

ہسپتال میں پڑا باپ، بہانے بنا بنا کر خود ہی رونے والی ماں۔

لوگوں کی زبانیں نہیں، پھن پھیلائے سانپ تھے۔ اس گھر کا کوئی بھی فرد نظر آتا اسے ڈس لیتیں۔ ایک بار زوباریہ اس منظر کو اپنے سامنے دیکھ لیتی۔ کہ اس کے گھر والے کس اذیت میں ہیں۔ تو شاید خود اذیت سہہ لیتی، محبت سے جدائی کی اذیت اس سے کہیں کم ہوتی ہوگی۔

ثمینہ نے دانیال کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''اب اسے دفع کرو دانیال۔ وہ اب اس قابل کہاں رہی ہوگی۔''

''ایک بار تو لاؤں گا۔ ایک بار تو حساب بے باق کروں گا۔''

اس کا ایک ہی جواب تھا۔ اور جن سے حساب بے باق کرنا تھا..... وہ ایک پسماندہ علاقے کے گندے ٹوٹے پھوٹے گھر میں کھڑے بے وقوفوں کی طرح در و دیوار کو دیکھ رہے تھے..... یہ بھی ان ہی کی دنیا کا حصہ ہے؟

..... جس ٹیکسی میں بیٹھ کر زیبی دھواں دھار روتی رہی تھی۔ اس نے انہیں ایک رات کے لیے ٹھکانہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور کریم کی معیت میں اس نیچی چھت والے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک طرف دو جستی ٹرنک اوپر نیچے رکھے تھے۔ جن پر بستروں کا ڈھیر تھا۔ کمرے میں بندھی رسی پر زنانہ کپڑے دھلے گندے اکٹھے لٹک رہے تھے۔ کمرے میں عجیب سیکن زدہ بو تھی۔ ایک لمحے کو لگا ان کا دل الٹ جائے گا۔

''یہ..... یہ کمرہ ہے۔''

''ہاں جی یہی کمرہ ہے۔'' کریم نے باچھیں پھیلائیں کہ وہ انہیں یہاں لانے سے قبل ہی کرایہ وصول کر چکا تھا۔

''بس بابو! عیش کرو۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔'' وہ بار بار زوباریہ کو دیکھ کر بلاوجہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''الو کا پٹھا..... باسٹرڈ۔'' صائم نے دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں دیں۔

''صائم میں یہاں نہیں رک سکتی۔''

یہاں رات گزارنے کا تصور ہی وحشت انگیز تھا۔

''مجبوری ہے رات سڑک پر تو نہیں گزار سکتے۔'' صائم دبی زبان میں بولا۔

''ہم کسی اچھی جگہ بھی جا سکتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں؟'' صائم کریم کی طرف مڑا۔

''ٹھیک ہے کریم بھائی! آپ جائیں۔''

کریم مسکراتا باہر نکل گیا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' زوباریہ چارپائی پر بیٹھ کر رونے لگی۔ ''جب سے گھر سے نکلے ہیں، مصیبتیں ہی گلے پڑ گئی ہیں۔ کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہو رہا۔

''زیبی یار! میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں نا.....''

''میں نے زندگی میں کبھی اتنی گھٹیا جگہ نہیں دیکھی۔''

صائم خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''اپنا سیل دو۔''

''کیا ہوا؟''

''نسرین نے بتایا نہیں۔ ابو ہاسپٹلائز ہیں۔ مجھے روشانے سے بات کرنی ہے۔'' لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

صائم نے خاموشی سے سیل اس کے حوالے کر دیا۔ زیبی نے بے تابی سے آن کیا۔

روشانے کی آواز سن کر اس کا دل چاہا وہ اڑ کر گھر واپس چلی جائے۔

''روشانے ابو کیسے ہیں؟''

روشانے نے بہت بے دھیانی میں کال لی تھی۔ زوباریہ کی آواز پر اسے کرنٹ سا لگا۔ اس نے ایک نظر باپ پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت روشانے کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔

''روشانے پلیز مجھے بتاؤ۔''

''کون بات کر رہا ہے!'' دوسری طرف روشانے نہیں کوئی اجنبی تھا۔ جو زوباریہ کو جانتا تک نہیں تھا۔

''روشانے پلیز مجھے ابو۔''

صائم اٹھ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ باہر کچے پکے صحن میں زرد سا بلب روشن تھا۔

''کیا ہم سے غلطی ہو گئی؟''

ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پچھتاوے کا احساس جاگنے لگا تھا۔
زندگی تین گھنٹے کی مووی نہیں۔ ایک ہیمپرڈ لائف گزارنے والے کو احساس ہوا تھا۔
''تمہیں اس سے کیا؟ تم تو سارے گھر کو مار کر نکلی ہو۔ اب پیچھے مڑ کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ اب جاؤ اپنی مرضی کی زندگی گزارو خوش رہو نہ رہو مگر ہم سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں، تمہاری خود غرضی کا زہر ہم نے چکھ لیا ہے۔ اب جیئیں یا مریں۔ تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔''
''روشانے روشانے، میری بات تو سنو۔''
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صائم نے پاس آکر موبائل ہاتھ سے لیا۔ کال کٹ چکی تھی۔ اس نے یونہی کھڑے کھڑے زیبی کو اپنے ساتھ لگانا چاہا۔ زیبی نے غصے سے اسے خود سے دور کر دیا تھا۔
''میں بہت بری ہوں...... میری وجہ سے میرے ابو ہاسپٹل پہنچ گئے گھر والے میرا نام سننا نہیں چاہتے۔ اگر میرے ابو کو کچھ ہو گیا تو میں خود کو کیسے معاف کروں گی۔''
''نہیں کچھ نہیں ہوگا زیبی! تم رونا تو بند کرو۔'' صائم کو اس کا رونا تکلیف دے رہا تھا۔
''صائم!'' زیبی نے بے قراری سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ہم نے غلط کیا ہے۔''
''ایسا نہیں ہے۔'' اس نے زیبی سے زیادہ خود کو جھٹلایا تھا۔
''ایسا ہی ہے۔ تبھی تو ہمارے ساتھ بھی غلط ہو رہا ہے۔ صائم! چلو گھر چلتے ہیں۔''
''اس طرح کیسے جائیں گے۔ نکاح بھی تو نہیں ہوا۔''
''نکاح نہیں ہوگا اور ہم اسی طرح یہاں وہاں رلتے رہیں گے۔ پیسے ختم ہو جائیں گے۔ پھر کیا کریں گے؟'' وہ غصے میں آ گئی۔
''ہم کورٹ میرج کریں گے۔ ہم صبح ہوتے ہی ساری انفارمیشن۔''
''کوئی انفارمیشن نہیں ہے...... تمہارے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔ نانا کے گھر جائیں گے۔ وہ ہنستے ہنستے ہمارا نکاح پڑھوائیں گے اور ہم واپس آ جائیں۔ واہ کیا پلان تھا تمہارا بنا سوچے سمجھے مجھے ساتھ لے کر گھر سے نکل گئے۔ یہ بھی نہیں سوچا، تم تو لڑکے ہو فٹ پاتھ پر رہ لو گے۔ کسی پارک میں سو جاؤ گے میں کیا کروں گی؟'' وہ پھر کر لڑنے لگی۔
''ہاں تو تم نے سوچا تھا یہ سب......''
''میں نے تو تم پر اعتبار کیا تھا۔'' زیبی نے لڑنا چھوڑ کر پھر سے رونا شروع کر دیا۔
''اچھا بس کرو۔ خوامخواہ لڑے جا رہی ہوں۔ آئی پرامس صبح ہوتے ہی کچھ نہ کچھ کرلوں گا نہیں تو۔''
''نہیں تو۔'' زیبی نے اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔
''گھر جا کر سب کے پیروں میں گر جائیں گے۔ تم بس مجھے اپنا آئی ڈی کارڈ دو۔''
''آئی ڈی کارڈ......''
''ہاں اس کے بغیر کورٹ میرج کیسے ہوگی۔'' زیبی ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھے گئی۔
''اب کیا ہے؟''
''وہ تو...... وہ تو ابھی بنا ہی نہیں۔''
''کیا مطلب؟'' صائم شاکڈ تھا۔ ''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔''
''تم نے کون سا پوچھا تھا اور مجھے کیا پتا تھا نکاح کے لیے آئی کارڈ اتنا ضروری ہوتا ہے۔''
''تم کیا ان پڑھ ہو۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیے۔'' اس نئی سچوئشن نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

''اچھا ہم انہیں کہہ دیں گے آئی ڈی کارڈ بعد میں لے لیں۔''
''کیوں اسٹوپڈ باتیں کرتی ہو۔'' وہ چڑ گیا۔
''اب کیا کریں گے؟''
''مجھے نہیں پتا۔'' وہ جا کر دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایک اضطراب بھری خاموشی کمرے میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ دماغ کے گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے اسے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے زیبی کو دیکھا۔ وہ یونہی بیٹھی ہاتھوں کی انگلیاں مروڑے جا رہی تھی جیسے موم کی بنی ہو۔
''بس کرو ٹوٹ جائیں گی۔''
زیبی نے ناراضی سے اسے دیکھا اور مشغل جاری رکھا۔
''میں کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہوا..... زیبی اس سے زیادہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔
''میں یہاں اکیلی نہیں بیٹھوں گی۔''
''یار! سمجھا کرو۔ میں ہر جگہ تمہیں ساتھ لے کر نہیں جا سکتا۔ یہ علاقہ بھی ایسا نہیں ہے۔'' صائم نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔
''نہیں میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ورنہ تم بھی مت جاؤ۔'' زیبی ہٹ دھرمی سے بولی تو صائم کو ماننا پڑی۔
''اچھا ٹھیک ہے ریڈی ہو جاؤ۔''
''ہاں، ابھی شاور لے کر چینج کرتی ہوں۔'' وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔ صائم کھسیانا سا ہو گیا۔
''یار! روانی میں بول گیا۔ تم تو ہر بات دل پر ہی لے لیتی ہو۔''

☆☆☆

''دونوں گھر سے بھاگے ہیں۔'' دبلی پتلی سکینہ نے پلنگ کے کنارے ٹکتے گویا انکشاف کیا۔ تکیے کے سہارے نیم دراز کریم اپنی جیب پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ لاپروائی سے جواب دیا۔
''وہ تو نظر ہی آ رہا ہے۔''
''ابھی نکاح نہیں ہوا۔''
''تو کر لیں کورٹ میرج۔''
''کھے تے سوا.....'' سکینہ نے نخوت سے ہاتھ جھٹکا۔ ''لڑکی ابھی اٹھارہ کی نہیں ہوئی۔''
''تم سے کس نے کہا۔'' کریم چونکا۔
''سکینہ کو سب پتا ہے۔'' سکینہ نے فخر سے کہا۔
''چل رین دے آئی بڑی اللہ والی۔ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گی۔''
''میں کہہ رہی ہوں۔ پولیس کیس بن جائے گا۔''
کریم ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، جیب میں انگلیاں ڈال کر پانچ ہزار کا نوٹ سکینہ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔
''ایک رات کا پانچ ہزار..... دیتا ہے کوئی ایک رات کے لیے۔''
نوٹ دیکھ کر ایک لمحے کو سکینہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کئی ناآسودہ خواہشیں انگڑائی لے کر جاگیں۔ مگر دوسرے لمحے وہ تڑخ کر بولی۔
''یہ میرا گھر ہے کریمے، کوئی عیاشی کا اڈا نہیں۔ جو اسے رات کے حساب سے کرائے پر چڑھا رہا ہے۔''
سکینہ کا جملہ ادھورا تھا کہ کریمے کی ٹانگ کمر پر پڑی۔ وہ گرتے گرتے بچی۔

''اللہ کرے، تیری ٹانگ ٹوٹ جائے، کوڑی ہو کر بستر پر پڑے۔'' وہ چلانے لگی۔ ''جب پولیس آ کر دروازہ توڑے گی۔ تیری بیٹیوں کو کھینچ کر سڑک پر کھڑا کرے گی تو پتا چلے گا۔''

''تیری زبان پر فالج گرے۔ جو مرضی کہتی رہ۔ یہ پیسے تو میں واپس کرنے والا نہیں۔''

''کریے، عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ بغیر نکاح کے پکڑے گئے تو اور بھی برا ہوگا۔'' سکینہ نے ذرا نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اچھا.....'' کریم نے ذرا دیر کو غور کیا۔

''تو پھر ایک کام کرتے ہیں۔ دونوں کا نکاح کروا دیتے ہیں۔''

''کیا بات کرتے ہو؟'' سکینہ ہکا بکا رہ گئی۔

''اور لگے ہاتھوں ہم بھی دوبارہ سے قبول ہے، قبول ہے پڑھ لیں گے۔ پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ کیسا؟'' کریے کا غصے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تھوڑے پیسے مزید ملنے کی آس نے طبیعت بحال کر دی تھی۔

''پراں مر۔'' سکینہ نے اسے پیچھے دھکیلا۔ ''ہندوؤں والی باتیں انہیں کے ڈراموں میں دیکھی ہیں۔ یہ بار بار ہوتی شادیاں۔''

کریے ہنستے ہنستے باہر نکل گیا۔

صائم اور زوباریہ صحن میں تھے۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' (کہیں پرندے اڑنے تو نہیں لگے)

''بھوک لگی تھی تو کھانا کھانے جا رہے ہیں۔'' صائم نے جواب دیا۔

''اس طرح باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ محلے والے سوال جواب کریں گے اور کسی نے تمہارے والی وارثوں کو اطلاع دے دی تو میں بھی پھنسوں گا..... آپ اندر جاؤ۔'' اس نے زیبی کو اشارہ کیا۔ ''مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ سکینہ کھانا دے دے گی۔''

''کچھ نہیں ہے، سب بچوں نے کھا پی لیا۔'' سکینہ نے اندر سے چٹا جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہم لے آتے ہیں۔'' کریم کے کہنے پر صائم نے زوباریہ کو دیکھا۔

''تم تسلی سے اندر بیٹھو۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔'' زوباریہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اسے کریم سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑی دونوں کو باہر جاتا دیکھتی رہی۔ پھر خاموشی سے اندر آ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

برگر والا برق رفتاری سے برگر بنا رہا تھا..... فضا میں انڈے، ٹکی اور ڈبل روٹی کی مہک پھیلی تھی۔

کریم کی بات سن کر صائم گڑبڑا سا گیا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں کریم بھائی۔''

''بھائی بھی کہتے ہو اور باتیں بھی چھپاتے ہو۔ جانتے ہو لڑکی بھگانا کتنا بڑا جرم ہے۔'' کریم نے صائم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں جھانکا۔

''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

''چار دن عیش والی محبت یا.....''

صائم نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''غصہ کرنے کی ضرورت نہیں، پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت برے پھنسو گے۔ آخر اس کے گھر والے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھے۔''

''ہم نکاح کرنا چاہتے تھے مگر.....''
''میں مدد کر سکتا ہوں مگر کچھ پیسے لگیں گے۔''
''کریم بھائی! اگر یہ ہو جائے تو میں گھر پہنچ کر آپ کو مزید پیسے بھجوا دوں گا۔ ابھی تو میرے پاس۔'' صائم نے جوش میں والٹ کھولا۔ ''یہی ہیں۔''
اور نوٹ دیکھ کر کریم کھڑے کھڑے اڑنے لگا۔ اس نے بے تکلفی سے والٹ ہاتھ میں لے کر سارے نوٹ نکال لیے اور خالی والٹ صائم کو تھما دیا۔ وہ کچھ حیران پریشان خالی والٹ کو دیکھ رہا تھا۔
''کیا ہو گیا۔ مولوی صاحب اور گواہوں کو دینے کے بعد جو بچ گئے واپس کر دوں گا۔''
''وہ زوباریہ کے پاس آئی ڈی کارڈ نہیں ہے۔''
''فکر نہ کرو۔ وہ خانہ خالی چھوڑ دیں گے۔ اصل چیز تو قبول ہے ہوتی اور تم دونوں کے دستخط..... فکر نہ کرو۔ سب کر لوں گا۔''
''اور چھوٹے دس بر گر لگا دے۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ہانک لگائی بلکہ ایسا کرنا یہ پیسے پکڑ اور گھر بھجوا دینا۔ اس نے ہزار کا نوٹ دکاندار کو دیا۔ پھر باقی اپنی جیب میں ڈال کر صائم سے بولا۔
''چل شہزادے، تیری شادی کی تیاریاں کرتے ہیں۔''

☆☆☆

باتھ روم اتنا گندہ تھا کہ زوباریہ کا اندر جاتے ہی دل متلا گیا۔ کسی بچے کے گندے کپڑے بھی وہیں گول مول کر کے رکھے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھتی باہر بھاگی۔ سکینہ نے اسے دیکھ کر چھاتی پیٹ لی۔
''ہائے میں مر گئی۔ کمبخت کب سے اس کے ساتھ دکھے کھا رہی ہے۔'' واش بیسن پر پانی کے چھینٹے منہ پر مارتی زوباریہ خود کو سنبھال کر مڑی۔
''یہ کام تو نکاح کے بعد کے ہوتے ہیں۔ تم لوگوں نے تو ہر حد ہی توڑ دی۔''
''کیا بولے جا رہی ہیں۔ اتنا گندہ واش روم ہے۔ آپ صفائی نہیں کرتیں۔''
زوباریہ جھنجھلائی تو سکینہ نے جھانک کر واش روم کو دیکھا۔ سمجھ تو گئی پھر بھی بگڑ کر بولی۔
''اپنی عیاشیوں کے لیے کوئی محل ڈھونڈ لیتی..... ہماری کٹیا تو ایسی ہی ہے۔''
''آپ مجھ سے کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' زوباریہ کترا کر اندر جانے لگی۔ سکینہ سامنے آ گئی۔
''تو کیسی باتیں کروں؟ ایک بار اپنے ماں باپ کے بارے میں نہیں سوچا۔ توبہ توبہ ایسی بدکردار اور بدچلن بیٹی کو تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔''
''آپ میرے لیے اتنے برے الفاظ استعمال مت کریں۔'' غصے اور بے بسی کے احساس نے اسے ادھ موا کر دیا۔
''مجھے تو وہ لفظ نہیں مل رہے جو تیرے لیے استعمال کروں..... جوانی سنبھالی نہیں جاتی تھی تو ماں باپ سے کہتی دو بول کسی کے ساتھ پڑھوا کر رخصت کرتے۔''
''آپ نجانے کیا سمجھ رہی ہیں۔ ہم نے بہت مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے۔''
زوباریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیسے اس عورت سے جان چھڑائے۔ وہ اندر جانا چاہتی تھی۔ سکینہ راستہ روکے کھڑی تھی۔
''ہونہہ مجبوری، یہ آج کل کے لڑکے، جب محبت کرتے ہیں تو لگتا ہے۔ جان دینے لگے ہیں اور جب جان دینے کی باری آئے تو سب سے پہلے چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ بس دو چار دن دل بہلائے گا اور۔''

''وہ ایسا نہیں ہے۔'' زوباریہ کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔
''کہا تو تیرے ماں باپ نے بھی یہی ہوگا کہ ہماری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ ان کے منہ پر کالک مل آئی نا۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل کہاں رہے ہوں گے۔ یہ تو کریم ہے جو پیسوں کے لالچ میں پڑ گیا۔ میں ہوتی تو منہ کالا کر کے گھر سے نکالتی۔''
وہ زمین پر تھوکتی اندر کمرے میں چلی گئی۔
سرد آسمان تلے کھڑی زوباریہ کو لگا وہ زمین پر نہیں۔ اس کے منہ پر تھوک کر گئی ہے۔

☆☆☆

روشانے گھر کھانا لینے آئی تھی۔ ساجدہ کے پاس کالونی کی کچھ خواتین بیٹھی دیکھ کر سیدھا کچن میں گھس گئی۔ وہ کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لوگ بیمار باپ سے زیادہ زوباریہ کے قصے میں دلچسپی رکھتے تھے۔
کچھ دیر میں ساجدہ انہیں فارغ کر کے کچن میں آ گئیں۔
''سالن تو میں نے بنا دیا تھا۔''
''جی، ابو کے لیے سوپ اور دلیہ بنانا ہے۔''
''دانیال کی کوئی کال آئی؟''
''نہیں، ہسپتال بھی نہیں آئے.....'' آہستگی سے کہہ کر وہ دلیے کا ڈبہ کھولنے لگی۔
''اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ پتا نہیں کہاں کہاں دھکے کھا رہا ہے۔'' وہ آہ بھر کے بیٹھ گئیں۔ روشانے شرمندہ سی ہو گئی۔
''تم خود فون کر کے پوچھ لیتیں۔''
''کیا تھا۔ وہ ڈانٹنے لگ گئے کہ دوبارہ کال مت کرنا۔''
''اب واپس لا کر کیا کرے گا۔ ساری دنیا میں اشتہار تو لگ ہی گیا ہے۔ اب تو ایک ہی دعا ہے اللہ کرے نکاح کر لیا ہو۔ اور فائقہ اسے اپنے گھر رکھ لے۔'' روشانے کے اندر کئی سوال کلبلانے لگے۔
''تو کیا لڑکی صرف اپنی حیا۔ وقار اور کردار کی وجہ سے بھاری ہوتی ہے۔ ورنہ تنکے سے بھی زیادہ ہلکی..... اور لڑکا تائی امی وہ جو اس سارے عمل میں برابر کا شریک ہے وہ واپس آ کر پھر سے زندگی شروع کر سکتا ہے اور لڑکی، تائی امی الزام صرف لڑکی پر کیوں؟''
''جو جتنا قیمتی ہو۔ نقصان اسی کا زیادہ ہوتا ہے اور جس کا نقصان زیادہ ہو۔ محتاط بھی تو اسی کو ہونا پڑتا ہے۔ اللہ بخشے ابا مرحوم کہا کرتے تھے۔ مرد تو مٹی کا برتن ہے۔ گر کر ٹوٹ جائے تو پھر سے تعمیر ہو جائے گا۔ مگر عورت..... عورت تو بیش قیمت ہیرا ہے۔ اس میں ذرا سی لکیر بھی آ جائے تو قیمت کھو دے گا..... اور ٹوٹ کر بکھر جائے تو کبھی جڑے گا؟ ہرگز نہیں۔''
''چھوڑیں تائی امی، یہ انصاف تو نہ ہوا۔'' نجانے کیوں وہ بحث پر بحث کیے جا رہی تھی۔
''تو جا کر اللہ سے لڑو..... جس نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دے دی۔ عورت کو نہیں دی حد ہو گئی۔ آج کی عورت کہتی ہے کہ مرد کو بے وفائی کی اجازت ہے تو اسے بھی ہونی چاہیے۔ بے وفائی کی اجازت نہ مرد کو ہے نہ عورت کو..... ناجائز تعلقات اللہ کی نظر میں مرد کے لیے جائز ہیں نہ عورت کے لیے..... مگر بے وفائی کی مہر کس پر لگتی ہے؟ عورت پر کیونکہ بچہ عورت پیدا کرتی ہے۔ مرد نہیں۔''
روشانے ڈر گئی۔ اس نے پہلی بار ساجدہ کو اتنے غصے میں دیکھا تھا۔
''تم لوگوں کا بس چلے تو اس بات پر بھی اللہ سے..... استغفر اللہ بحث شروع کر دو۔ جب کائنات بنی تھی تو

پہلے مرد کو کیوں بنایا۔"
وہ بولتے بولتے باہر نکل گئیں۔
روشانے نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔
بات کہاں سے نکل کر کہاں جا کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"میری بات لکھ لے۔ یہ تجھے خراب کر کے چھوڑ دے گا۔ پھر کرے گا کسی شریف زادی سے شادی اس کی تو ہو جائے گی۔ تو کیا کرے گی ساری عمر گھر سے بھاگی ہوئی کہلائے گی۔"
جاتے جاتے سکینہ جوزہرا اس کے کانوں میں گھول گئی تھی۔ وہ زوباریہ کو نیلو نیل کر گیا تھا۔ روتے روتے وہ بے حال ہونے لگی اور اس کے آنسو سمیٹنے والا نجانے کہاں تھا۔ پھر وہ خود ہی تھک کر چپ ہو گئی۔
نجانے کتنا وقت گزرا۔
پھر صائم تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرخ دوپٹا تھا اور چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔
"صائم....." وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔
"زہی! روتی رہی ہو....."
"میں ڈر گئی تھی..... مجھے لگا تم واپس نہیں آؤ گے۔"
"پاگل ہو..... اتنی بے اعتباری۔"
"صائم....." اس کے لہجے میں کچھ تھا جس نے صائم کو چونکا دیا۔
"کیا بات ہے زہی؟ دل میں کوئی بات، کوئی خدشہ ہے تو کہہ دو....."
"مجھے واپس جانا ہے....." اس نے تو فیصلہ ہی سنا دیا۔ صائم ششدر سا رہ گیا۔
صائم ہنوز چپ تھا۔
زوباریہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا تو نظر سرخ دوپٹے پر رک گئی۔ اس نے سوالیہ انداز میں صائم کو دیکھا۔
"باہر کریم بھائی، مولوی صاحب اور گواہوں کے ساتھ آئے ہیں۔ ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر فیصلہ کر لو نکاح کر کے جانا ہے یا نکاح کے بغیر۔" صائم نے دوپٹہ اس کے قریب رکھا اور باہر نکل گیا۔
زوباریہ تذبذب کے ساتھ دوپٹے کو دیکھے گئی۔

☆☆☆

"ہاں! مجھے لگتا ہے میں نے انہیں دیکھا ہے۔"
ٹوٹی پھوٹی سڑک کے کنارے کھڑے اس شخص نے موبائل میں صائم کی تصویر دیکھ کر کہا تو دانیال کو لگا وہ منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے دوست کے بہنوئی اے ایس آئی فیروز شاہ نے بہت رازداری سے وعدے کے ساتھ اپنے بندے دوڑا دیے تھے..... نسرین نے جہاں انہیں دیکھا تھا وہ اور آس پاس کے علاقے انہوں نے چند گھنٹوں میں چھان مارے تھے۔
"کہاں کہاں دیکھا تھا۔" دانیال بے تاب ہوا۔
"میں کیوں بتاؤں۔ تم پولیس والے ہو۔" وہ شخص مشکوک ہوا۔
"یہی سمجھ لو۔" دانیال نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس شخص کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ اور آسمان پر بجلی بھی۔

☆☆☆

زوباریہ نے قلم ہاتھ میں لیتے ہوئے بے حد بے یقینی اور حیرت سے سامنے پھیلے نکاح نامے کو دیکھا۔ پاس

کھڑے صائم نے جوش سے مٹھی بھینچی۔ بس چند لمحوں کا فاصلہ تھا اور زوباریہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہونے جا رہی تھی۔
سنا ہے اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ نکاح کیا ہے یا ویسے ہی ساتھ رکھا ہوا ہے۔
زوباریہ نے کلبلاتے خیال سے نظریں چرا کر پہلا سائن کیا۔
''ایسی بدکردار اور بدچلن بیٹی کو تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔''
اس نے دوسرا پتھر کھا کر سائن کر دیے۔
''تمہیں اس سے کیا؟ تم تو سارے گھر کو مار کر نکلی ہو۔ اب پیچھے مڑ کر کیوں دیکھ رہی ہو۔ اب جاؤ اپنی مرضی کی زندگی گزارو۔ خوش رہو نہ رہو مگر ہم سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں۔''
زوباریہ نے گھٹی ہوئی سانس نکالی اور آخری سائن کر دیا۔ باہر آسمان برسنے لگا تھا۔
کریم اپنے دوستوں کی دعوت برگر، چائے اور مٹھائی سے کرنے لگا۔
''فائنلی ..... فائنلی ہمارا نکاح ہو گیا میری چھوٹی سی دلہن مائی پرنسس ہم ایک ہو گئے ہیں۔ اب کوئی ہمیں الگ نہیں کر سکتا۔'' مارے خوشی کے صائم پاگل ہونے لگا تھا۔
زوباریہ خاموشی سے سرخ دوپٹے کی کناری ادھیڑتی رہی۔
صائم اس کے پاس بیٹھا۔
''یہ تمہیں خراب کر کے چھوڑ دے گا۔ پھر کرے گا کسی شریف زادی سے شادی۔'' زوباریہ خود میں سمٹ گئی۔
''کیا ہوا؟ تم مجھے خوش نہیں لگ رہیں اور میرا دل چاہ رہا ہے۔ تمہارے ساتھ بارش میں ایک رومینٹک سا ڈویٹ ہو جائے۔''
''صائم! تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے۔''
صائم نے تعجب سے زیبی کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھیں۔
کیا یہ میری قربت سے خائف ہے۔
وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔
''ہاں .....'' زیبی کا دل دھک سے رہ گیا۔
''یہ سارے پاپڑ تمہیں چھوڑنے کے لیے ہی تو بیلے ہیں۔ اتنی اسٹوپڈ باتیں کیوں کرتی ہو یار..... خوش کیوں نہیں ہو..... اور مجھے دیکھو میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔ یہ سرد رات برستی بارش، میں اور تم کیا ہمیں اس کے علاوہ بھی کچھ چاہیے۔''
زوباریہ نے صحن میں کھیلتی بارش کو دیکھا۔
نم مٹی کی خوشبو کو محسوس کرنا چاہا۔
مگر اس کی ساری حسیات برف ہو گئی تھیں۔
''پتا نہیں عجیب بے یقینی سی ہے۔''
''یقین کر لو مائی لو..... اب تم زوباریہ صائم ہو۔''
صائم نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ زوباریہ کے گالوں پر رکھے۔
زوباریہ نے جھرجھری سی لی۔
''سردی ہو رہی ہے..... میں دروازہ بند کر دوں۔'' صائم کھڑا ہوا۔
''نہیں۔'' زوباریہ بے اختیار بولی۔
''زیبی! تم مجھ سے گھبرا رہی ہو؟''

زیبی ہونٹ کاٹنے لگی۔ صائم کو ہنسی آ گئی۔
''صائم نکاح ہو گیا ہے۔ چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ صائم کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ وہ پاس آیا۔ زیبی پیچھے کھسکی۔ مگر صائم نے اسے زیادہ دور جانے نہیں دیا تھا۔
''تمہیں نکاح سے پہلے ڈرنا چاہیے تھا مسز۔''
زوباریہ نے اسے زور سے دھکا دیا۔
''میں نے کہا..... تمہارے گھر چلتے ہیں۔''
''تو یہ ہے تم نے نکاح ہوتے ہی پینترا بدل لیا۔'' وہ ناراض ہو کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ پانی کی پھوار اسے بھگونے لگی تھی۔
''اے ابر کرم آج اتنا برس
''اتنا برس کہ ہم جا نہ سکیں''
وہ شرارت سے گنگنانے لگا۔
زیبی جھنجھلا گئی۔
''اب بارش میں کیوں بھیگ رہے ہو۔''
''تو کیا کروں؟ تم تو کمرے میں بھی رکنے نہیں دے رہیں۔'' دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اس نے دروازے سے ٹیک لگا لی۔
تب ہی کمرے کا اکلوتا بلب بجھ گیا۔
''یہ..... یہ کیا ہوا۔'' وہ بوکھلائی۔
''لائٹ چلی گئی ہے میری جان۔''

☆☆☆

''ابراہیم، گھر میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔'' فائقہ چڑ گئی۔
''تو کیا کروں؟'' ابراہیم نے غصے سے فائقہ کو دیکھا۔ سارے دن کی خواری کے بعد وہ اب گھر آئے تھے۔
''موسم اتنا خراب ہے پتا نہیں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔''
''اسے بھٹک ہی لینے دو۔''
فائقہ چڑ کر روشانے کا نمبر ملانے لگی۔ مگر دوسری طرف بھی کوئی خبر نہ تھی۔
''پلیز روشانے..... جیسے ہی اطلاع ملے ضرور بتانا، دانیال غصے میں ہے جذباتی ہے۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے۔''
''جی، میں بتا دوں گی۔'' روشانے نے فون بند کیا۔ وہ سرمد کو سوپ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر انہوں نے بمشکل دو ہی چمچ لیے تھے۔
سرمد کی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا۔
روشانے نے نفی میں گردن ہلا دی۔
انہوں نے مایوسی سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

''میں گھر کیسے جاؤں صائم۔ وہ تو مجھ سے ہر رشتہ ختم کر چکے ہیں۔'' کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دونوں چارپائی پر پاس پاس بیٹھے تھے۔
کبھی کبھی بجلی چمکتی تو اندازہ ہوتا کہ بارش کا پانی کمرے کے فرش تک آنے لگا تھا۔

''تب تم گھر نہیں جاؤ گی۔ میرے ساتھ جاؤ گی باقی جو ہوگا مل کر فیس کریں گے۔ تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا زیبی۔''
کریم ایک دم اندر آیا تھا۔
زوباریہ ڈر کے صائم کے ساتھ جا لگی۔
''تم دونوں ابھی کے ابھی یہاں سے نکلو۔''
''کیا ہوا؟'' صائم گھبرا کر کھڑا ہوا۔
''وہ لوگ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے چوک تک پہنچ گئے ہیں..... یہاں تک بھی پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو۔ نکلو سوچ کیا رہے ہو؟''
''کریم! اتنی بارش میں ہم کہاں جائیں گے۔''
''سوچو..... اگر پولیس یہاں آ گئی تو کہاں جائیں گے۔ نکلو ورنہ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پھنساؤ گے۔''
اس نے صائم کو پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلا۔ ''وہ تو شکر ہے۔ مجھے کسی نے کال کر دی۔''
صائم نے مڑ کر زوباریہ کے خوف زدہ چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر اندھیرا تھا۔
''آؤ زیبی۔'' ان کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے زیبی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل گیا۔
سر پر برستا آسمان۔
پانی سے بھری نیم پختہ گلیاں۔
بارش اور وہ بھی سردیوں کی۔
تقدیر نے ثابت کیا تھا۔ وقت ابھی بھی ان کے لیے نامہربان ہے۔
بھاگتے دوڑتے بے ترتیب قدم..... نجانے وہ کہاں سے کہاں نکل گئے۔
سردی سے دونوں کے دانت بجنے لگے تھے۔
''میں اور نہیں بھاگ سکتی.....''
صائم نے ادھر ادھر دیکھا اور اسے لے کر ایک دکان کے شیڈ تلے آ گیا۔
وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور صائم کے پاس اسے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ خود ہی اس کا چھاتہ بن گیا۔
زوباریہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
بارش صائم پر برس رہی تھی۔ شیڈ انہیں ڈھانپنے میں ناکام تھا۔
''ہم کیوں بھاگ رہے ہیں۔''
''تم نے سنا نہیں وہاں پولیس آ گئی تھی۔''
''ہمارے پاس نکاح نامہ ہے۔''
نکاح نامہ جیکٹ کی اندرونی جیب میں تھا۔
''یہ سوال وہ بعد میں کریں گے۔ پہلے مار مار کر میری ہڈیاں توڑیں گے کہ لڑکی کو بھگایا کیوں؟''
''ہم گھر چلتے ہیں۔''
''گھر ہی جائیں گے۔ پہلے کسی سے رابطہ تو کر لیں۔''
''اگر رابطہ نہ ہوا تو یونہی سڑکوں پر خوار ہوں گے.....''
صائم کے جواب دینے سے پہلے ہی گاڑی کی تیز لائٹ ان پر پڑ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہاجرہ ریحان

میرے یرغمال

”وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ میری تو حیرت ہی نہیں ختم ہو رہی...... ایسا لگتا تھا میں کسی انجان بالکل مختلف انسان سے ملا ہوں...... کہاں وہ پہلے بیبا گھمنڈ، خود پر گمان کہاں وہ اپنی بات منوانے کا جنون اور کہاں اب...... یہ...... ہاہا...... اب تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی جلتی آگ پر ڈھیر سارا پانی ڈال دیا ہو...... بس کبھی کبھی دھواں سا تو اٹھتا محسوس ہے، جس سے ہلکی سی آنچ بھی آتی ہے مگر پھر بھی وہ لپکنا، وہ بھڑکنا...... سب ختم......

سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اسے گاڑی سے باہر نکالا تو میں تو اس کی حالت دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ ٹرالر نے ٹکر بھی اسی کی سائیڈ پر ماری تھی اور اتفاق سے وہ پیچھے آنکھ بند کیے سو رہی تھی لہٰذا وہ خود کو سنبھال بھی نہیں سکی۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر اس کے ہاتھوں، گردن اور پتا نہیں کہاں کہاں چبھا تھا، جس سے اس کا چہرہ، ہاتھ، کندھے سب لہولہان ہو گئے تھے مگر وہ...... وہ تو ایسی پرسکون اور خاموش تھی، جیسے اسے کوئی تکلیف ہی نہ ہوئی ہو......

شکر ہے کہ فوراً ہی ایک مہربان انسان نے ہمیں لفٹ دے کر ہسپتال پہنچا دیا، جہاں ایمرجنسی تک پہنچتے پہنچتے وہ اسی خاموشی سے بے ہوش بھی ہو گئی اور میں...... میں تو بہت ڈر گیا تھا...... پہلے جیسے اسے کھویا تھا۔ دوبارہ کھونے کے خیال سے میرا تو سانس ہی بند ہو گیا تھا۔ بس کیا بتاؤں...... میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا اور اس ایک خیال کے بعد ہی مجھے شدت سے خود پر غصہ آیا تھا۔ میں یہ کیا بے وقوفی کرتا رہا ہوں، میں تو شاید واپس ہی اس کے لیے آیا تھا مگر یہاں آ کر مجھے پتا نہیں کیوں اس کو سزا دینے کا شوق ہو گیا اور میں پاگلوں کی طرح پتا نہیں کیا کیا کرتا چلا گیا شاید صرف اسے دکھانے، اسے جلانے کے لیے وہ پہلے والی ہوتی تو کب کا مجھ پر باقاعدہ قاتلانہ حملہ کر چکی ہوتی مگر اب وہ......

وہ اس قدر بدل گئی ہے۔ اس قدر خاموش ہو چکی ہے، جیسے اس نے سب کچھ خاموشی سے سہہ لینے کی قسم کھائی ہوئی ہو۔ جہاں پہلے اس کی پٹاپٹ چلتی زبان مجھے کھینچتی تھی ویسے ہی اس کی خاموشی میں بھی الگ قسم کی کشش محسوس کی میں نے...... جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہو...... مجھے مخاطب کر کے سب ہی کچھ تو بتا رہی ہو، بس میں خود ہی انجان بنا پھرتا رہا یا پھر انجان بننے کی کوشش کرتا رہا...... مگر اب نہیں...... اب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے......“

سعد کب سے بول رہا تھا اور رضوان اسے ہمیشہ کی طرح بولنے دے رہا تھا۔ دوستی کوئی بہت پرانی نہیں، یہی کوئی پانچ چھ سال کا ساتھ ہو گا۔ امریکہ کے مصروف ترین شہر نیویارک میں دونوں ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے اور ہم وطن بھی تھے، جس کی وجہ سے دونوں بہت جلد گھل مل گئے۔

رضوان نیویارک میں اپنی نئی نویلی بیوی کے ہمراہ پندرہ بیس سال پہلے آیا تھا لہٰذا سعد سے کہیں زیادہ وہ نیویارک سے واقف تھا اور سعد کو اسی نے کرایہ کا فلیٹ لینے اور پھر نیویارک میں پاؤں جمانے میں مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ رضوان کی بیوی ایک ملنسار عورت تھی۔ اسے باتیں کرنے کا شوق تھا اور کوئی ہم زبان نہ ملتا تھا۔ سعد کی صورت اسے بھی ایک چھوٹا بھائی مل گیا تھا اور اکثر ویک اینڈ سعد، رضوان کے گھر پر گزارتا تھا۔

پاکستان میں سعد اور رضوان کے گھر والوں میں

بھی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ چند ہفتوں پہلے رضوان اپنی سالی کی شادی میں شرکت کرنے کراچی جانے لگا تو سعد کو اس کے بغیر نیویارک میں اکیلے رہنے کے خیال سے کوفت ہونے لگی۔ ادھر سعد کی والدہ بھی اپنے لاڈلے کو پانچ چھ سالوں سے نہ دیکھنے کے باعث دکھی ہو رہی تھیں لہٰذا دونوں دوستوں نے ایک ساتھ ہی چھٹیاں لے کر کراچی جانے کا پلان بنالیا تھا.....

دسمبر کا مہینہ اور کراچی کی ہلکی پھلکی سردیوں میں ہر طرف شادی بیاہ اور طرح طرح کی محفلوں کا عروج تھا۔ جہاں رضوان اپنی سالی کی شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھا تو سعد بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ مختلف تقریبات میں آ جا رہا تھا۔ مگر دونوں دوست دو

چار دنوں کے وقفے سے ضرور مل رہے تھے۔ سعد ہمیشہ کی طرح رضوان کو اپنی حالیہ مصروفیت کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔

چند سالوں میں رضوان نے سعد کو خود سے اس قدر مانوس کرلیا تھا کہ اب سعد اس کے ساتھ دل کی ہر بات کہہ لیتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ سعد کو سمجھ دار، بردبار اور عمر میں دس سال بڑے رضوان میں وہ تمام خوبیاں دکھائی دے گئی تھیں جو ایک انسان کو بھروسا مند بناتی ہیں۔ رضوان کی خاموش اور سادہ طبیعت نے کبھی بھی سعد کو مایوس نہیں کیا، وہ جب بھی رضوان سے ملتا اسی طرح اپنے دل کی بات کرتا۔ اسی طرح بے تکان بولتا حالانکہ سعد کی کم گوئی کا اس کے گھر والوں کو گلہ ہی رہتا مگر رضوان کے سامنے اس کی زبان کھل جاتی اور ابھی بھی چند ہی منٹوں کی علیک سلیک کے بعد سعد نے اپنی تمام باتیں رضوان کے گوش گزار کردی تھیں۔

''اور ہم اس وقت روبینہ جلال کی بات کررہے ہیں؟ ہے ناں؟''

رضوان نے سعد کو سانس لینے کے لیے رکتے دیکھ کر اپنا حصہ ڈالا۔ سعد نے جیسے چونک کر رضوان کو غور سے دیکھا اور بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''ہاں تو اور کیا؟'' سعد کا سوال پر سوال سن کر رضوان مسکرا گیا۔

''کیونکہ آج کل تم بہت زیادہ سائرہ میں گھلے ملے ہوئے ہو تو میں سمجھا شاید باتیں بھی اسی کی ہی کررہے ہوگے کیونکہ حادثے کے وقت بھی تو وہ ساتھ تھی ناں؟''

سعد کی حیرت ابھی تک برقرار تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ رضوان جان گیا ہے کہ وہ روبینہ عرف روبی کے بارے میں بات کررہا ہے مگر اس نے جان بوجھ کر سعد کی توجہ سائرہ کی طرف کروائی اور ایسا رضوان نے کسی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہی کیا ہے مگر وہ کیا بات ہے جس کا احساس ابھی تک سعد کو بھی نہیں ہوا اور رضوان جو سائرہ سے شاید ایک بار ہی ملا ہوگا، اسے ہوگیا تھا۔

سعد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اس وقت صرف اور صرف روبی کی بات کرنا چاہتا تھا، بس اسے ہی سوچنا چاہتا تھا۔ رضوان کی رائے، روبی کی شخصیت کے کسی پہلو پر ہلکے پھلکے انداز میں توجہ دلانا اور بس۔ وہ چاہتا تھا رضوان سعد کو اطمینان دلائے کہ روبی ہی اس کے لیے مناسب ہے۔ روبی ہی اس کا مستقبل ہے اور سعد کا فیصلہ سو فیصد درست ہے..... ایسے میں سائرہ کی بات بیچ میں آجانے سے سعد کو عجیب بے چینی بلکہ بے قراری محسوس ہوئی تھی مگر وہ رضوان کو سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ رضوان نے اگر یہ بات شروع کی ہے تو وہ خود ہی سعد کو روبی کو پس منظر میں ڈال کر سائرہ کو سامنے لانے کی وجہ بھی بتادے.....

''بات یہ ہے کہ آج کل تم ہر محفل میں سائرہ کے ساتھ نظر آتے ہو۔ اس کے اردگرد اس کا خیال کرتے ہوئے..... ایسے میں اگر تم کسی سے بھی بغیر تمہید باندھے کسی ''لڑکی'' کے بارے میں بات کروگے تو میری جگہ جو بھی ہوگا، وہ یہی سمجھے گا کہ تم سائرہ کے بارے میں بات کررہے ہو، کیا سمجھے؟'' آخرکار رضوان نے زیرلب مسکراتے ہوئے وجہ بتائی۔

''ہمم..... ہمم..... مگر میرا سائرہ کے ساتھ ہونے کا مطلب تو میرے خیال میں سب کی ہی سمجھ میں آرہا ہوگا۔ وہ تو میں سائرہ کا خیال صرف اس لیے کررہا ہوں کہ وہ میری وجہ سے اس حال کو پہنچی تھی۔ اس کو میری وجہ سے آج کل بیساکھی کے ساتھ ہر جگہ جانا پڑتا ہے اور ایسے میں کسی محفل میں اسے اس طرح دیکھ کر مجھے شدید احساس جرم ہوتا ہے اور میں اسی لیے اس کا خیال رکھتا ہوں..... اپنا فرض سمجھ کر۔'' سعد اٹک اٹک کر اپنی صفائی دینے لگا تو رضوان نے بیچ میں ٹوکا۔

''تمہارے دلائل اپنی جگہ، مگر دیکھنے والے تمہارے احساس جرم کو نہیں دیکھ رہے۔ بس یہ دیکھ رہے ہیں کہ تم آج کل سائرہ پر حد درجہ مہربان ہو۔''

رضوان نے اپنے دھیمے انداز میں الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھانا شروع کیا۔

''جب کہ تمہاری ہی زبانی میں نے جانا تھا کہ اس گاڑی میں جس کو تم چلا رہے تھے اور جس — حادثے کے باعث سائرہ کی ٹانگ میں چوٹ آئی، اس گاڑی میں صرف سائرہ نہیں، روبی بھی موجود تھی..... ابھی تم روبی کے بارے میں بے تکان بول رہے ہو مگر حیرت ہے کہ ایک بار بھی تم نے روبی کی طبیعت کے بارے میں اس سے ملاقات نہیں کی۔ تم صرف سنی سنائی پر دھیان دیے بیٹھے ہو، اسی پر اطمینان سے ہو کہ تمہاری والدہ تمہیں اشاروں میں سمجھا دیتی ہیں کہ روبی اب بہتر ہے..... تم نے مجھے بتایا کہ سائرہ اور روبی کی تکالیف میں زمین آسمان کا فرق تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ سائرہ اس حادثے کے دوسرے ہی دن سے ہر جگہ دیکھی جا رہی ہے مگر بیساکھی کے ساتھ جب کہ حادثے کے بعد سے روبی منظر سے مسلسل غائب ہے..... شاید اسے اس طرح محفلوں میں یا پھر شادی بیاہ میں خود کو لاغر، کمزور یا پھر لنگڑاتے دکھانے کا شوق نہیں..... یا یوں کہو کہ وہ تمہیں اس شرمندگی سے بچا رہی ہے جس شرمندگی کو سائرہ پچھلے پندرہ دنوں سے تم پر مسلط کیے ہوئے ہے؟ دوسری اہم بات یہ کہ احساس جرم تمہارا صرف سائرہ کے لیے ہی کیوں امڈ کر سامنے آ رہا ہے۔ کیا ابھی تک تم نے روبی کے گھر جا کر اس کی عیادت کی؟ اسے ایک بار بھی بتایا کہ تم شرمندہ ہو کہ تمہاری گاڑی میں تمہاری ڈرائیونگ کی بدلت روبی کو یہ سب سہنا پڑا؟''

رضوان کی بات پر سعد گڑبڑا کر رہ گیا تھا اور اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''بات یہ ہے کہ روبی ایک بار ہی مجھ سے کہیں ملتی تو میں اس سے معذرت کر لیتا..... پھر گھر..... گھر جانے میں یہ قباحت ہے کہ اس کے گھر والے..... وہ کیا کہیں گے؟''

سعد نے ایک بار پھر وجہ بیان کرنے کی کوشش کی۔

''تو کیا سائرہ ہمیشہ ہر محفل میں اکیلی آتی ہے؟ اس کے گھر والے، رشتہ دار، محلے دار کوئی نہیں ہوتا؟ میرے دوست..... روبی کے گھر جانے پر تو آپ کو صرف اس کے گھر والوں سے ملنے میں قباحت محسوس ہو رہی ہے اور یہاں محفل میں سائرہ کے اردگرد پھرنے سے تو آپ پوری کی پوری سوسائٹی کو سائرہ پر اپنا مہربان ہونا بتا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ سائرہ کو اس طرح کی تکلیف نہیں کہ وہ ابھی تک بیساکھی استعمال کرتی رہے کیونکہ حادثے کا تمام تر زور گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف تھا، جہاں صرف روبی موجود تھی..... آگے بیٹھے ہونے کے باعث جہاں تمہیں معمولی خراشیں آئی ہیں، اسی طرح سائرہ کو بھی معمولی سی چوٹ لگی ہوگی اور اس بات کی تصدیق ہسپتال پہنچ کر بھی ہو گئی تھی..... پھر بھی آپ مہان انسان سائرہ کی اس ڈرامے بازی میں مسلسل اس کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ ڈراما بازی تمام لوگ یہاں تک کہ سائرہ کے گھر والے بھی دیکھ رہے ہیں اور نا صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ ایک طرح سے اپنی رضامندی بھی دے چکے ہیں۔ تب ہی ابھی تک آپ دونوں میں سے کسی کو بھی تنبیہی اشارے نہیں ملے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک تو آپ دونوں ایک ساتھ اس قدر مشہور و معروف ہو چکے ہوں گے کہ کارڈ چھپوانے کی دیر رہ گئی ہے۔''

رضوان کی باتوں نے ایک دم بحث کا رخ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ سعد کو اب جا کر احساس ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر احمق پن دکھا رہا ہے۔ ایک طرف سائرہ اور اس کے گھر والوں کو امید دینا اور دوسری طرف جہاں یہ سب باتیں گھر بیٹھے رضوان تک پہنچ رہی ہیں تو کیا روبی کو پتا نہیں چل رہا ہوگا؟

رضوان تو خیر رشتہ داروں میں سے نہیں مگر روبی کے گھر والے تو ہر اس محفل میں موجود ہوتے ہیں، جہاں سائرہ اور سعد پائے جاتے ہیں۔ آخر کو سائرہ روبی کی پھوپھی زاد بہن ہے۔ دونوں کے خاندان والے آئے دن ملتے ہوں گے، انہوں نے روبی کو سعد اور سائرہ کے متعلق کیا کیا نہیں کہا ہوگا۔

اس نے خیالوں میں ہی روبی کی دونوں شادی

شدہ بہنوں کو روبی پر طنز مارتے دیکھا۔ وہ جانتا تھا اصل میں وہ روبی کے گھر اسی لیے نہیں گیا کیونکہ وہ ان لوگوں سے واقف تھا۔ تنک مزاجی اور بات بے بات طبیعت کی برہمی روبی کے گھر والوں میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

☆☆☆

روبینہ جلال سے اس کی دوستی کالج سے شروع ہوکر یونیورسٹی کے آخری سال تک چلی تھی اور وہ اس دوران کئی بار روبی کے گھر گیا تھا۔ کئی بار وہ لوگ روبی سمیت سعد کے گھر آئے تھے۔ دونوں خاندانوں میں حیثیت، اختیار اور ذہنیت کا فرق بہت واضح تھا۔ سعد کے گھر والے متوسط طبقے کے فراخ دل اور فراخ ذہن لوگ تھے۔ سعد کے والدین نے اپنے تینوں بچوں کی تربیت پڑھے لکھے ماحول میں کی تھی اور کیونکہ روبی کے ہاں پیسے کی ریل پیل اور خاندانی نوابی کا بہت زعم تھا۔

اس کے گھر میں لڑکیوں کی پڑھائی لکھائی پر کوئی روک نہ تھی مگر گھر کا ماحول ایسا تھا کہ روبی کی دونوں بہنوں کی کم عمری میں شادیاں کردی گئی تھیں۔ گھر کا ماحول کچھ اس وجہ سے بھی ڈسٹرب تھا کہ روبی کے بچپن میں ہی اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا جبکہ والد بھی زیادہ تر بیٹھک میں رہتے اور کم ہی بچیوں سے بات چیت کرتے، جس کے باعث روبی کو دہری تنہائی کا احساس رہتا۔ بھائی کوئی تھا نہیں، گھر پر اس کی چھوٹی پھوپھی کی اجارہ داری تھی..... روبینہ دونوں بہنوں کی طرح اپنے گھر کی ہونے کے بجائے آگے پڑھ کر ڈگری لینا چاہتی تھی..... شاید اسی تنہائی، اکیلے پن اور نواب زادی ہونے کے باعث روبی کے مزاج میں گھمنڈ، ضد اور بلا کی خودسری تھی مگر اسے سعد اور اس کے گھر جانا اچھا لگتا تھا۔ اسے سعد کے والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ ماحول بہت بھاتا اور وہ اکثر جذباتی ہوکر سعد کو بتاتی کہ وہ بھی اپنے بچوں کو ایسا ہی رکھے گی اور ایسے ہی ان کے ساتھ دوستی کرے گی کہ پھر باہر ان کو کسی بھی ایرے غیرے سے دوستی نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ اپنے بچوں کی ہم راز بن کر رہے گی۔

اکثر اوقات سعد دیکھتا کہ روبینہ کلاس میں کتاب یا لیکچر نوٹ کرنے کے لیے اپنا رجسٹر کھول رہی ہے اور اس میں اس کی مرحومہ والدہ کی تصویر موجود ہے۔ وہ جب بھی روبی کو اپنے دیے ہوئے نوٹس واپس لیتا یا پھر اس سے کوئی کتاب چند دنوں کے لیے لیتا تو احتیاطاً ایک بار صفحے الٹ پلٹ کر تصویر ڈھونڈ لیتا جو اکثر مل جاتی۔

روبی کے لیے سب سے پسندیدہ موضوع اس کی والدہ تھیں۔ وہ اکثر کہتی کہ دنیا مانتی ہے کہ ماں اپنے بچے کے ساتھ کچھ برا نہیں کرسکتی مگر ایک ماں جب اپنے بچے کے ساتھ برا کرتی ہے تو وہ بس اتنا ہی کہ..... مرجاتی ہے۔ یہ سوچے بغیر کے بن ماں کے بچے کی زندگی تو ایسی ڈرائنگ بک جیسی ہوتی ہے جس میں ہر طرح کے پھول، پودے، مشہور کارٹون یہاں تک کہ قسم قسم کے چرند پرند تو بنے ہوئے ہوں مگر بے رنگ اور پھیکے..... بچہ ساری عمر یہی سوچتے گزار دیتا ہے کہ اسے دنیا اتنی خالی، پھیکی اور بدرنگ کیوں لگتی ہے؟

☆☆☆

ایسا کئی بار ہوا کہ روبی ضد میں نظر آتی۔ ایک عجیب سی بے حسی سی اس کی شخصیت پر چھا جاتی، جس کی زیادہ تر وجہ روبی کی چھوٹی پھوپھی ہوتیں۔ سعد ایسے میں روبی کا موڈ اچھا کرنے کی کوشش کرتا۔ زیادہ تر اس کا موڈ دو چار دن کی سختی کے بعد خود ہی بحال ہوجاتا جس کے بعد سعد کی باری آتی۔ وہ خوب مزاج دکھاتا۔

اتنے عرصے ساتھ رہنے سے سعد کو روبی کی چھوٹی پھوپھی کے اس کے خاندان پر اجارہ داری کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ بقول روبی کے اس کی والدہ کے انتقال کے بعد اس کی پھوپھی نے کمال چالاکی سے اسے، اس کی بڑی بہنوں، گھر بار، کاروبار یہاں تک کہ اس کے والد کو بھی یرغمال بنالیا تھا۔ وہ

زیادہ تر اس بات پر اپنی پھوپھی سے ناراض رہتی کہ وہ بھی اس کی بڑی بہنوں کی طرح اسے آگے پڑھنے سے روکتی ہیں۔

وہ اکثر کہتی کہ اس کی پھوپھی ہمیشہ اپنی مرضی سے اس کے متعلق ہر جگہ اور خاص طور سے روبی کے والد سے بات کرتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے بڑی بہنوں کے سلسلے میں کیا کہ اپنی ہی طرف سے کسی بھی آئے ہوئے رشتے کو اپنے بھائی کے سامنے یہ کہہ کر منظور کروایا کہ ان کی بیٹی کی بھی یہی مرضی ہے جبکہ رشتے کے بارے میں اس کی بہنوں کو خبر بھی نہ ہوتی پھر اس کی بہنوں کو کوئی فرق اس لیے بھی نہیں پڑا کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھیں کہ اس اکیلے پن سے باہر نکلیں..... جب کہ روبی اپنی ذات کے لیے ایسا کچھ نہیں ہونے دیتی۔

وہ ہمیشہ اپنے فیصلے خود لیتی تھی اور اس کا موڈ اسی بات پر اکثر خراب رہتا کہ پھوپھی نے اپنی ہی طرف سے روبی کی ذات کے لیے کوئی فیصلہ صادر کروادیا ہے۔ وہ جھنجھلا کر اس بات پر حیرت کا اظہار کرتی کہ آخر اس کے والد سعد کے والدین کی طرح اپنی بچیوں سے خود بات کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا بچوں اور باپ کے درمیان اس قدر دوری ہونی چاہیے جبکہ بیچ میں پل جیسا ان کی ماں کا وجود بھی موجود نہ ہو؟ روبی کی اس بکھری کوفت زدہ زندگی پر سعد کے والدین کو بھی دکھ ہوتا۔ خاص طور سے سعد کی والدہ روبی کو بہت پیار و چاہت سے ملتیں اور روبی بھی ان کا احترام کرتی۔

سب کچھ تو اچھا ہی جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کا آخری سال آ گیا۔ سب کو اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ روبی ڈگری لینے کے اب تک کے سفر میں کافی تھک گئی تھی۔ جس کی وجہ سے سعد اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں اس کے والدین نے ہر سمسٹر میں سعد کی حوصلہ افزائی کی اور آگے بڑھنے اور اچھا رزلٹ دکھانے پر خوشی منائی، وہیں روبی کے گھر میں ہر سمسٹر کے شروع ہونے پر روبی کو ایک نئی طرح کی باقاعدہ جنگ سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ اس کی پھوپھی بالا ہی بالا اس کے والد سے کہہ کر کہیں نہ کہیں روبی کے رشتے کی بات بڑھوا چکی ہوتیں۔

اور پھر "خاندان والے کیا کہیں گے کہ رشتہ بھیج کر مکر گئے یا پھر رشتہ منظور کر کے کیسے منع کیا جا سکتا ہے" جیسے دلائل دے کر روبی کو شادی کرنے پر مجبور کرتیں۔ آئے دن روبی اپنے محاذ پر ڈٹی نظر آتی۔ پوری کلاس میں وہ "یرغمال" کے نام سے مشہور تھی۔ دونوں کی زندگیوں کی مشکلات بھی کس قدر مختلف تھیں، جہاں سعد پڑھائی کے دوران خوش و خرم رہتا تو روبی پریشان اور اب سعد ڈگری حاصل کر لینے کے بعد نوکری حاصل کرنے کے لیے پریشان تھا تو روبی آخر کار ڈگری یافتہ ہونے کی خوشی میں سرشار تھی۔

☆☆☆

امریکہ جانے سے پہلے سعد کے والدین نے روبی کے گھر والوں کو اپنے گھر دعوت دی تھی، جس میں اشاروں میں سعد کی والدہ نے روبی کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا جس کو سنجیدگی سے صرف روبی نے ہی لیا تھا۔

سعد کے امریکہ پہنچتے ہی ایک طرف وہ نئی جگہ غیر ملک میں اپنے پاؤں جمانے میں مصروف تھا تو دوسری طرف اسے اپنے دوستوں کے ذریعے روبی کے متعلق مختلف خبریں ملتی رہتیں۔ سعد کی تقریباً روز ہی روبی سے واٹس ایپ پر بات ہوتی۔ سعد کی غیر موجودگی میں روبی سعد کے گھر بھی آتی جاتی تھی مگر ان تمام خبروں کے متعلق سعد نے کبھی بھی روبی سے تصدیق نہیں کی بلکہ اس نے سائرہ سے بات کرنی شروع کر دی تھی۔

سائرہ، روبی کی بڑی پھوپھی کی بیٹی تھی اور ان دونوں سے ایک سال جونیئر تھی۔ اکثر اوقات وہ روبی سے ملنے کلاس میں آ جاتی جس کی وجہ بڑی پھوپھی کا چھوٹی پھوپھی کے لیے کوئی پیغام ہوتا۔ روبی اور سائرہ کی کم ہی بنتی تھی۔ سعد یہ بات اچھی طرح جانتا تھا اور جان بوجھ کر سائرہ سے بات کرتا رہا تھا — مگر بات چھپی تو رہ نہیں سکتی تھی لہٰذا ایک دن روبی نے سعد کو

باقاعدہ فون کر کے سائرہ اور سعد کے آپس میں اس قدر گھلنے ملنے پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا اور سعد نے اپنی ہی بے وقوفی میں اس سے سچ پوچھنے کے بجائے یہ کہہ کر غصہ دلا دیا تھا کہ سعد جس سے چاہے دوستی کرے اور روبی کے پاس سعد کو روکنے کا فی الحال کوئی حق نہیں ہے، جس کے بعد سے روبی نے سعد سے بات کرنی بند کر دی تھی اور سعد چاہ کر بھی روبی کو منا نہیں سکا تھا۔

اتنی سی بات پر اتنے برسوں کا یارانہ چلا گیا تھا اور سزا کی مستحق سعد کی نظر میں روبی ہی تھی۔ اسے اپنی کسی بھی بات پر کوئی شرمندگی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت تک جب تک کہ اس نے تمام باتیں رضوان کو نہیں بتائی تھیں..... رضوان نے اسے سمجھایا تھا کہ سعد کو جب کے روبی واٹس ایپ پر میسر تھی تو اسے بھی روبی کے متعلق ملنے والی خبروں پر اسی سے بات کرنی چاہیے تھی جبکہ وہ روبی کے گھر والوں کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ حیرت تو اس بات پر تھی کہ روبی اسی باقاعدگی سے سعد کے گھر آنا جانا کر رہی تھی، جیسے وہ سعد کی والدہ کے اشارتاً کیے گئے وعدے پر ابھی تک اعتماد کیے بیٹھی ہو۔

سعد بھی ایک طرح سے مطمئن ہو گیا تھا اور سوچتا تھا کہ ملنے پر ہی اپنی بے وقوفی کا کھل کر اظہار کر کے روبی کو منا لے گا۔ امریکہ سے واپسی پر رضوان نے سعد کو سمجھایا تھا کہ وقت ضائع کیے بغیر سعد اپنے والدین کے ہمراہ روبی کے گھر چلا جائے مگر کراچی پہنچنے کے دوسرے روز ہی ایک کلاس فیلو کی شادی میں جب پہلی بار سعد، سائرہ اور روبی اکٹھے ہوئے تو تمام تر کوششوں کے باوجود سعد روبی سے کھل کر بات نہ کر سکا۔ دوسری طرف سائرہ، سعد سے سائے کی طرح چمٹ گئی اور یہی وجہ تھی کہ واپسی پر جب سعد نے موقع دیکھ کر روبی کو اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے کا کہا تو اس سے پہلے کہ روبی کوئی جواب دیتی، سائرہ نے دونوں کی طرف سے ہامی بھر لی اور بعد میں سعد کو معلوم ہوا کہ اب روبی کے گھر پر چھوٹی پھوپھی کے ساتھ ساتھ بڑی پھوپھی بھی مع اہل و عیال رہنے لگی ہیں۔

اسی وقت فون کر کے گھر سے آنے والی گاڑی کو منع کر دیا گیا اور سائرہ نے فون پر ہی اپنی والدہ کو اس طرح سعد کے ساتھ آنے کا بتایا جیسے آج کے بعد وہ ہمیشہ سعد کے ساتھ ہی آیا جایا کرے گی۔

روبی کی خاموشی سعد کو بہت کھل رہی تھی۔ وہ ایسی بالکل نہیں تھی، خاص طور سے پہلے بھی جب سائرہ سعد کے ساتھ بہت زیادہ شوخ ہونے لگتی تو روبی اسے بری طرح جھڑک دیتی مگر اب تو جیسے روبی کو بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ سعد روبی سے زیادہ سائرہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ واپسی کے سفر پر سعد کی گاڑی کو پیچھے سے ایک تیز رفتار ٹرالر نے ٹکر ماری جس کے نتیجے میں روبی کو تین چار دن ہسپتال میں رہنا پڑا جبکہ سائرہ اور سعد کو معمولی مرہم پٹی کر کے فارغ کر دیا گیا تھا۔

سعد کی والدہ کئی بار روبی کی عیادت کرنے اس کے گھر جا چکی تھیں مگر سعد ہمت کر کے بھی ساتھ نہیں گیا تھا اور اب ایک نئے قسم کا کھیل شروع ہو گیا تھا کہ اچانک سعد کے گھر والوں کو ان لوگوں کی طرف سے شادی بیاہ، ولیمے اور عقیقے کی دعوتیں ملنے لگی تھیں، جس میں سائرہ اور اس کے گھر والے بھی موجود ہوتے۔ نتیجہ یہ کہ اب سعد اور سائرہ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے تھے.....

''جب کسی مضبوط انسان سے اس کے رویے یا فیصلے پر بات کرو اور وہ جواب میں ہاں ناں کہہ کر بات نمٹا دے تو ہمیں اس کی ہاں یا ناں پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ہم سے اس مضبوط انسان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ چاہے اس کے خلاف جتنی بھی چہ مگوئیاں سنیں، صرف اس کی ہاں یا ناں پر یقین رکھیں اگر تم اتنا بھی نہیں کر سکے تو پھر کیا فائدہ اتنے دنوں کی دوستی اور ساتھ کا؟''

رضوان نے سعد کی لمبی خاموشی کے بعد آخر کار کہنا شروع کیا..... سعد نے پہلو بدل کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو رضوان نے ہاتھ کے اشارے

سے اسے روک دیا۔

''تمہاری احساس کمتری تمہیں بہکاتی رہی۔ تم جانتے تھے کہ روبی اس قدر مضبوط انسان ہے کہ تمہارے یا تمہاری والدہ کے کیے گئے وعدے پر مشکل سے ہی سہی مگر ہر محاذ پر ڈٹی رہے گی۔ تم سے بے وفائی کبھی نہیں کرے گی۔ تم یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ تم نے اگر روبی سے ان افواہوں کے بارے میں پوچھا تو روبی صاف انکار کردے گی۔ ایسے میں تمہارے پاس چارہ اس کی ''نہ'' پر صرف اعتبار کرنا تھا مگر تم سے اتنا ہی نہ ہوسکا۔ تمہیں اس بات پر حیرت تھی کہ روبی جیسی لڑکی بھلا تم جیسے لڑکے کے لیے اتنا لمبا عرصہ یہ سب کچھ کیوں سہے گی..... لہٰذا تم اپنے احساس کمتری میں ان افواہوں کو یقین میں بدلنے کے لیے جت گئے مگر یہ یاد رکھو کہ سائرہ سے دوستی کرنے پھر اس کے ساتھ گھومنے پھرنے تک کے تمام عرصے میں تم نے روبی کو نہیں بلکہ صرف خود کو گنوایا ہے.....''

رضوان جانتا تھا کہ اس کی سخت باتیں سعد کو غصہ دلا سکتی ہیں مگر اسے حیرت ہوئی جب سعد غصے میں آنے کے بجائے صوفے میں دھنسا پیشانی سے پسینہ پونچھتا رہا۔ رضوان کو اس پر رحم آ گیا۔ کیوں کہ سعد کی یہی بات پسند تھی کہ وہ اپنی غلطی پکڑے جانے پر الٹے سیدھے دلائل دینے کے بجائے اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار کردیتا تھا۔

''تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے، میں تو واقعی پھنس گیا ہوں؟'' سعد شرمندگی سے بولا۔

''تمہارے پاس اب ایک یہی چل بچا ہے کہ جلد از جلد اپنے والدین کو روبی کے گھر لے جاؤ اور کیونکہ وہاں پر سائرہ بھی رہتی ہے تو تمہارے والدین کو چاہیے کہ روبی کے والد سے بات بڑھاتے ہوئے صاف لفظوں میں روبی سے تمہارے رشتے کی بات کریں اور.....''

رضوان ابھی بات کر ہی رہا تھا کہ سعد جلدی سے بول پڑا۔

''مگر یہ سب کچھ سننے اور دیکھنے کے بعد کیا روبی چاہے گی کہ میں اپنے والدین کو اس کے گھر لے کر پہنچوں اور..... اور اس نے انکار کردیا تو.....؟''

سعد کی بے چینی پر رضوان مسکرا اٹھا۔

''جہاں تک میں اس لڑکی کو سمجھا ہوں، وہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ تمہاری طرح سنی سنائی پر یقین کرنے اور اس کی وجہ سے اپنے فیصلے بدلنے کی غلطیاں نہیں کرتی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اب تک انتظار ہی کررہی ہے۔ اس بات کا کہ تمہیں اپنا وعدہ وفا کرنے کا خیال آئے اور اس بات کا بھی کہ کب تم اپنے وعدے سے مکمل کر مکرتے ہو۔ دونوں صورتوں میں وہ جب تک باقاعدہ کوئی اعلان نہیں سن لے گی، اس محاذ پر ڈٹی رہے گی۔ جس محاذ پر تم اسے کھڑا کر کے گئے تھے۔ یوں سمجھو کہ وہ تم کو نہیں چھوڑے گی، جب تک کہ تم اسے نہیں چھوڑ دیتے۔ کچھ لوگ آزاد ہو کر بھی دوسروں کی سوچ اور نظریوں کے غلام ہوتے ہیں، ان کی اپنی عقل پر کبھی بھی ہوش و حواس کے دروازے نہیں کھلتے۔ وہ اپنے لیے فیصلے کرتے ہوئے ہمیشہ دوسروں کی رائے نہیں بلکہ ان کے فیصلے مانگتے ہیں جبکہ کچھ لوگ یرغمال ہو کر بھی آزاد روح ہوتے ہیں۔ ان کا دماغ کسی کی باتوں میں آ کر بہکتا ہے اور نہ ہی وہ اپنی ذات کے متعلق اپنے کیے فیصلوں پر کبھی دوسروں کی باتوں میں آ کر رد و بدل کرتے ہیں..... سمجھے کہ نہیں؟''

سعد کے خاموشی سے اٹھ کھڑے ہونے پر رضوان نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''یرغمال وہ نہیں تم ہو اور تم جیسے یرغمال کو روبی جیسے آزاد ہی ٹھیک کرسکتے ہیں۔ لہٰذا قسمت بخیر، میرے دوست!''

مکمل ناول

گرمی تھی تو سہی مگر حبس نہیں تھا، ہوا تھی اور خوش گوار تھی، پھر بھی سڑک پار کر کے ایک اور ذیلی سڑک پہ آتے آتے اس کا چہرہ پسینے میں تر ہونے لگا تھا جسے وہ بار بار پرفیومڈ ٹشو سے تھپتھپا رہی تھی۔

بلو جینز کی جیب میں غیر ارادی طور پہ ہاتھ گھسیڑتے ہوئے اس نے خود کو ملامت کی کہ اس خطے میں آ کر اسے لباس کا درست انتخاب کرنا چاہیے۔

آدھی آستین کی ہلکی سی شرٹ کچھ غنیمت تھی، حالانکہ گرمی کچھ اتنی زیادہ تو نہیں تھی مگر اس کے لیے یہ بھی بہت تھی۔

سرد خطے کی سرمئی آنکھوں اور سنہری مائل بھورے بالوں والی گیت کے لیے کراچی کا یہ گرم موسم برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ جہاں سے آئی تھی وہاں خون جما دینے والی سردی، مسلسل ہونے والی برف باری اور اکثر رہنے والی دھند سے تنگ آ کر وہ

نعیمہ ناز سلطان

لمحوں کی خطا

ایسے ہی گرم سورج اور گرم موسم کی تمنا کرتی تھی۔ تو آج جب یہ تمنا پوری ہوئی تو اسے یہ بھی بری لگ رہی تھی۔

''میرے فرینڈز ٹھیک کہتے ہیں کہ گیت! تم کسی حال میں خوش نہیں رہتی ہو اور ڈیڈ کہتے تھے کہ تم بہت نازک مزاج ہو، برداشت نہیں ہے تم میں۔'' ایک کے بعد ایک قدم اٹھاتے ہوئے وہ دوسروں کے تبصروں کو آئینہ بنا کر اس میں اپنا آپ دیکھ رہی تھی۔

''اس لائن میں کون سا گھر ہوگا؟ جس کا گیٹ ڈارک براؤن ہو اور اس کی دائیں دیوار سے باہر بوگن ویلیا کی بیل اپنے کاسنی پھولوں کے ساتھ لٹک رہی ہو اور بائیں دیوار پر اوپر دیکھیں تو آم کے درخت کی شاخیں نظر آئیں گی، تھوڑی سی باہر آئی ہوئی، زیادہ تر اندر۔''

بچپن سے اب تک اس نے اتنی بار یہ نقشہ سنا تھا کہ جزئیات سمیت اسے حفظ ہو گیا تھا۔ ویسے اس کے پاس لکھا ہوا پتا بھی تھا۔ اس نے ایک بار پھر جیب سے لفافہ نکال کر اس پہ لکھا نام اور پتا پڑھا۔ مگر یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ اس شہر کے اکثر گھروں پہ نیم پلیٹ لگانے کا رواج نہیں اور نہ ہی گھر نمبر لکھنے کا، پوش علاقوں کے سوا، محض نام اور پتے سے کسی کو ڈھونڈنا ایک مہم کے برابر ہے۔ تو آج گیت نے یہ مہم تقریباً سر کر ہی ڈالی۔ اس کے حساب سے، بلکہ ساری علامتوں کے حساب سے گھر اسی لین پر ہونا چاہیے۔

وہ دس گیارہ سال کا بچہ تھا۔ گیند اچھالتا ہوا جا رہا تھا۔ گیت نے اسے روکا۔

''مسٹر ریاست احمد کا ہوم؟ وڈ یو نو؟'' گیت اردو سمجھ لیتی تھی تھوڑی بہت، اور بول لیتی تھی گزارے لائق، وہ سوالیہ نظروں سے بچے کو دیکھ رہی تھی جس نے چند لمحوں اس کے بتائے نام پہ غور کر کے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آئی ڈونٹ نو میم.....؟''

''کیا بات ہے؟'' سانولے سے رنگ کا ایک لمبا اور دبلا پتلا نوجوان سامنے گھر کا گیٹ کھول کر نکلا تھا، گیت نے پھر وہی دہرایا جو بچے سے کہا تھا۔

''تم کون ہو ان کی؟'' لڑکے نے انگریزی کا سہارا لیا سوال پوچھنے کے لیے۔

''کیا یہ بتانا ضروری ہے؟'' گیت نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''کیا ضروری ہے کہ اگر کوئی کسی کو ڈھونڈ رہا ہو تو اس کا کچھ لگتا بھی ہو؟ وہ محض ڈاکیہ بھی تو ہو سکتا ہے یا پیغام رساں، جس کے ذمے مکتوب الیہ کو محض مکتوب پہنچانا ہو یا کوئی پیغام اور بس۔''

گیت نے دل میں سوچا پھر وہ اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی جو شاید کچھ کہہ رہا تھا۔

''یہ..... یہ گھر۔'' اس نے اسی گیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں سے وہ نکلا تھا۔

''یہ؟'' گیت نے اچنبھے سے پہلے گھر پھر اس نوجوان کو دیکھا۔ ''مجھے بتایا گیا تھا اس مکان کے احاطے میں آم کا درخت ہے اور.....''

''اور باہر سے نظر آنے والی بوگن ویلیا کی لٹکتی شاخیں اور احاطے میں اندر امرود، پپیتے اور لیموں کے درخت تھے، کیاریاں جن میں ہرا دھنیا پودینہ اور ہری مرچیں لگی ہوئی تھیں۔''

نوجوان نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا، گیت نے ایک نظر اسے دیکھا جس کی سیاہ آنکھیں بھی اس کی زبان کی طرح بولتی ہوئی سی تھیں۔ کچھ کہے بغیر وہ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے وہ نوجوان، پھر گیت اس کی رہنمائی میں چلتی ہوئی ایک چھوٹا سا برائے نام صحن، ایک برآمدہ اور دو کمرے عبور کر کے تیسرے کمرے میں پہنچی، چھوٹی مسہری پر ایک نحیف سا وجود سکڑا سمٹا پڑا تھا۔ آہٹ سن کر ان کا سر اور آنکھیں دروازے کی طرف گھوم گئیں۔

''کون ہے؟'' ناکافی روشنی میں انہوں نے اپنے پوتے کے پہلو میں کھڑی لڑکی کو دیکھنے بلکہ پہچاننے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔

''لیورپول میں موجود ماریہ احمد نے آپ کے لیے ایک خط اور ایک میسج دیا تھا۔'' گیت نے اپنا تعارف کروائے بغیر، کسی تمہید کے بغیر اور بیٹھے بغیر، سب سے پہلے وہ الفاظ ادا کیے جنہیں کب سے ذہن کی پوٹلی میں باندھ باندھ کے رکھ رہی تھی۔

''کیا ..... کیا کہا ماریہ نے؟'' ان کے کمزور سے وجود میں اک دم ہی کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ وہ بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے، نوجوان نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ گیت دو قدم آگے بڑھ آئی، ان کی اونچے پایوں والی مسہری کے ذرا قریب۔

''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ان کی موت میرے سامنے ہو اور وہ مرتے وقت کلمہ شہادت پڑھیں تو۔ میں یہ بات آپ کو بتادوں تو ڈیئر اولڈ مین! حالانکہ میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں مگر ایک پیغام پہنچانے کی اخلاقی ذمے داری میں نے پوری کر دی ہے۔ ماریہ احمد نے مرنے سے پہلے کلمہ شہادت پڑھا تھا عربی کے کچھ الفاظ میرے سامنے ادا کیے تھے اور یہ خط۔''

گیت سے اپنی انگریزی لفظوں کی آمیزش والی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتے ہوئے اپنے کندھوں سے لٹکا بیگ اتارا اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

''وہ مرگئی؟'' کمزور چہرے پہ، دو بڑی بڑی آنکھوں میں دکھ اور کرب کا سمندر یکا یک ہی امڈ آیا۔

''دو ماہ پہلے۔'' گیت نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اور تم، تم کون ہو؟'' انہیں یہ خیال اب آیا تھا۔

''میں ان کی بیٹی ہوں۔'' ڈیڈ نے اس کا نام گیتا رکھا تھا اور ممی نے گیتی آرا پھر دونوں نے بیچ کی راہ نکال کر اسے گیت نام دے دیا۔ لڑکی نے بغیر کسی جذباتیت کے، سپاٹ لہجے میں انہیں بتایا تھا۔ اپنے تئیں وہ بڑی حد تک غیر جذباتی اور حقیقت پسند لڑکی تھی مگر اسے بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ غلط تھی۔ دیار مغرب کے اکثر افراد کی طرح.....

تو اس وقت جو کہانی گیت کی آمد سے شروع ہوئی ہے۔ وہ کہانی دراصل بہت برسوں اور دو نسلوں پہلے شروع ہوئی تھی وہ جو شاعر نے کہا ہے نا کہ.....

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ اک دم نہیں ہوتا

تو گیتا + گیتی آرا عرف گیت کا وجود، اس کی آمد ایک اچانک حادثہ نہیں تھی، اس کے پیچھے ایک طویل کہانی ہے۔

اور اس کہانی سے ایک اور شاعر کی یہ بات بھی کچھ کچھ سمجھ میں آئے گی کہ لمحوں کی خطا کے بعد صدیاں کیسے سزا پایا کرتی ہیں۔

☆☆☆

''اس لڑکے کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔''

ریاست احمد کی والدہ، اس کے بارے میں بڑی پختہ رائے رکھتی بھی تھیں اور اظہار بھی کرتی تھیں، جسے وہ ایک زوردار ہنسی میں اڑایا کرتا تھا۔ سن 75ء میں تھا۔ وحید مراد کا ہیئر اسٹائل ابھی مقبول تھا۔

ریاست اپنی گھنے بالوں کو اسی انداز سے ترشوا کر اب آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ ماتھے پہ آدھے

بال ترچھے انداز میں گرا کر اپنا جائزہ لیتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ اگر وحید مراد کی طرح نہیں تو اس سے کچھ کم بھی نہیں تھا۔ اس کی سانولی رنگت میں بلا کی جاذبیت تھی اور کھڑے نقوش میں بے حد کشش اپنے دراز قد کے ساتھ وہ محفل میں نمایاں ہی نظر آتا تھا۔ بی کام کے بعد نوکری اچھی مل گئی تھی۔

اس زمانے میں اتنی پڑھائی پر عموماً اچھی نوکری مل ہی جاتی تھی۔ اور سرکاری نوکری بھی ملنا کوئی جوئے شیر نکالنے کے مترادف نہیں تھا، تو ایک اچھی نوکری کے بعد گھر میں شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگی تھیں، اگرچہ محلے کی ایک حسینہ پہ ریاست علی کا دل آیا ہوا تھا، مگر اماں کو وہ ایک آنکھ نہ بھائی، گوری رنگت کو انہوں نے پھیکا شلجم قرار دیا اور گداز بدن کو موٹاپے کی علامت، پھر ان کا خاندان الگ، برادری الگ اور بھی نہ جانے کیا کیا اعتراضات کھڑے کر کر کے انہوں نے اتنی اونچی اور مضبوط دیوار بنالی کہ بے چارہ ریاست یہ دیوار پھلانگ ہی نہ سکا اور خاموشی سے خالہ کی بیٹی کو بیاہ کر لے آیا۔

جو اس کی طرح تھی، سانولی، پرکشش اور جامہ زیب، اس نے ریاست احمد کو پہلے سال بیٹے کا تحفہ دیا اور گھر بھر کی لاڈلی بہو بن گئی اور تھوڑی سی قدر ریاست احمد بھی کرنے لگا تھا۔ بیٹا گھٹنوں گھٹنوں چلنے لگا تھا جب ریاست احمد کی کاوشیں بارآور ہوگئیں یا قسمت مہربان ہوگئی یا پھر شاید دونوں ہی عوامل ہوں، اس کے لندن جانے کی راہ ہموار ہوگئی، وہاں موجود اس کے کزن اور بڑے بھائی کی سی حیثیت رکھنے والے اعظم بھائی نے بھی اس کی خاصی مدد کی تھی پھر ان دنوں میں دیار مغرب میں جانا، رہنا بسنا اتنا مشکل نہیں تھا اور یہ رواج زور پکڑ رہا تھا۔

ریاست علی کی بیوی اور والدہ کو کچھ تحفظات تھے مگر معاشی آسودگی کے خواب ان تحفظات پہ غالب آ گئے۔ یوں وہ لندن آ گیا۔ اعظم بھائی کے پاس، جہاں وہ لانڈری میں کام کرتے تھے، اپنے ساتھ اسے بھی لگا لیا۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی لانڈری میں صبح سے رات تک کام کر کے وہ ایک گھنٹہ سفر کر کے اپنے ٹھکانے آ جاتے، جہاں ایک مکان کے تہہ خانے میں ان دونوں سمیت چار پاکستانی تین انڈین اور تین ہی بنگالی تھے۔ ایک آئرش لڑکا بھی تھا جو اخبار کے دفتر میں نوکری کرتا تھا۔

اس کی ڈیوٹی تب شروع ہوتی تھی جب یہاں کے باقی سارے مکین اپنی اپنی نوکریاں نمٹا کر یا بھگتا کر واپس آتے تھے، الٹا سیدھا کچھ بھی کھا پی کر پیٹ بھرتے اور بے سدھ ہو کر اپنے اپنے میٹرس پہ پڑ جاتے تاکہ صبح وقت پہ بیدار ہو سکیں۔

ایک مہینہ جیسے تیسے ریاست علی نے نکال لیا، ہڈیوں کا گودا اور خون جما دینے والی سردی میں روزانہ علی الصبح اٹھ کر خود کو گرم کپڑوں، جرابوں، جوتوں، دستانوں اور ٹوپے میں ملفوف کر کے اعظم بھائی کے ساتھ نکل جاتا۔

ڈبل ڈیکر بس کی ایک گھنٹے کی سواری کے بعد ہوٹل پہنچتا، وہاں مشقت کرتا اور پھر رات میں واپسی ہوتی تو گرم اور تازہ روٹیاں، شوربے والے سالن، بگھاری دالیں، بھنی ہوئی سبزیاں دھنیے، پودینے کی خوشبو والی چٹنیاں، پلاؤ، کباب، کوفتے، قورمے، پاکستان اور گھر والوں کے ساتھ ساتھ یہ ذائقے بھی اسے بے طرح یاد آتے تھے، بالکل ان انڈینز اور بنگالیوں کی طرح جو اپنی تھالی مسالہ ڈوسا، پوری ترکاری اور موٹی چاول، پتلی چاول کی یاد میں آہیں بھرتے تھے اور چاول بھی کون سے؟ جوشی جو باسمتی کھانے والے ریاست احمد کے حلق سے نیچے بھی نہیں اترتے مگر اس وقت تو سب ایک دوسرے کا غم بانٹنے میں ہی لگے رہتے تھے۔

یہی بے پناہ محنت و مشقت، گھر سے دوری، اپنی پسند کے کھانوں سے محرومی، ایک روز ریاست کے صبر کا پیمانہ بلکہ سارے پیمانے لبریز ہو گئے۔ ٹوسٹ پہ مکھن لگا کر یا انڈا توس کھا کر اور یخنی پی پی کر کب تک گزارا کرتا۔

''اعظم بھائی، کوئی ایسی جگہ دیکھیں رہنے کے

لیے جہاں کچن کی سہولت ہو۔"

"میاں، کچن کی سہولت تو یہاں بھی مل سکتی ہے، بس پاؤنڈز خرچ کرنے پڑیں گے۔"

"تو کرلیں گے، خدا کی قسم اب تو اس انڈے توس اور مکھن توس، پنیر توس سے ابکائیاں آنے لگی ہیں۔"

"زبان کے ذائقوں میں پڑو گے تو گھر کیا بھیجو گے صاحبزادے؟" انہوں نے اقتصادی مسئلہ اٹھایا۔

"یہ قربانی آپ ہی دے سکتے ہیں اعظم بھائی! میں نہیں کہ بھوکا رہ کر اور ڈبل روٹی کھا کر پاؤنڈز بچا کر گھر بھیجوں اور وہاں وہ لوگ قورمے بریانی کے مزے اڑائیں۔" ریاست احمد تڑخ گیا۔

ویسے اس نے کوئی اتنی غلط بات بھی نہیں کہی تھی۔ اسے تو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہر دو تین سال بعد آنے والے اعظم بھائی جو خاندان بھر کے لیے تحائف لاتے ہیں وہاں رہ کر بے دریغ نوٹ خرچ کرتے ہیں اور جن کا ایک نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں نیا بنگلہ زیر تعمیر ہے، جن کی بیوی بچوں کا رہن سہن پہننا اوڑھنا یعنی اسٹائل پورے خاندان اور محلے میں قابل رشک ہے۔ وہ اعظم بھائی کی قناعت، جز رسی، کفایت شعاری بلکہ فاقہ کشی کی مرہون منت ہے۔

ریاست احمد تو اسے فاقہ کشی ہی کہا کرتا تھا۔ تو ریاست ایسی زندگی گزارنے، ایسی قناعت اختیار کرنے اور ایسی قربانی دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس کے مقاصد، عزائم اور خواب و خواہشات واضح تھے۔

وہ زندگی بہتر بنانے سنوارنے یہاں آیا تھا، صرف اپنی فیملی کی نہیں بلکہ اپنی بھی، یہاں تفریح، خوشی اور آسودگی کے بہت ذرائع تھے، وہ ان سے بے خبر، اور دور رہ کر زندگی گزارنے کا قائل نہ تھا۔ تو جب ان کے ساتھ رہنے والے دو پاکستانیوں کو برمنگھم جا کر ایک فیکٹری میں نوکری کا موقع ملا تو ریاست احمد بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ یہاں اجرت زیادہ تھی۔ چھ افراد نے رہنے کے لیے جو دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ لیا ہوا تھا اس میں ایک ننھا منا سا کچن بھی تھا۔ چھٹی کے دن سب مل جل کر وہ کھانے بنا لیتے جنہیں کھانے کو یہاں ترس گئے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ بھرے پیٹ کی آسودگی انسان کی نگاہیں کشادہ کر دیتی ہے تو ریاست کی آنکھیں کھل گئی تھیں، کشادہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھیں، ساتھ کام کرنے والی ایک دو گوریوں اور پاس پڑوس کی ایک دو بڈھے بڈھیوں سے محاورے کے مطابق سلام دعا ہونے لگی تھی اور شناسائی پہلے بے تکلفی پھر بے خودی کی حد میں پہنچ گئی۔

☆☆☆

اسٹیلا سارا دن ریاست کے ساتھ اور دیگر ورکرز کے ساتھ کام کرتی تھی، وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی اسے اور ریاست دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے، ملنے اور بات کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ دونوں کے رہائشی مقامات میں کم از کم پون گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ ویک اینڈز پہ فاصلے گھٹ جاتے۔

اسٹیلا کی گوری رنگت سنہری آنکھیں اور سنہرے ہی بال ریاست کو اس کی پہلی محبت کی یاد دلا دیتے، جسے وہ شاید اب تک دل کے نہاں خانے میں کہیں چھپائے یا سجائے بیٹھا تھا۔

اسٹیلا مغربی لڑکی تھی مگر اس کے اطوار اس کے خیالات، اس کے خواب سب مشرقی ہی تھے، وہی گھر، دریچہ اور معصوم سا بچہ والی تھیوری، جس پر وہ یقین رکھتی تھی یا پھر مشرق و مغرب کی باتیں ہیں، دنیا کی ہر لڑکی ہر عورت شاید اس تھیوری پہ یقین رکھتی ہو؟ تو اسٹیلا کو یہ سانولی رنگت، لمبے قد والا پرکشش ریاست بہت بھا گیا تھا، جو اب بھی آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر خود کو تسلی دیتا تھا کہ اگر وہ وحید مراد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں اور کم از کم ندیم جتنا پرکشش تو ہے ہی، تو اس کا یہ خیال اور خوش فہمی کچھ غلط بھی نہیں تھی۔

اسٹیلا اس کی سانولی رنگت، گہری آنکھوں اور اس کی لچھے دار باتوں میں ڈوبتی ہی جا رہی تھی اور ریاست اس کی سنہری زلفوں میں الجھتا ہی جا رہا تھا۔ معاملہ پھیلتا چلا گیا۔

دونوں کے درمیان قربت گہری ہو رہی تھی

اور الفت کا دیا بھرپور روانی کے ساتھ بہنے لگا تھا اور ایک دن جب ریاست کے شانوں پہ سر رکھی اسٹیلا نے فرمائش کی کہ.....

''آؤ ہم دونوں شادی کر لیں۔'' تو اچانک اسی لمحے ریاست کو یاد آیا کہ وہ پاکستان سے آیا ہوا ایک محنت کش مزدور ہے، جس کی ایک بیوی اور ایک بچہ بھی ہے۔ مگر وہ لمحہ؟ وہ ایسا جذباتی لمحہ تھا کہ ریاست اس وقت ساری دنیا کو بھی فراموش کرنے کو تیار تھا تو بیوی بچہ کیا شے تھے؟

اسٹیلا جب اسے بتاتی کہ ریاست سے ایک پل بھی دور رہنا اس کے لیے کتنا سوہان روح ہے تو اسے بھی اپنے جذبات ایسے ہی محسوس ہوتے، اسٹیلا سے دور رہنا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

دونوں کو ایک دوسرے کی چاہت، ایک دوسرے کے ساتھ اور قربت کی خواہش نے بے کل کر رکھا تھا۔ سرد ممالک میں رہنا آسان تو نہیں ہوتا، آگ، گرمائش، حرارت، ان کی موجودگی ہی زندگی کو کچھ آسان کر سکتی ہے محبت یا شائد طلب دونوں کچھ بھی تھا مگر آگ نے بھڑک کر ماحول نرم گرم کر دیا تھا، جس میں رہنے بسنے کے لیے دونوں بے قرار تھے۔

اسٹیلا نے سارے تحفظات ختم کر دیے تھے، سارے سوالوں کے جواب دے کر ساری راہیں ہموار کر دی تھیں، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے کو تیار تھی۔ معاشی میدان میں وہ ریاست کا ہاتھ بٹانے کو تیار بھی پھر وہ بڑے خلوص اور تن دہی سے اس سانولے پیا کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کے والہانہ پن، لگاؤ، یگانگت اور اعتراف الفت نے ریاست کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

آتی بہار کی ایک سبز گلابی سی شام، اسلامک سینٹر میں اسٹیلا نے کلمہ پڑھا اور سارہ بن کر ریاست کی زندگی میں مکمل طور پر داخل ہو گئی۔ دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لیا تھا جس کا ایڈوانس ریاست نے دیا تھا اور فرنیچر سارہ نے خرید کر ڈالا تھا۔ اس نے دیواروں پہ پینٹنگز اور کارنس پہ گلدان سجائے، ننھی منی سی بالکنی میں جیرینیم، ہولی ہوکس اور ڈیزی کے پھولوں کے چھوٹے چھوٹے سے گملے رکھے تھے۔ ایک انڈور پلانٹ اس نے بیڈروم میں بھی رکھا تھا۔ اسے پھولوں کا بہت شوق تھا۔

ایک ہفتے کا ہنی مون بھی منا آئے کہ چھٹیاں اتنے ہی دنوں کی ملی تھیں۔ سارہ کچھ دل گرفتہ تھی۔ اس کے خوابوں میں اتنا مختصر سا ماہ عسل نہیں تھا۔

''ہم دونوں اپنی چھوٹی سی جنت میں روز ہنی مون منا سکتے ہیں کہیں اور جانا ضروری نہیں بس ایک دوسرے کا ساتھ ضروری ہے۔''

ریاست نے اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا اور وہ بہل گئی تھی۔ اور ریاست بھی اس سنہرے ہنی مون سے بہلا ہوا تھا تب ہی تو فش اینڈ چپس، سوپ برگر فرنچ فرائیز اور سینڈوچز کھا کھا کر اکتایا نہیں تھا۔

☆☆☆

پھر ایک روز اعظم بھائی آ گئے اسے تلاش کرتے ہوئے۔ ان تک اطلاع پہنچ چکی تھی کہ اس نے کیا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔

''واہ میاں! بڑی پھرتی دکھائی تم نے، جو کام ہم آٹھ سال میں نہیں کر سکے تم نے دو سال میں ہی کر لیا؟''

اعظم بھائی بڑے زندہ دل اور ہنس مکھ انسان تھے۔

''ضرورت تھی اعظم بھائی! اب ہر کوئی آپ کی طرح سادھو سنت تو نہیں ہوتا نا۔'' ریاست نے ان کے آگے کولڈ ڈرنک اور چپس کی پلیٹ رکھی۔

سارہ ہیلو ہائے کر کے اور معذرت کر کے گئی تھی۔ ہفتے بھر کی گروسری چھٹی کے دن ہی خریدتے تھے۔ ویسے تو دونوں ساتھ جاتے تھے مگر اس وقت سارہ اکیلی ہی چلی گئی، ریاست گھر پر ہی ٹھہر گیا مہمان کی خاطر داری کے لیے۔

''اعظم بھائی! ذرا خیال رکھیے گا، گھر تک بات نہ پہنچے۔'' ریاست ملتجی لہجے میں ان سے مخاطب تھا۔

''ہم تو خیر تمہارا راز رکھ لیں گے مگر یہ بتاؤ، یہاں اور وہاں، دونوں کو مینج کیسے کرو گے؟''

''اللہ بڑا رحیم اور رازق ہے اعظم بھائی!''
ریاست مسکرایا، طمانیت اور آسودگی بھری مسکراہٹ۔
''سارہ کی ممی ایک کالے اور ایشیائی کے انتخاب پر اس سے ناراض تھیں مگر اب مان گئی ہیں شاید اپنی تنہائی اور بیماری سے گھبرا گئی ہیں یا بیٹی کی محبت، کوئی بھی وجہ ہو، ہمارے لیے بہت آسانی کر دی ہے انہوں نے، بیٹی داماد کو اپنے گھر رکھنے پر تیار ہیں کرائے سے جان چھوٹ جائے گی میری اور فیکٹری میں بھی میری ترقی ہو گئی ہے، مشین آپریٹ کرنا سیکھ لیا ہے۔ اجرت بڑھ گئی ہے۔ یہاں کے اخراجات تو ہم دونوں مل کر مینج کر لیتے ہیں۔ پاکستان بھیجنے کے لیے ٹھیک ٹھاک بچت ہو جاتی ہے۔ سارہ کو بتا دیا تھا میں نے کہ مجھ پہ ذمے داریاں ہیں ایک فیملی کی، گھر پیسہ بھیجنا ضروری ہے۔'' ریاست نے تفصیل سے بتایا۔
''پوچھا نہیں اس نے تمہاری فیملی کے بارے میں؟''
''بیوی اور بچے کے علاوہ باقی سب سچ بتایا ہے۔''
''آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' اعظم بھائی چپس کھاتے ہوئے اور سوال کرتے جا رہے تھے۔
''آگے کے بارے میں سوچنے والا آدمی ہوتا تو یہاں تک کیسے آتا؟ لندن آنے کا فیصلہ بھی بس ایک لمحے میں کیا تھا، یہ فیصلہ بھی لمحے کا کھیل ہے جو وقت گزر رہا ہے خوب ہے۔ مستقبل کی بات مستقبل میں دیکھی جائے گی۔'' ریاست نے لاپروائی سے ہاتھ ہلا کر گویا مکھی اڑائی اور اپنی زندگی کا فلسفہ بیان کیا۔
''کلمہ پڑھا کر نکاح کیا ہے نا؟''
''بالکل۔''
''اپنے رنگ میں ڈھالنا، اس کے رنگ میں نہ رنگ جانا۔'' اعظم نے اٹھتے ہوئے اسے نصیحت کی۔
''ارے، کہاں چلے، بیٹھیے، کھانا کھا کر جایئے گا۔'' ریاست نے بصد اصرار انہیں روکا۔ انہوں نے یہاں تک پہنچنے میں ریاست کا بہت ساتھ دیا تھا اور وہ احسان فراموش تو نہیں تھا۔
سارہ گروسری لے کر آ گئی تھی اور ریاست اسے اپنی ہیلپر بنا کر اعظم بھائی کے لیے خصوصی پکوان بنا رہا تھا۔ خالص دیسی پکوان یخنی پلاؤ اور قورمہ اس نے با آسانی تیار کر لیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اب کوکنگ میں اتنی مہارت تو ہو چکی تھی۔ چکن روسٹ اور فرائی فش سارہ کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ بس مرچ مسالے ریاست کے مشورے سے ڈالے تھے۔
کھانا تیار کر کے سارہ نہا دھو کر تیار ہوئی، ابھی ٹیبل لگانے میں کچھ وقت تھا۔ اعظم بھائی ٹی وی دیکھ رہے تھے، جیری لوئیس کی کامیڈی اب انہیں سمجھ آنے لگی تھی، کامیڈی سمجھ میں آ جائے تو ہنسی بھی آ جاتی ہے۔
ریاست بیڈ روم میں چلا گیا، یہ دیکھنے کہ سارہ کی تیاری کہاں تک پہنچی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی زلفیں سنوار رہی تھی۔ ریاست کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور گھوم گئی۔
''کیسی لگ رہی ہوں؟''
ریاست نے اسے غور سے دیکھا اور آج اس لمحے نہ جانے کیوں، اس کی نگاہیں ایک روایتی مسلمان اور پاکستانی کی نگاہیں بن گئیں اسی سارہ کی پھولدار فراک کا گلا آگے پیچھے سے انتہائی کشادہ لگ رہا تھا اور کھڑے ہونے پر اس کی سنہری پنڈلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔
''کوئی اور ڈریس نہیں ہے پہننے کے لیے؟''
اس وقت تو وہ یہی کہہ سکا اور سارہ جو اپنی تعریف سننے کی متمنی اور عادی ہو گئی تھی، حیران رہ گئی۔
''اس میں کیا برائی ہے؟''
''گلا بہت بڑا ہے اور نیچے سے دیکھو، فراک بہت چھوٹی ہے اعظم بھائی میرے کزن ہیں ہمارے ہاں ایسے پہناوے نہیں چلتے۔''
''مجھے تو ٹھیک لگ رہا ہے لیکن تم کہتے ہو تو، چلو میں دوسرا دیکھ لیتی ہوں۔''
سارہ کو اگرچہ ریاست کے اعتراض پہ اعتراض تھا اور لباس بدلنے میں ہچکچاہٹ کہ اپنی مرضی اور پسند کا لباس پہننا اس کا حق ہے، اس کی تربیت اور معاشرے کا رواج تو یہی تھا مگر پھر اس کے دل میں موجود ڈھیروں ڈھیر محبت کا دریا یکا یک ابل پڑا اور

اس کے اعتراض اور ہچکچاہٹ کو بہالے گیا۔ اس نے الماری سے دوسرا جوڑا نکال لیا۔ اسکرٹ کی لمبائی اس کے ٹخنوں تک تھی اور بلاؤز بھی پوری آستینوں اور بند گلے کا تھا۔ مگر جب تک اس نے ٹیبل سجائی، سب نے مل کر کھانا کھایا، پھر دونوں نے مل کر برتن اٹھائے، ٹیبل صاف کی، کافی بنا کر سرو کی اور برتن دھوئے اور جب دروازے پہ اعظم بھائی کو خدا حافظ کہا اس تمام وقت میں ریاست ایک مستقل بے چینی اور الجھن کا شکار رہا۔

''ہنی، تمہاری یہ شرٹ بہت ہلکی ہے، آئندہ نہ پہننا اسے۔'' بالآخر اس نے اپنے دل و دماغ میں چبھا کانٹا نکال ہی دیا۔

''مگر ڈارلنگ تمہیں تو یہ ڈریس بہت پسند تھا کتنی تعریف کی تھی تم نے۔'' سارہ کو اس کی بات کچھ نہ سمجھ میں نہ آئی اور نہ پسند۔

''سمجھا کرو بے بی! اب تم مسلم ویمن ہو، لباس کے معاملے میں احتیاط کرو۔'' ریاست نے اس کے شانوں کے گرد بازو دراز کیے اپنے انداز سے سمجھایا۔

☆☆☆

دونوں اب اس گھر میں شفٹ ہو گئے جو ریاست کی سسرال تھی اور سارہ کا میکہ۔ ٹھیک ٹھاک گھر تھا، چار بیڈ روم کا گھر کرائے سے تو جان چھوٹ گئی، بڑی بی دھنسی ہوئی آنکھوں اور خاکستری بالوں کے ساتھ درشت لہجہ اور کرخت مزاج رکھتی تھیں۔ جوڑوں کی تکلیف نے وہیل چیئر پہ پہنچا دیا تھا۔ مزاج میں کچھ تلخی بیماری کے سبب بھی تھی۔ سارہ انہیں با آسانی ہینڈل کر لیتی تھی۔

ریاست چھٹی والے دن ان کو وہیل چیئر سمیت پارک لے جاتا تھا۔ سارہ نے بتایا تھا کہ ممی کے بینک اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم موجود ہے مگر وہ ظاہر نہیں کرتی ہیں۔

☆☆☆

سارہ امید سے ہوئی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور ریاست نہ جانے کیا سوچ کر گم صم ہو گیا مگر خیر اس نے بہت جلد اپنی اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کیا اور سارہ کے ساتھ ساتھ اسی کی طرح خوش نظر آئے اور رہنے کی کوشش کرنے لگا۔

بیٹی بڑی پیاری تھی۔ سارہ کی طرح سنہری رنگت اور ریاست کی طرح سیاہ آنکھوں والے پرکشش نقوش، اخراجات میں اب ڈے کیئر کا خرچہ بھی بڑھ گیا تھا۔ سارہ پہلے دبی زبان میں، پھر واضح الفاظ میں ریاست سے مطالبہ کرنے لگی تھی کہ وہ کچھ ذمہ داریاں اب اور اٹھائے، سارا کے لیے سب کچھ مینج کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا، ریاست نے کچھ ذمے داریاں اٹھائیں مگر یوں جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ، پھر اس کی آئے دن کی تنقید اور اعتراضات۔''

''تم اسکارف کیوں نہیں پہنتی ہو؟'' چھٹی کے دن وہ پھر سارہ سے الجھ پڑا، وہ ماریہ کے لیے کچھ شاپنگ کرنے جا رہی تھی۔

''کیوں پہنوں؟'' اس نے پلٹ کر ناگواری سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

جب سے ماریہ کی پیدائش ہوئی تھی وہ کچھ زیادہ ہی بولنے لگا تھا۔ خصوصاً اس کے لباس پر، کبھی کبھار کی جانے والی اس کی سگریٹ نوشی پہ، پارٹیز میں گیدرنگ میں دوستوں کے ساتھ سارہ کی بے تکلفی پہ ریاست کا اس طرح ٹوکنا، تنقید کرنا اور اسے مشورے دینا سارہ کو برا لگتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ اس کی شخصی آزادی سلب کرنے کے مترادف تھا۔

''تم مسلمان ہو اپنے لباس سے تمہیں ایک مسلمان خاتون نظر آنا چاہیے۔'' ریاست کو اس کی ہٹ دھرمی کبھی کبھی بری لگتی تھی۔

''بہت سی مسلمان خواتین کو میں نے انتہائی بے ہودہ آؤٹ فٹس میں دیکھا ہے۔''

''میں ان کی بات نہیں کر رہا، تمہاری بات کر رہا ہوں، ماریہ جو کچھ سیکھے گی تم سے ہی سیکھے گی۔ ماں بننے کے بعد عورت کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔''

''کیا سارا اسلام بس لباس میں ہی چھپا ہے؟ اور بائی دا وے۔ بچہ صرف ماں سے نہیں، ماں اور

باپ دونوں سے سیکھتا ہے۔"

سارہ کھٹ کھٹ کرتی باہر چلی گئی۔ وہ ریاست سے محبت کرتی تھی۔ اس محبت میں کمی نہیں تھی مگر جب وہ سارہ پہ اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتا، اپنے احکامات اس پہ مسلط کرنے کی زبردستی کرتا تو وہ پھر ہتھے سے اکھڑ جاتی۔

وہ کوئی شتر بے مہار نہیں تھی، ریاست کی خواہش پر اس نے مسجد جا کر نماز اور قرآن پڑھنا سیکھا تھا۔ گو کہ وہ باقاعدگی سے نہیں پڑھتی تھی مگر کبھی کبھار پڑھ ہی لیتی تھی۔ خود ریاست کون سا نماز قرآن کا پابند تھا۔ جمعہ کے جمعہ مسجد جانے والوں میں سے تھا۔ وہ پورک نہیں کھاتی تھی، ڈرنک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بس کبھی کبھار اسموکنگ کر لیتی تھی۔ جو اخلاقی خوبیاں اسلام میں پسندیدہ ہیں، وہ اس میں پہلے ہی سے موجود تھیں جو اس مغربی معاشرے کی دین تھیں۔ کلمہ پڑھنے سے پہلے بھی وہ سچ بولتی تھی، صفائی پسند تھی جو نصف ایمان ہے، اس نے کبھی دھوکے فریب سے کام نہیں لیا، اپنی روزی کمانے کے لیے اس نے محنت اور وقت کے درست استعمال کا راستہ اختیار کیا۔ زیادہ آسودگی اور دولت کے لیے کوئی غلط طریقہ اور ناجائز حربہ استعمال نہیں کیا۔

ان سب کے بعد بس لباس پہ آ کر ان کی بحث اٹک جاتی تھی تو سارہ کو برا لگتا تھا اور کبھی وہ دکھی ہو جاتی تھی۔

"محبت کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے اشاروں پہ چلنے والا غلام بنا لے، میں اس کی مرضی سے اٹھوں بیٹھوں، کھاؤں اور پہنوں؟" سارہ سوچتی اور آزردہ ہو جاتی۔

دراصل دونوں کے بیچ اس معاملے میں کنفیوژن بہت تھا۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد سے ریاست کچھ حساس ہو گیا تھا۔ اسے ہر دم بیٹی کے مستقبل کے متعلق خدشات ستاتے رہتے سارہ کے لائف اسٹائل میں وہ بیٹی کے مستقبل کی تصویر دیکھتا اور پریشان ہو جاتا۔

اپنی بیوی کو وہ ایک اچھی مسلمان عورت بنانے کے لیے ہلکان ہو رہا تھا۔ سارہ ان کوششوں کو ریاست کی زبردستی اور اس کی مرضی سمجھ کر گریزاں ہوتی اور شخصی آزادی کا راگ الاپتی کیونکہ ریاست نے کبھی ڈھنگ سے اور پیار سے اسے سمجھایا ہی نہ تھا کہ یہ اس کی مرضی ہے یا اللہ کی؟

ریاست کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ عقیدے اور عمل کا بیج انسان کے اندر سے پھوٹتا ہے اسے باہر سے کسی کے دل و دماغ پہ مسلط نہیں کیا جا سکتا، مٹی کے اوپر زرخیز سے زرخیز بیج بھی سالوں تک ایسے ہی پڑا رہے گا اس میں سے کونپل نہیں پھوٹ سکتی، ریاست احمد مٹی کے اوپر پڑے بیج کا پودا اور پھر درخت بننے کا متمنی تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا قدرت اور فطرت کے اصول اٹل ہیں۔ اپنے طریقے پہ چلتے ہیں انسان کی مرضی اور خواہشوں پہ نہیں، وہ وقت کے ساتھ ساتھ سارہ تڑخ رہی تھی، ریاست کلس رہا تھا، دونوں کے درمیان دراڑ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، بیچ میں ماریہ پس رہی تھی۔

ریاست اپنی بیٹی کو قرآن اور نماز سیکھنے کے لیے قریبی مسجد بھیج رہا تھا۔ چھٹی کے دن اسے لے کر بیٹھ جاتا اور اسے وہ ساری اخلاقیات سکھاتا اور بتاتا رہتا جو پاکستانی معاشرے میں رائج تھیں۔ سارہ کبھی خاموشی اختیار کرتی، کبھی بول پڑتی۔

"یہ ابھی بہت چھوٹی ہے، اس پہ اتنی سختیاں مت کرو۔"

"بڑوں سے تو بہتر ہے میری بیٹی، کم سے کم میری بات سن لیتی ہے، مان لیتی ہے۔" ریاست علی اب کبھی کبھار طنز کرنے لگا تھا۔

"تم بہت بدل گئے ہو۔" سارہ نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

حالانکہ ریاست علی اب نہیں بدلا تھا، وہ تو شروع سے ہی ایسا تھا۔ ہاں بس کچھ عرصے کے لیے اس نے خود پہ مصنوعی نقاب سا لگایا ہوا تھا۔ اوپری ملمع کاری اب اترتی جا رہی تھی۔ مگر سارہ کی آنکھوں پہ اب بھی

الفت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بس تھوڑی سی سرخ ہوگئی تھی، ادھ کھلی آنکھ سے ایسا کچھ نظر آجاتا جو اسے ناگوار گزرتا تو اظہار کر دیتی۔ کبھی اپنے بھولے بسرے خوابوں کو دل میں رقصاں دیکھتی تو ریاست کی کوئی خرابی، خرابی نہ لگتی، اس میں کوئی برائی نظر نہ آتی، وہ اچھا لگنے لگتا اور کبھی یہ خواب سر پھوڑائے اداس ہوتے تو خود بھی دل گرفتہ ہو جاتی، عجب ایک آنکھ مچولی تھی جس میں شب و روز گزر رہے تھے۔

☆☆☆

ماریہ کی دسویں سالگرہ تھی، وہ ربن، غبارے، دیگر آرائشی اشیاء آس پاس پھیلائے سٹنگ روم سجانے میں مگن تھے جہاں کیک کٹنا تھا۔ ریاست پہلی برتھ ڈے لکھے غبارے پھلا پھلا کر ایک طرف رکھ رہا تھا، ماریہ چمکیلے ربن سے پھول بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ممی بھی ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں، ماریہ کو کتنا چاہتی تھیں، اتنا کہ اپنی آدھی جمع پونجی نواسی کے نام کر گئی تھیں۔'' کافی نے کراندر آتی سارہ کو ہر خوشی اور غم کے موقع پر ممی کی یاد ضرور آتی تھی۔

''کام کرنے والے مزدور کے لیے کافی۔'' اس نے کافی کا مگ ریاست کی طرف بڑھایا۔

''اور میری بیٹی بھی تو محنت کر رہی ہے اس کے لیے؟'' ریاست نے گرم گرم خوشبودار مہک اڑاتی کافی کا مگ ہاتھوں میں تھام لیا اور اسے میز پہ رکھا۔

''میری نہیں ہماری۔'' سارہ نے تصحیح کرتے ہوئے چاکلیٹ والا ہاتھ بلند کیا۔ ''ہماری بیٹی کے لیے چاکلیٹ، اس نے اعلان کیا۔ عین اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی اور اگلے ہی لمحے وہ غبارہ زوردار آواز کے ساتھ پھٹا جو ریاست پھلا رہا تھا۔ تینوں کی بیک وقت بہت زور سے ہنسی نکلی تھی، سب سے زیادہ ماریہ تھی جو ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

''تم اگلا غبارہ پھاڑو، میں دیکھتی ہوں، کون ہے، ماریہ کی سہیلیاں تو وقت سے پہلے نہیں آ گئیں؟ کیا وقت دیا تھا تم نے انہیں؟'' سارہ بیک وقت ہنستے اور بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولا اور ٹھٹک گئی۔

یقیناً کوئی ایشیائی ہی تھا، ریاست کی طرح سانولا سلونا، لمبا دبلا پتلا سا نوجوان، چہرے پہ کچھ گھبراہٹ اور کچھ تھکن۔

''ریاست احمد یہیں رہتے ہیں؟'' دھیمے لہجے میں اس کی انگریزی بڑی شستہ تھی۔ اس نے جیب سے ایک تصویر بھی نکال کر سارہ کے سامنے کی۔

''اوہ یقیناً، ریاست یہیں رہتا ہے اور آپ؟''

اسٹیلا کا جواب سن کر نووارد کے چہرے کی گھبراہٹ اور تھکن یکدم ہی غائب ہوگئی، وہ مسکرا دیا۔

''دو گھنٹے سے ریاست بھائی کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں، سارے گھر ایک جیسے لگتے ہیں۔ بائی دا وے میرا نام منصور ہے وہ میرے کزن بھی ہیں اور بہنوئی بھی، کیا وہ موجود ہیں؟ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔''

وہ خاموش ہو کر منظر نگاہوں سے سارہ کو دیکھ رہا تھا جسے وہ ریاست کی لینڈ لیڈی سمجھا تھا اور سارہ اس کے فقرے پہ اٹک گئی تھی۔

''کون ہو تم اس کے؟ کزن اور؟''

''میری بہن کے شوہر ہیں وہ۔'' منصور نے وضاحت کے ساتھ بتایا۔

''کب ہوئی شادی؟'' سارہ یکدم ہی بہت تیز آندھی کی زد میں آئی تھی۔

''برطانیہ آنے سے پہلے ہوئی تھی، ایک بیٹا چھوڑ کر آئے تھے، اب ماشاءاللہ چار بچے ہیں۔''

منصور نے تو سنا تھا کہ برٹش بہت روکھے اور سرد مزاج ہوتے ہیں۔ بلا ضرورت اور بلاوجہ بات کرتے ہیں نہ سوال، مگر اس لینڈ لیڈی کا مہربان لہجہ اور نرم رویہ اسے فرفر بولنے پر اکسا رہا تھا۔ وہ کندھے پہ پڑا اپنا بیگ سیدھا کرنے لگا تھا اس نے سارہ کا دھواں دھواں چہرہ دیکھا ہی نہیں، ہاں ریاست کی آواز ضرور سنی۔

''کیا بات ہے، ہنی، کون ہے دروازے پہ؟''

وہ خود اٹھ کر اندر سے یہاں آ رہا تھا۔

''تمہارا کزن اور ..... سالا۔'' سارہ سامنے سے ہٹ گئی، ریاست اور منصور کے مقابل، کوئی آڑ نہیں رہی، دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

حیران پریشان منصور، جو ریاست کے بے تکلف انداز تخاطب پہ گڑبڑایا ہوا سا تھا۔ ریاست احمد کے سر پہ تو آسمان ٹوٹ پڑا منصور کو یوں اچانک اپنے گھر میں دیکھ کر، گنگ کھڑا، آنکھیں پھاڑے وہ منصور کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی بھوت کھڑا ہو۔

''ڈیڈ! یہ دیکھیں، میں نے پھول بنا لیا، خوب صورت ہے نا؟'' ماریہ اندر سے دوڑتی ہوئی آ کر ریاست کے پاس کھڑی ہوئی، ربن سے بنایا ہوا پھول اس نے باپ کی طرف بڑھایا۔

''اندر آؤ ماریہ!'' سارہ، ماریہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔

''یہ سب کیا ہے ریاست بھائی؟'' ریاست احمد کے حلق سے تو کوئی آواز نکلی نہیں، ناچار منصور کو ہی پہل کرنی پڑی، جو ریاست کی شادی کے وقت بمشکل نو، دس سال کا تھا۔ ذہن اور نصیب دونوں تیز تھے، اسکالر شپ ملی تو لندن پڑھنے آ گیا۔ بہن نے کچھ سوغاتیں شوہر کے لیے دی تھیں اور اپنی اور بچوں کی تازہ ترین تصاویر بھی۔ سرپرائز دینے کے چکر میں لندن سے برمنگھم ایک طویل سفر کر کے آیا اور ریاست کا گھر بھی ڈھونڈ لیا اور اب یہاں بھونچکا کھڑا تھا۔

''ادھر آؤ، میں سمجھاتا ہوں۔'' منصور کو لے کر وہ باہر آ گیا۔

فش اینڈ چپس کا آرڈر دے کر ریاست نے جو کہانی اسے سنائی۔ اس کا لب لباب یہی تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ایک مجبوری تھی۔ یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے زندگی میں سہولتیں اور آسانیاں حاصل کرنے کے لیے پیپر میرج ضروری ہے۔

''مگر اس کاغذی شادی میں ایک جیتی جاگتی بچی کیسے آ گئی؟'' وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا، نہ کوئی وضاحت کر سکا۔

''منصور! خدا کے واسطے پاکستان میں کسی سے کچھ نہ کہنا۔'' ریاست حد درجہ بوکھلایا ہوا تھا، ایک بے بس نظر اس نے ٹھنڈے ہوتے فش اینڈ چپس پر ڈالی جنہیں منصور نے چھوا تک نہ تھا۔

''کسی کون ریاست بھائی؟ وہ میری آپا ہیں۔'' منصور تو بلبلا اٹھا۔

☆☆☆

غباروں، ربن کے پھولوں اور چمک دار آرائشی چیزوں سے سٹنگ روم سجا ہوا تھا۔ کیک پہ لگی موم بتی سارہ نے جلائی، ماریہ نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی۔ اس کے دوستوں نے سارہ اور ریاست نے تالیاں بجا کر ہیپی برتھ ڈے کا گیت گایا۔''

کیک اور ڈنر کھا کر سارے مہمان رخصت ہو گئے، ماریہ نے سب کے دیے ہوئے تحائف کھولے، باپ کی دی ہوئی ڈول اور ڈول ہاؤس پر وہ فوراً فریفتہ ہو گئی۔ ماں نے پزل گیم دیا تھا وہ بھی ماریہ کو بہت اچھا لگا۔ گڑیا کو پہلو میں لٹائے وہ سو گئی تب سارہ ریاست سے مخاطب ہوئی۔

''اپنا سامان نکال کر رکھ لو، کل اس گھر میں یا گھر کے آس پاس کہیں نظر نہ آؤ۔''

اتنی سفاکی اور اجنبیت اس کی آنکھوں میں، چہرے پہ، لفظوں میں اور لہجے میں تھی کہ ریاست کی ساری چرب زبانی اور خود اعتمادی مٹی بن کر بہنے لگی۔

''میری ساری دنیا، کل کائنات تو تم دونوں ہو۔'' بڑی مشکل سے اس نے بولنے کی ہمت کی۔

''ہم تمہارے کچھ نہیں ہیں ریاست! نہ تمہاری دنیا نہ کائنات، ہم دونوں علامت ہیں بے وقوفی کی، اس اندھے اعتبار کی، جو مجھ سے سرزد ہوئے، میں اب مزید احمقوں کی جنت میں نہیں رہ سکتی۔''

حالانکہ اس نے تہیہ کیا تھا اس سے بالکل بھی بات نہ کرنے کا، سوائے گھر سے نکلنے کا حکم دینے کے اور اس نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ اتنے بڑے دھوکے باز اور عیار شخص کی طرف دیکھے گی بھی نہیں، پھر بھی زخمی لہجے میں وہ بولتی چلی گئی، اس عیار اور مکار انسان کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، جن سے اسے محبت ہوئی تھی۔

''تمہیں اپنی ضرورتیں پوری کرنی تھیں، تم سچ کہہ دیتے مجھ سے، ہوسکتا ہے میں یوں بھی رہ لیتی تمہارے ساتھ، پھر میں خواب نہیں دیکھتی، نہ خوابوں کی ساتھ اپنے گھر اور زندگی کو سجاتی، تم نے دنیا کا سب سے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر۔''

سارہ کے آنسو اندر ہی اندر گر رہے تھے، اس کے دل میں، خون میں شامل ہو رہے تھے۔ رگ رگ میں پیوست ہو رہے تھے، بڑی بہادری سے اس نے ان آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا ہوا تھا۔ ورنہ وہ کمزور پڑ جاتی اس شخص کے آگے، جو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے معافی مانگ رہا تھا۔ رو رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا، وہ سارہ سے سوال کر رہا تھا کہ وہ اتنی سنگ دل کیسے ہوسکتی ہے؟

''تم محبت کرتی ہو مجھ سے۔'' ریاست اپنی محبت کا نہیں بلکہ سارہ کو خود اسی کی محبت کا واسطہ دے رہا تھا۔

''مگر تم نے تو کبھی نہیں کی؟'' سارہ کی زخم زخم مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ٹھہر گئی۔

''میں نے تم سے ہمیشہ محبت کی ہے سارہ! میں سچ بولنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں تم مجھے چھوڑ نہ دو، میری محبت تھی جو سچ کہنے سے ڈرتی رہی۔'' ریاست مٹی بن کر بہہ جانے والے گھروندے کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔

''دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے، میں اور تم، ہماری بیٹی، ہمارا گھر، ہماری محبت۔'' ریاست جلدی جلدی شکستہ ملبے کو سمیٹنے کے جتن کر رہا تھا۔

''اور ایک بیوی اور چار بچے، وہ کیا ہیں؟ وہم، خواب یا خیال؟'' سارہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کھڑی ہوگئی۔

''تم ایسا نہیں کرسکتیں تم میری بیوی ہو، ماریہ میری بیٹی ہے۔'' وہ اک دم ہی حلق کے بل چلایا۔

''آہستہ بولو، ماریہ سو رہی ہے اٹھ جائے گی اور تمہارے پاس کل دوپہر تک کا وقت ہے ورنہ مجھے مجبوراً پولیس کی مدد لینی پڑے گی۔''

☆☆☆

بھاگا بھاگا وہ اعظم بھائی کے پاس آیا تھا۔ ان کے علاوہ اور کہاں جاتا، ایک وہی خیر خواہ اور دوست تھے اس کے۔

''بیک وقت دو کشتیوں میں سواری کا انجام اور کیا ہوگا ریاست؟'' انہوں نے ترحم سے اسے دیکھتے ہوئے بتایا کہ اس کی شادی اور بچی کی خبر پاکستان پہنچ چکی ہے۔ منصور ایک جذباتی اور جوشیلا نوجوان تھا، اس سے رازداری کی توقع کیونکر رکھتا جبکہ معاملہ اس کی بڑی بہن کا تھا۔

''رافعہ کا فون آیا تھا میرے پاس، مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہ سچ ہے یا نہیں؟'' اعظم بھائی نے اس کی بیوی کے حوالے سے مزید کہا۔

''اور شاید وہ بھی خود کو تسلی دے رہی تھی ورنہ اس کا سگا بھائی اس سے جھوٹ کیوں بولے گا، پھر بھی وہ مجھ سے تصدیق کر رہی تھی، میں جھوٹ بول کر کیا کرتا؟

''اف!'' وہ کراہ کر رہ گیا، اپنے بال نوچنے کو دل کر رہا تھا۔ حالات اس نہج پہ پہنچ جائیں گے، سوچا نہیں تھا اور آگے کا وہ سوچتا ہی کب تھا۔ حال میں جینے والا، مستقبل کے بارے میں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالنے والا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا مگر اب جو ہو رہا تھا وہ ریاست سے دیکھا جا رہا تھا نہ سہا جا رہا تھا۔

''شکر کرو اس نے تمہارا خیال کر کے صرف گھر بدر ہی کیا ہے، پولیس کی صرف دھمکی دی، حوالے نہیں کیا، ورنہ وہ یہ بھی کرسکتی تھی۔''

''اعظم بھائی! میری بچی اس کے پاس ہے، وہ کیا تربیت پائے گی اس ماحول میں؟'' ریاست بلبلا اٹھا، ایک جمی جمائی گرہستی اور ہنستے بستے گھر کا شیرازہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا وہ دکھ اپنی جگہ مگر سب سے زیادہ اسے بیٹی کی فکر تھی۔

''یہ سب تو پہلے سوچنا چاہیے تھا نا؟'' اعظم بھائی نے طنز نہیں کیا تھا۔ حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔

''جھوٹ اور جھوٹے معاملات بھلا کب تک چھپ سکتے ہیں؟ کبھی نہ کبھی تو حقیقت کھلتی ہے اب اگر انسان ریت میں سر چھپالے یا آنکھیں بند کرلے تو آنے والا خطرہ یا خدشہ ٹل تو نہیں جاتا۔''

''اب کیا کروں؟'' دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے، شکستہ حال، ٹوٹا پھوٹا ریاست احمد ان کے سامنے بیٹھا سوال کررہا تھا۔

''اب تمہارے کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا، قدرت خود ہی فیصلہ کرلے گی، خاموش رہو اور کچھ عرصے کے لیے خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دو۔'' اعظم بھائی نے وہی مشورہ دیا جو ان کی سمجھ میں آیا مگر قدرت اپنا فیصلہ پہلے ہی کرچکی تھی۔

اگلے روز جب ریاست ان کے گھر سے نکل کر سڑک پر آیا تو قدرت کا وہ فیصلہ اس پر نافذ ہوگیا۔ شاید وہ ہی الجھنوں میں زیادہ گھرا ہوا تھا کہ انتہائی تیز رفتار گاڑی کو نہ دیکھ سکا، ایکسیڈنٹ بہت خوفناک تھا۔ سارے زخم بھرنے کے بعد بھی ریڑھ کی ہڈی میں کچھ ایسی پیچیدگی ہوگئی کہ وہیل چیئر کے سوا کوئی سہارا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ریاست کے بے حد اصرار پر اعظم بھائی سارہ کے گھر گئے مگر وہ نہیں ملی گھر بیچ کر کہیں اور جاچکی تھی، کہاں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔

اب ایک ہی راستہ تھا۔ اعظم بھائی اسے اپنے ساتھ لے کر پاکستان آگئے۔ رافعہ کا صدمہ، غم و غصہ، دکھ بے اعتباری سارے گلیشئر پگھل کر پانی بننے لگے اور سارے پہاڑ مٹی کا ڈھیر بن گئے جب اس نے بیمار، کمزور اور شکست خوردہ ریاست علی کو وہیل چیئر پہ دیکھا۔ اس کا شوہر اس کے چار بچوں کا باپ۔

''انسان خطا کا پتلا ہے، غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، گناہ بنی آدم سے ہی سرزد ہوتے ہیں فرشتوں سے نہیں۔'' رافعہ نے نرم دلی سے سوچا اسے شوہر پہ ترس آیا، رحم آیا اور ایک اچھی، روایتی مشرقی بیوی کی طرح اس نے ریاست علی کی غلطی یا جرم یا گناہ، جو بھی تھا اسے معاف کردیا۔

☆☆☆

بکھری ہوئی چیزیں ٹھکانے لگا کر اس نے فریج کھولا، سینڈوچ بنے رکھے تھے، ماریہ نے انہیں گرم کیا، کافی بنائی، دونوں چیزیں لے کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اور بے دلی سے سینڈوچ کا کونا کترنے لگی۔ پھر ایک نظر سامنے صوفے پہ بیٹھی سارہ کو دیکھا جو معمول کے مطابق بے تحاشا اسموکنگ کرکے ایش ٹرے لبالب بھر چکی تھی اور بدستور اپنے آس پاس دھواں پھیلائے اسی شغل میں منہمک تھی۔

''ممی.....!''

''ہوں۔''

''ڈاکٹر نے اسموکنگ کم کرنے کو کہا ہے۔'' ماریہ نے اسے یاد ہی نہیں دلایا بلکہ تنبیہ کی تھی۔

''جانتی ہوں۔''

''مانتی کیوں نہیں ہو؟'' ماریہ بری طرح عاجز آگئی تھی، سینڈوچ کا کونا کترنے کا شغل بھی روک دیا۔ گرم کافی کا گھونٹ بھرا، زبان، حلق اور سینہ جلاتا ہوا گھونٹ نیچے اترا۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو، نصیحتیں مت کرو مجھے۔'' ایک زمانہ ہوا سارہ، سارے زمانے سے بے زار تھی کبھی اپنی بیٹی سے بھی ہوجاتی۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اسی طرح اسموکنگ کرتی رہیں تو کینسر ہوجائے گا۔''

''تو؟''

''تو؟ تو یہ کہ اگر اس شخص سے اتنی ہی محبت تھی تو روک لیتیں، اسے کیوں جانے دیا، کیوں نکال پھینکا اپنے گھر اور زندگی سے؟''

ماریہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا تو وہ اسی طرح پھٹ پڑتی تھی۔ بچی نہیں رہی تھی، پچھلے چھ برسوں سے ماں کو بکھرتے، سلگتے اور جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ آس پاس انسانوں کی کمی نہ تھی مگر اس نے راہ فرار جو چنی وہ سگریٹ نوشی تھی، بے تحاشا دھوئیں میں خود کو چھپا کر وہ شاید اپنے غموں کو بھی چھپا لیتی تھی مگر اب ڈاکٹر نے خبردار کردیا تھا اور سارہ کے نزدیک یہ ایک معمولی سی خبر تھی۔

''تم کیوں اتنی ہائپر ہو جاتی ہو؟'' سارہ نے بے حد سکون سے کش لگاتے ہوئے بیٹی کو دیکھا تھا مگر اس کی انگلیوں کا اضطراب ماریہ سے پوشیدہ نہ تھا۔

''تباہ کرلیا ہے تم نے خود کو، اب تو سنبھالو اپنے آپ کو، مجھے دکھ ہوتا ہے تمہاری حالت دیکھ کر۔'' ماریہ نے کلستے ہوئے کافی کا دوسرا گھونٹ بھرا، اب یہ قدرے گوارا تھا۔

''دکھ تو مجھے بھی بہت ہوا تھا، جب یہ علم ہوا کہ محبت صرف میں نے کی تھی اس نے نہیں۔'' سارہ نے ختم ہوتا سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں مسلا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ اس معاملے میں تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔ دھیرے دھیرے یہ عادت بلکہ لت ختم ہوسکتی ہے تمہاری۔'' ماریہ نے امید بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

''شٹ اپ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ڈاکٹر سے یا اس کے مشوروں سے۔'' سارہ نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

''مجھے تمہاری ضرورت ہے ممی! مجھے محبت ہے تم سے۔'' ماریہ کرلائی۔

آئے دن کی بحث بغیر کسی نتیجے کے لاحاصل رہتی تھی مگر پھر بھی وہ باز نہیں آئی تھی۔

''تم اب بڑی ہوگئی ہو ماریہ! اپنا خیال خود رکھ سکتی ہو، اب میرے پروں میں چھپنا چھوڑ دو۔'' اس بار سارہ کا لہجہ نسبتاً ملائمت لیے ہوئے تھا۔

''اف!'' کافی کے بقایا گھونٹ پی کر اس نے مگ خالی کیا۔ اور کھڑی ہوگئی۔ ذرا سا کونا کترا ہوا سینڈوچ اس نے اپنے بیگ میں رکھا۔ ابھی وہ ہائی اسکول میں تھی مگر ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں پارٹ ٹائم جاب کرنے لگی تھی۔ ایک دو گھنٹے بعد جب اسے بھوک لگتی تو یہ سینڈوچ اس کے کام آتا۔

''زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو ممی!'' اس نے بیگ کاندھے پہ ٹانگا۔

''ختم ہوتی چیز کو کیا نئے سرے سے شروع کرے کوئی؟'' سارہ نے خالی خالی نظروں سے بیٹی کو جاتے ہوئے دیکھا، دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اس کا دل مر گیا تھا۔

اسی دن، اسی وقت جب منصور ان کے گھر آیا تھا اور بعد میں جیسے جیسے وہ سوچتی رہی، اسے خود پہ ترس آتا رہا، کتنی آسانی سے ریاست علی نے اپنے مطالب اور اپنی ضرورتیں پوری کی تھیں، وہ محبت کے نام پر بے وقوف بنتی رہی۔

اسے کتنا شوق تھا کہ اس کے کم از کم تین چار بچے تو ہوں، اکلوتے پن کی تنہائی وہ خود جھیل چکی تھی اس کی خواہش تھی کہ اس کا بچہ اس تنہائی کا شکار نہ ہو۔ مگر ریاست ہمیشہ اسے بہلاتا رہا کہ تھوڑا اور مالی استحکام آجائے تو وہ فیملی ضرور بڑھائیں گے اور ادھر پاکستان میں وہ اپنی فیملی میں اضافہ کرتا رہا۔ ہر ڈیڑھ دو سال بعد وہ پاکستان جاتا تھا۔

سارہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی رہی۔ محبت کی ناقدری اور جذبات کی پامالی کا دکھ کوئی چھوٹا دکھ نہیں ہوتا دیمک ہوتی ہے جو پورے وجود کو کھا جاتی ہے۔ گھن ہوتا ہے جو مضبوط سے مضبوط ساخت کو بھی مٹی بنا دیتا ہے وہ بھی رفتہ رفتہ مٹی کا ڈھیر بنتی جارہی تھی۔

☆☆☆

سڑک پہ بکھرے پتے زرد اور سوکھے ہوئے تھے، پھر بھی اس کے جوتوں تلے دب کر احتجاج کررہے تھے۔ چرچر کی صدائیں بلند کررہے تھے۔ حالانکہ درخت سے گرنے اور شاخوں سے جدا ہونے کے بعد بھلا کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کہیں بھی اڑتے پھریں یا قدموں تلے آکر چرمر ہو جائیں، پھر بھی وہ اپنا ننھا منا سا احتجاج ضرور کرتے ہیں۔ قدموں تلے روندے جانا کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا، پتوں کو بھی نہیں۔

اپنے جوتوں تلے چرچر کی آوازوں سے بے خبر اور بے نیاز سر جھکائے اپنے رستے پر بلکہ ایک نئے رستے پر رواں تھی جب کسی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف گھسیٹا، وہ موٹر سائیکل جو اسے روند

سکتی تھی بہت تیزی سے اس کے برابر سے گزری تھی، ماریہ نے اس موٹر سائیکل کی تیز آواز اب سنی تھی پھر ایک اجنبی آواز۔

''تمہیں اتنی بڑی بائیک دکھائی نہیں دی، نہ اس کی آواز سنائی دی اندھی ہو، بہری ہو یا نشے میں ہو؟'' درشت لہجے میں وہ پوچھ رہا تھا۔

ماریہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، جھٹکے سے کھینچے جانے پر اس کی جیکٹ کا ہڈ سر سے پلٹ کر پیچھے جا گرا تھا۔ اس کا بازو ابھی تک مضبوط گرفت میں تھا۔ حالانکہ آج خلاف معمول آسمان صاف تھا مگر آنکھوں میں دھند کی وجہ سے اسے بائیک دکھائی نہیں دی اور اندر اتنا شور مچا ہوا تھا کہ باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

''رو کیوں رہی ہو؟'' سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والے اس خوش شکل نوجوان نے ٹھٹھک کر اس کا بازو چھوڑا۔

''کچھ نہیں۔'' ماریہ نے اپنی آنسو بھری آنکھیں اور چہرہ ہتھیلیوں سے رگڑا۔

''مطلب؟ کوئی وجہ نہیں رونے کی؟ شوق ہے تمہیں آنسو بہانے کا؟'' سیاہ آنکھوں میں تمسخر ابھرا، ماریہ تڑخ گئی، پھر تلخ ہوئی۔

''میری ماں مر گئی ہے، کیا یہ وجہ کافی ہوگی رونے کے لیے؟''

وہ سیاہ آنکھیں چند لمحوں تک ماریہ کو دیکھتی رہیں، اس کا رویا ہوا دل آویز چہرہ، الٹی سیدھی کھینچ کر باندھی گئی پونی سے باہر نکلتی لٹیں جو کانوں اور گالوں کے آس پاس جھول رہی تھیں۔ اس کی مخروطی انگلیوں والے خوب صورت ہاتھ جو اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کر کے اب پہلو میں گر گئے تھے۔ وہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس تھی۔

''کیا واقعی؟ یہ سچ ہے جو تم نے ابھی ابھی کہا؟''

''کیا ایسی بات کوئی مذاق یا جھوٹ میں بولتا ہے؟''

''اچھا، ٹھیک ہے، تم ادھر آرام سے بیٹھو، پھر بات کرتے ہیں۔'' نوجوان نے دوبارہ اس کا بازو تھاما مگر اتنی احتیاط سے جیسے کوئی کانچ کی بنی نازک سی شے، ماریہ کو قریبی ایک بنچ پر بٹھا کر وہ خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

''اب بتاؤ شروع سے آخر تک پوری بات؟''

''میری ماں مر گئی ہے۔ بس یہی ہے شروع سے آخر تک پوری بات؟'' ماریہ کے گلے میں پھر کچھ اٹک رہا تھا اس نے بڑی مشکل سے خود پہ قابو پایا۔

''کسی کے جانے سے زندگی ختم نہیں ہوتی، تمہارے لیے پوری دنیا موجود ہے، ساری خوشیاں، مسکراہٹیں سب ہیں، ان میں سے اپنا حصہ سمیٹو اور ان آنسوؤں کو ایک طرف کر دو۔'' وہ لڑکا اچانک ہی بہت معتبر اور بردبار سا بن گیا۔

''آنسو ایک طرف کرنا آسان نہیں ہوتا۔'' ماریہ نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے جتایا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ابھی تک، ایک ہفتہ گزرنے پر بھی اسے اس طرح تسلی نہیں دی تھی کسی نے بھی۔

''اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا۔'' لڑکے نے اس کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے سر ہلایا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''ویسے میرا نام کبیر ہے اور تم؟''

''میں ماریہ ہوں۔'' ماریہ نے خود کو کہتے سنا۔

ایک انسان اکیلا ہوتا تو کچھ نہیں ہوتا، جب دو ہو جاتے ہیں تو کہانی بن جاتی ہے یا بننا شروع ہو جاتی ہے تو کبیر اور ماریہ کی کہانی کی بنت شروع ہو گئی تھی۔

کبیر کا یونیورسٹی میں آخری سال تھا۔ ماریہ ابھی کالج میں تھی۔ پھر بھی ہر دوسرے تیسرے دن ملنا اتنا مشکل نہ تھا۔ ماریہ اس کی طرف یوں کھنچی چلی آئی جیسے کبیر کوئی مقناطیس ہو اور وہ یعنی ماریہ جیتی جاگتی انسان کے بجائے کوئی لوہے کا ٹکڑا۔ دونوں زیادہ تر وہیں بیٹھتے تھے جہاں پہلی بار ملے تھے۔ کبیر بولتا رہتا وہ اسے سنتی رہتی جیسے کوئی مقدس صحیفہ۔

کبھی وہ گٹار پر دھنیں بجا کر اسے سناتا، اسے گٹار بجانے کا شوق تھا، یونہی شوق ہی شوق میں تھوڑا

بہت سیکھ بھی گیا تھا۔ تو جب وہ مختلف میٹھی اور رسیلی دھنیں بجاتا تو ماریہ اس کی آرٹسٹک لمبی لمبی انگلیوں کو گٹار کے تاروں پہ مچلتا دیکھتی اور انتہائی انہماک سے ساتھ ان تاروں سے نکلنے والی موسیقی سنتی، جن میں اس کی دھڑکنوں کی تال بھی شامل ہو جاتی۔

ماریہ کا دل بدلنے لگا تھا۔ روز و شب، خیالات معمولات اور زندگی بھی بدلنے لگے، اب وہ گھر پر اتنی تنہا اور اکیلی نہیں ہوتی تھی جتنا کہ پہلے خود کو محسوس کرتی تھی، اب کبیر کا خیال، اس کا احساس ماریہ کے ہم قدم رہنے لگا تھا۔ تنہائی کو ہمیشہ رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے چاہے وہ رفاقت اصلی ہو یا خیالی۔ ماریہ اکیلی ہوتی تو کبیر اس کے خیالوں میں ہمراہ ہوتا ملاقات ہوتی تو اس کی ہمراہی میں خواب دیکھتی رہتی۔

دس سال کی عمر تک ماریہ نے ماں اور باپ دونوں سے بھرپور محبت اور مکمل توجہ حاصل کی تھی۔ ریاست علی کے چلے جانے کے بعد وہ باپ کی توجہ اور محبت سے محروم ہوئی اور سارہ اپنی بیٹی سے محبت کرنے کے باوجود بھی اس کا اظہار پہلے کی طرح نہ کر سکی، اپنے غموں میں ڈوب کر وہ خود سے بھی بیگانی ہو گئی تھی، ماریہ کا کیا خیال کرتی۔ ماریہ اس کی توجہ اور اس کے پیار کو ترس گئی تھی۔ وہ خود غرض تھی نہ ہی لاپروا، ماں کی بے اعتنائی کے باوجود اسے اپنی ماں سے محبت تھی۔ وہ اپنی بساط سارہ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر ایک تشنگی تھی اس کے اندر جو وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔

سارہ بھی شاید مجبور تھی اس نے جان بوجھ کر ماریہ کو نظر انداز نہیں کیا تھا مگر جو بھی تھا، ماریہ ایک محرومی کے ساتھ پروان چڑھی تھی، وہ تشنگی اور محرومی اب مداوا چاہتی تھی جو اسے کبیر کی صورت میں نظر آیا، اس کا بات کرنے کا انداز، خیال رکھنے کا طریقہ، اس کا رویہ، برتاؤ سب اسم الفت کے حروف بن بن کر اس جذبے کو مکمل کر رہے تھے۔

گیلی گھاس کی خوشبو نم آلود ہوا میں سرسرا رہی تھی۔ برف پگھلی تو خزاں کے سارے قفل بھی پگھل کر پھولوں کے کھلنے کی راہ ہموار کر گئے تھے، پارک کے قطعات ٹیولپس کے دہکتے پھولوں سے بھرے ہوئے تھے، ناشپاتی کے پیڑ کے سفید شگوفے اجلی چاندنی کی طرح دمک رہی تھے۔

ماریہ کا دل بھی ایسے ہی دہکتے، مہکتے کھلتے ہوئے پھولوں، کلیوں اور شگوفوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی پیاری دھوپ تھی جو چار طرف پھیلی تھی۔ ایسی دھوپ یہاں روز روز نہیں نکلتی تھی۔ گو کہ ہوا سرد تھی مگر سورج کی کرنیں اس ہوا سے بھرپور مقابلہ کر رہی تھیں۔ ایسے خوب صورت پھولوں کے دلکش منظر کا حصہ بنے اور اتنی پیاری دھوپ اور نیلی نیلی ہوا میں بیٹھے ہوئے ماریہ نے کبیر کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہارے گھر میں کون کون ہے؟''

''ممی، پاپا ایک چھوٹا بھائی اور میں خود۔''

''جاب ملنے کے بعد کیا کرو گے؟'' پرندوں کی چہچہاہٹ کے درمیان اگلا سوال ہوا۔

''اسے سیلی بریٹ کروں گا۔''

''پھر؟''

''پھر؟'' کبیر نے ایک گہری سانس لے کر ایسی ہی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''پھر ایک پیاری سی اور تھوڑی بے وقوف سی لڑکی کو اپنے ممی پاپا سے ملواؤں گا۔''

ماریہ کے گال گلابی ہونے لگے تھے مگر اچانک ہی وہ چونکی۔

''کیا کہا تم نے؟ بے وقوف سی لڑکی؟ کیا میں بے وقوف ہوں؟'' اس نے منہ پھلانے کی تیاری کی۔

''مگر میں نے یہ کب کہا کہ وہ تم ہو؟ وہ تو بہت پیاری بھی ہے۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کہا تھا نا کہ تھوڑی بے وقوف ہے، تو وہ تم ہو۔'' کبیر نے اس کے گال تھپتھپائے۔ ''بالکل

آتش۔"

"کبیر!" ماریہ نے اپنے لمبے لمبے ناخن کی کلائی میں چبھوئے۔

"دیکھو، میرا ہرگز کوئی ارادہ نہیں کسی جنگلی بلی سے شادی کرنے کا۔" کبیر نے اسے منہ بنا کر تنبیہ کی مگر اس سخت تنبیہ کے پیچھے ایک زوردار قہقہہ چھلک رہا تھا جو بالآخر ابل ہی پڑا۔

"آج تک بہت لڑکیوں سے واسطہ پڑا مگر تم جیسی کوئی نہیں ملی۔"

"مجھ جیسی کیا؟ حسین؟ ذہین؟" ماریہ نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم جیسی مطلب بس تم ہی جیسی تھوڑی پاگل، تھوڑی ڈفر، تھوڑی....."

کبیر کا تھوڑا نامہ ادھورا ہی رہ گیا، جنگلی بلی کے ناخن بری طرح اسے نوچ کھسوٹ رہے تھے۔

"اب میں تم سے بالکل بھی بات نہیں کروں گی۔" بہت زیادہ ناراضی والا بڑا سا منہ پھلا کر ماریہ نے اعلان کیا۔

"کاش تم ہمیشہ اس عہد پہ قائم رہو، زندگی کتنی حسین ہو جائے گی۔" قہقہوں کی ایک سیریز تھی جس کا آغاز ہو چکا تھا، وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور مارے غصے اور بے بسی کے، ماریہ کے گلابی گال اور سرخ ہوتے جا رہے تھے جب وہ اچانک ہی اٹھ بیٹھا۔

"آئی لو یو ماریہ، آئی لو یو ویری مچ۔" اس کے ہاتھ تھامے کبیر یکا یک سنجیدہ ہو گیا، سرخی مائل گلابی گال فوراً ہی قندھاری انار بن گئے۔

☆☆☆

پوری رات یونہی گزر گئی، آنکھوں آنکھوں میں، کروٹیں بدلنے میں وہ آنکھیں بند کرتی یا کھولتی ایک پیارا سا بلکہ دنیا کا سب سے پیارا فقرہ اس کی سماعتوں کو اور خود اسے بھی گدگداتا رہتا اور کتنے دن اور کتنی راتیں اسی خمار میں گزریں اور پھر ایک رات اور اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی اور اگلی صبح سے لے کر شام تک اس نے اپنی پوری وارڈ روب بیڈ پہ پھیلا دی مگر اسے کوئی جوڑا پسند نہیں آیا تھا، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر درجنوں ہیئر اسٹائل بنا لیے مگر سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فائنل کیسے کرے، تیاری، تیاری اف صبح سے شام ہو گئی۔

جانے کا وقت قریب تھا مگر اس کی تیاری، وہی تو مکمل ہو رہی تھی نہ فائنل، جوڑا کیسا ہو، ہیئر اسٹائل، میک اپ کون سا انداز اختیار کرے جو دنیا کی سب سے پیاری، سب سے حسین لڑکی بن جائے اور وہ، اسے دیکھتے ہی پسند کر لیں جن سے ملنے جا رہی ہے، اس کی تمنا، بے تاب تمنا، صبر طلب عاشقی کو گھور رہی تھی، آخر ٹھہراؤ، سکون، اطمینان کہاں سے آئے؟ کیسے آئے؟ اور اسی ادھیڑ بن میں باقی بچا تھوڑا سا وقت بھی گزر گیا۔

کال بیل بجی، کسی روبوٹ کی طرح اس نے دروازہ کھولا اور کسی مجرم کی طرح کھڑی ہو گئی سر جھکا کر۔

"تیار ہو تم؟ چلیں؟" کبیر کی حیرت سے پھیلی نگاہوں نے پہلے اس کے کمرے کا پھیلاوا دیکھا پھر اسے دیکھا، پھر غور سے دیکھا۔

"تم تیار نہیں ہوئیں اب تک؟" وہ اتنی بلند آواز میں بولا تھا جو بس چیخنے کے ہی قریب تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیسے تیار ہوں۔" وہ منمنائی۔

"اوہ!" کبیر نے ہونٹ سکیڑے۔ "تم پہلے بتا دیتیں، میں ریسرچ کر لیتا کہ آج کل ہالی وڈ کے بڑے بڑے میک اپ آرٹسٹ اور ہیئر اسٹائلسٹ کون ہیں، ان میں کس سے اپائنٹمنٹ لے لیتے۔"

"کبیر۔"

"کیا کبیر؟ تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ میرے والدین وقت کے انتہائی پابند ہیں اور جو لوگ وقت کے پابند نہیں ہوتے انہیں سخت ناپسند کرتے ہیں، اب آگے تمہاری مرضی۔" وہ تو کندھے اچکا کر ایک طرف ہو گیا۔

''اچھا بس ایک منٹ رکو، میں پانچ منٹ میں آئی۔'' ماریہ کو خود نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، کیا کر رہی ہے، اس نے اب، اس بار آنکھیں بند کر کے کپڑوں پہ ہاتھ پھیرا جو ہینگر ہاتھ آیا اسے لیے وہاں سے بھاگ لی بھاگم بھاگ ہی کپڑے بدل کر وہ آئی تو کبیر گاڑی کی چابی ہاتھ میں گھما رہا تھا۔

''فاسٹ آجاؤ، میں گاڑی اسٹارٹ کر رہا ہوں۔''

جتنی دیر میں اس نے جوتے پہنے تین بار ہارن بج چکا تھا، کنگھا اور لپ اسٹک اور مسکارا شولڈر بیگ میں ڈالتے ہوئے اس نے بیگ کاندھے سے لٹکایا، گھر لاک کیا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو وہ پانچویں بار ہارن بجا رہا تھا۔

''اب بس کرو میرے زیادہ تر پڑوسی بڑے کھڑوس ہیں، بڈھے کھوسٹ بات بات پہ پولیس بلا لیتے ہیں۔'' ماریہ نے اسے ڈرایا۔

چلتی گاڑی میں لپ اسٹک لگانے کی زیادہ مشق تو نہیں تھی، پھر بھی لگا ہی لی، بار بار آئینہ دیکھنے پر مگر تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

''دیکھو کبیر، ٹھیک لگی ہے نا؟''

''میری ممی کو یہ کلرز زہر لگتا ہے۔''

''کیا واقعی؟''

''مگر پاپا جان دیتے ہیں اس رنگ پہ۔''

''پھر کیا کروں؟'' وہ کنفیوز ہو گئی۔

''رہنے دو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' کبیر نے ایک بے چاری سی سرد آہ بھری جو دراصل ماریہ کو بھرنی چاہیے تھی۔

اپنے سلکی بالوں میں وہ کنگھا پھیرتی رہی اور بس یہی کرتی رہی کیونکہ ان میں لگانے کے لیے کوئی چیز اس کے ہینڈ بیگ سے دستیاب نہ ہوئی، جو ویسے تو عمرو عیار کے زنبیل بنا رہتا تھا مگر آج بقول کبیر اس کے دماغ کی طرح خالی تھا۔ تو جب تک کبیر کا گھر آیا، وہ کنگھا کر کر کے بے زار ہو گئی تھی، سیدھی مانگ کر کے دونوں طرف سے بال کانوں کے پیچھے اڑس لیے اور اپنا دل پکا کرنے کی کوشش کی (یوں بھی میں اچھی لگتی ہوں) پرفیوم ایک بار پھر اسپرے کر کے نیچے اتر آئی۔''

کبیر اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آیا اور وہاں بٹھا دیا، وہ بیٹھ گئی۔ نروس ہوتی رہی اور انتظار کرتی رہی، کبیر غائب تھا اور اس کے والدین بھی، تقریباً بیس منٹ بعد وہ واپس آیا، منہ میں کچھ چباتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

''تمہارے والدین وقت کے بہت پابند ہیں؟'' ماریہ نے ایسی نگاہوں سے دیکھا جو بس کلاشنکوف کے برسٹ جیسی ہی ہوتی ہیں، قتل کر دینے والی جان سے مار دینے والی۔

''آ رہے ہیں، یہ لو، چل کرو۔'' اس نے جینز کی جیب سے مونگ پھلی کے دانے برآمد کر کے اس کی طرف بڑھائے۔

''نو تھینکس۔'' نروس ہو ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ مروڑ کر اس نے گلابی سے سرخ کر لی تھیں۔

''دراصل ممی تیار ہو رہی ہیں اور جب میری ممی تیار ہوتی ہیں نا تو وہ کیلنڈر کے صفحات بدل جاتے ہیں۔''

''اس کی باتوں میں نہ آنا لڑکی! اس نے تمہیں نہیں، ہمیں سرپرائز دیا ہے، اپنی ممی کو سوتے سے اٹھایا ہے۔ وہ ابھی آ رہی ہیں۔''

درمیانے قد و قامت کے دبلے پتلے سے کبیر کی طرح ہنس مکھ سے، وہ اچانک ہی اندر آ کر بولنا شروع ہو گئے، ماریہ کی نروس اور کمزور سی ہیلو کے جواب میں انہوں نے ہائے کہا اسے غور سے دیکھا پھر مسکرا دیے۔

''شانت رہو، ہم لوگ اتنے خوفناک نہیں ہیں جتنا اس لڑکے نے تمہیں بتایا ہوگا۔''

وہ بڑے نرم لہجے میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، کبیر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا مگر ماریہ اب پرسکون تھی۔ اس کی گھبراہٹ کم ہوتے ہوتے بس اب ختم ہی ہو چکی تھی۔ پھر ممی کی آمد بھی ہو

گئی، ماریہ نے کھڑے ہو کر انہیں ہیلو کہا اور ہاتھ ملانے کے لیے بڑھانے کو تھی مگر اس سے پہلے ہی انہوں نے ہاتھ جوڑ کر بڑی شائستگی سے نمستے کہا، ان کی آواز بڑی میٹھی اور سریلی تھی۔

ماریہ نے بیٹھتے ہوئے انہیں دیکھا، فیروزی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس جس کے کنارے پہ چمکیلی چوڑی سی پٹی تھی۔ ماریہ کو بعد میں علم ہوا کہ اسے بنارسی بارڈر کہا جاتا ہے۔ سانولی سلونی مگر وہ پرکشش نقوش کی مالک تھیں۔ ماتھے پہ سرخ رنگ کا گول ٹیکہ ہلکی پھلکی جیولری اور میک اپ۔

''میرا نام آنند کھنہ ہے اور یہ میری مسز پشپا کھنہ.....اور پشپا یہ ماریہ علی ہیں۔'' کبیر کے والد نے کھڑے ہو کر باضابطہ تعارف کی رسم ادا کی اور تینوں بیٹھ گئے۔ ہلکی پھلکی ادھر ادھر کی باتوں کے دوران سوالات کے ذریعے اس کا انٹرویو بھی جاری تھا۔

''تمہارے والد؟''

''وہ پاکستان میں رہتے ہیں ممی اور ان کی علیحدگی ہو گئی تھی۔''

''مسلم؟''

''جی۔''

دونوں میاں بیوی کی نگاہیں ایک لمحے کو آپس میں ملیں۔

''اور تم! تم بھی مسلم ہو؟'' پشپا کھنہ نے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔

''میں؟'' ماریہ نے حیران ہو کر انہیں دیکھا، وہ کنفیوز ہونے لگی تھی۔

''دیکھو بات یہ ہے کہ یہاں یعنی مغرب میں مذہب کے بارے میں سوال کرنا بدتہذیبی اور غیر شائستہ طرز عمل تصور کیا جاتا ہے اسے انسان کا نجی معاملہ قرار دیا جاتا ہے مگر ہمارے کلچر میں مذہب کے معاملے میں سوال کرنا اور جاننا ضروری، خصوصاً جب شادی وغیرہ کا معاملہ ہو اس لیے یہ سوال تم سے کیا ہے۔'' آنند صاحب نے بڑے سبھاؤ اور نرم لہجے میں وضاحت کی تھی۔

''دراصل اس موضوع پر ہماری کبھی بات نہیں ہوئی۔'' خاموشی سے ان کی گفتگو سنتے کبیر نے پہلی بار مداخلت کی تھی۔

ماریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ دس سال کی عمر تک وہ مسلمان تھی۔ ریاست علی نے اسے نماز سکھائی تھی، قرآن پڑھوایا تھا، کلمے اور دعائیں یاد کروائی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ سب چھوٹ گیا تھا اور اب پچھلے کئی برسوں سے، دیکھا جائے تو وہ کسی مذہب پر عمل نہیں کر رہی تھی وہ مسجد جاتی تھی نہ ہی چرچ، وہ کون تھی؟ کیا تھی؟ ان سوالوں کے جواب ماریہ کو نہیں آتے تھے۔

''اچھا یہ بتاؤ تم کبیر سے پہلی بار کب اور کہاں ملی تھیں؟'' پاپا نے مسکرا کر موضوع ہی بدل ڈالا اور ماریہ کو اس مشکل صورت حال سے باہر نکالا، مگر وہ تبدیلی وقتی تھی سوال اپنی جگہ باقی تھا۔

''وہ کون ہے؟ کس مذہب پہ عمل کرے گی؟'' پشپا کھنہ اس سوال کا جواب جانے بغیر اگلا قدم اٹھانے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ اگرچہ پڑھی لکھی ماڈرن عورت تھیں، پچھلے ستائیس برسوں سے مغرب میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھیں۔ بیٹے کی پسند اپنانے پر راضی تھیں مگر اندر سے کٹر مذہب پرست تھیں۔ انہوں نے بیٹے سے صاف کہہ دیا تھا۔

''دھرم اہم ہے کبیر، اس کے بغیر تم اپنی مرضی چلا سکتے ہو مگر میری خوشی شامل نہیں ہوگی اس میں۔''

''آپ فکر نہ کریں ممی! کوئی نہ کوئی راستہ میں نکال ہی لوں گا، اپنی مرضی کے ساتھ ساتھ مجھے آپ کی خوشی بھی عزیز ہے۔'' کبیر شتر بے مہار نہیں تھا۔ والدین سے محبت کرنے والا ان کی خوشیوں کا خیال کرنے والا ہونہار اور سعادت مند بیٹا بھی تھا۔ محبت اپنی جگہ مگر وہ صرف ماریہ کے ساتھ گھر بسانے کا خواہش مند نہیں تھا، اس کے ساتھ شادی کر کے اپنی فیملی کا حصہ بنانا چاہتا تھا، جس میں مرکزی اور اہم افراد اس کے والدین تھے۔

''میں بات کرلوں گا ماریہ سے۔'' ماں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اس نے وعدہ کیا تھا ان سے۔

''مشکل ہی ہے مسلمان اپنا مذہب نہیں بدلتے، کوئی ایک آدھ ہی ہوتا ہے جو.....'' پشپا نے اپنے شوہر کو مخاطب کر کے تبصرہ کیا تھا۔

☆☆☆

اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماریہ ان ''ایک آدھ'' میں شامل ہو جائے گی، جب کبیر نے اس کے سامنے یہ معاملہ رکھا تو اس نے نگاہ بھر کے کبیر کو دیکھا۔

''کبیر! کئی سال ہو گئے مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرا مذہب کیا ہے مگر مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ میری محبت کیا ہے، تم اپنے ساتھ جہاں لے جاؤ گے میں آنکھیں بند کر کے چلی جاؤں گی، چاہے وہ کوئی مسجد ہو، چرچ ہو یا مندر۔''

پشپا سمیت کسی کے اعتراض میں اب کوئی وزن نہ رہا تھا۔ اس نے کبیر کے والدین کے لائے ہوئے سرخ بنارسی ساڑی اور زیورات پہن کر آگ کی گرد سات پھیرے لے کر اپنی محبت کو ثابت بھی کر دیا تھا اور حاصل بھی کر لیا تھا۔

☆☆☆

ابکائیاں لے لے کر وہ بے حال ہو گئی تھی۔ کچھ کھایا تو تھا نہیں، مشکل سے دو چار گھونٹ جوس پیا تھا وہی باہر نکل آیا۔ بے دم سی واش بیسن پر جھکے جھکے اس نے نل کھولا تھا۔ پانی کی دھار گرتے ہی ایک مہربان ہاتھ نے اس کی کمر سہلائی۔

''تم ٹھیک ہو؟'' وہ بہت تشویش اور فکر مندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔'' ماریہ نے آئینے میں اس کا اور اپنا چہرہ ایک ساتھ دیکھا اور مسکرا دی۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔''

''بالکل بھی ٹھیک نہیں ہو، اتنی کمزور اور پیلی ہو رہی ہو، ٹھیک سے کھاتی پیتی نہیں ہو، اب میں تم پہ سختی کرنے والا ہوں۔'' کبیر نے اس کے شانے کے گرد بازو دراز کرتے ہوئے اعلان کیا۔

''اچھا!'' ماریہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ میرے دنیا میں آنے سے پہلے میرے باپ نے بھی اسی طرح میری ماں کی ناز برداریاں کی ہوں گی؟'' پتا نہیں کیا بات تھی آج کل ماریہ کو اپنے ماں اور باپ دونوں کا بہت خیال آ رہا تھا۔

''ہر محبت کرنے والا اسی طرح خیال رکھتا ہے۔'' کبیر کی انگلیوں نے اس کے بال سنوارے۔

''پھر محبت کرنے والے جدا کیوں ہو جاتے ہیں؟''

''تم کمرے میں چل کر ریسٹ کرو اور اچھی اچھی باتیں سوچو۔'' کبیر نے اس کا سوال یکسر نظر انداز کیا۔

''میں پہلے ہاتھ منہ دھولوں؟''

''ٹھیک ہے، میں یہیں کھڑا ہوں، تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔''

کبیر اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ سارہ اور ریاست علی کا تذکرہ کرنے لگی تھی اور کبیر سے اپنی بچپن کی اپنے والدین کی بہت سی یادیں اور باتیں شیئر کرنے لگی تھی اور انہی باتوں اور یادوں کے دوران وہ ٹینس بھی ہو جایا کرتی تھی۔

کبیر اسے ہر قسم کی ٹینشن سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت بھی یہی تھی کبیر اسے دیکھتے ہوئے کوئی دلچسپ قصہ سنا رہا تھا۔

ماریہ نے پہلے ہاتھ دھوئے پھر کلی کی پھر..... میکانکی انداز میں ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اس نے سب سے آخر میں پیر دھوئے تھے۔

''چلو۔'' تولیے سے ہاتھ اور منہ خشک کر کے اس نے کبیر کی جانب دیکھا جو بڑی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا تھا؟''

''کیا کیا میں نے؟'' ماریہ الجھ گئی۔

''تم نے جس طریقے سے اپنے ہاتھ منہ اور پیر

دھوئے ہیں ایسے مسلمان دھوتے ہیں اپنی عبادت سے پہلے اسے وضو کہتے ہیں۔"

اپنے ہمراہ لا کر اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کبیر نے بغیر کسی تاثر کے اسے بتایا، اس کے حلقہ احباب میں مختلف مذاہب اور کمیونٹیز کے افراد شامل تھے۔ وہ سب کی عبادات اور رسوم ورواج سے واقف تھا۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے؟" ماریہ بڑبڑائی، اس کے چہرے پہ پریشانی پھیل رہی تھی۔

"کچھ نہیں، تم ناسٹلجیا کا شکار ہو رہی ہو، جب سے پریگننٹ ہوئی ہو، اپنے ماضی، بچپن اور والدین کے بارے میں بہت سوچنے لگی ہو، اس وقت بھی شائد تم اپنے بچپن میں کہیں پہنچی ہوئی تھیں۔" کبیر نے درست تجزیہ کیا تھا۔

"کبیر، کہیں میں سائیکو۔" (نفسیاتی) تو نہیں ہو رہی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" یکا یک ہی ماریہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔

"ماریہ!" کبیر آگے جھکا۔

"ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ایسی حالت میں عورت بہت کچھ سوچتی ہے وہ ماضی بھی ہو سکتا ہے، حال بھی اور مستقبل بھی، بس جو بھی سوچو اچھا سوچو، اگر تم ماضی کے بارے میں سوچو تو خوشگوار یادیں، اچھی باتیں سوچو۔" کبیر اسے یوں سمجھا رہا تھا جیسے کسی بچے کو سمجھاتے ہیں۔

"کبیر میں پاکستان جانا چاہتی ہوں اپنے ڈیڈ سے ملنا چاہتی ہوں۔" ماریہ نے اس کے ہاتھ تھام کر بہت ملتجی لہجے میں کہا تھا۔

"میں تمہیں لے چلوں گا وہاں، وعدہ۔" کبیر سے اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اور بے بسی دیکھی نہ گئی۔

☆☆☆

طائر وقت کی پرواز اپنے معمول کے مطابق تھی۔ دن اور رات کے سیاہ و سفید دھاگوں سے ہفتوں، مہینوں اور برسوں کی لامحدود چادر کی بنت جاری تھی۔ ماریہ کو نواں مہینہ لگا تو وہ کبیر کے سر ہو گئی۔

"مجھے ڈیڈ سے ملنا ہے کبیر؟"

"اس حال میں جاؤ گی؟ کچھ عرصہ ٹھہر جاؤ، میں لے چلوں گا تمہیں، اعتبار نہیں ہے مجھ پر۔" کبیر اسے سمجھا سمجھا کر زچ ہو گیا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ میں مرنے والی ہوں، میں مرنے سے پہلے ان سے ملنا چاہتی ہوں، پلیز کبیر، تم مجھے اور میری فیلنگز کو سمجھو۔"

اس کے آنسو کبیر کی کمزوری تھے، وہ فقط بے بسی سے اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔

"ایڈریس ہے تمہارے پاس؟"

"میری پرانی ڈائری اور کچھ کھلونے میرے پاس اب تک محفوظ ہیں۔ اس میں لکھا ہے۔"

کبیر نے اپنا وعدہ یا اس کی ضد بالآخر پوری کر ہی دی۔ ایک طویل سفر کر کے وہ اس گھر کے باہر کھڑی تھی جہاں آم کے درخت کی شاخیں اور بوگن ویلیا کی بیلیں باہر لٹک رہی تھیں۔ اندر بڑے سے صحن میں وہی پھول کیاریاں اور بیلیں تھیں، پیڑ تھے جو ریاست علی اسے بتایا کرتا تھا۔ بغیر دیکھے بھی یہاں کا نقشہ اسے حفظ تھا۔

وہیل چیئر پہ بیٹھے کمزور سے ریاست علی کو اس نے پہچان لیا تھا اور ڈیڈ کہہ کر اس کے گلے لگی تو ریاست علی نے بھی اسے پہچان لیا۔ اس کے چہرے سے نہیں بلکہ اس کے وجود سے پھوٹتی اس خوشبو سے جو اولاد کی خوشبو کہلاتی ہے۔ ماریہ کے ہاتھ تھامے وہ کچھ نہیں بولا، بس بہت دیر تک روتا رہا، کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ آنسو خوشی کے ہیں، پچھتاوے کے یا کسی اور بات کے؟

☆☆☆

اس کی واپسی ایک عام واپسی نہیں تھی جس میں انسان پورا کا پورا صحیح وسالم واپس آ جاتا ہے۔ یہ واپسی تو ایسی تھی جس میں انسان ادھورا واپس آتا ہے اپنا کچھ حصہ کہیں چھوڑ کر، شعوری طور پر وہ آج بھی اپنے باپ کے زیر اثر تھی بالکل اپنے بچپن کی طرح۔

اسے اندازہ نہیں تھا، انکشاف ہوا تو وہ پہلے

ششدر رہ گئی، پھر دھیرے دھیرے اس کی اپنی زندگی ہی اس کے لیے پہلے وبال پھر عذاب بننے لگی۔

ریاست علی نے اس سے جو جو کچھ کہا وہ پنجے گاڑ کر اس کے اندر تک بیٹھ گیا۔ اس کے خون میں یوں سرائیت کر گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان باتوں کو اپنے اندر سے جھٹکنے پر انہیں بھولنے اور فراموش کرنے پہ قادر نہ ہو سکی۔

باپ کی آواز اس کی سماعتوں میں ہمہ وقت یوں رہتی جیسے دل کی دھڑکن ہر وقت اپنی موجودگی کا احساس دلائے رکھتی ہے۔

''ماریہ میری بچی، یہ تم نے کیا کیا؟ ایک غیر مسلم کو مسلمان بنائے بغیر اس سے شادی کر لی؟ یہ تو گناہ ہے؟ تمہارے بچے کس مذہب پہ عمل کریں گے ان کی گمراہی کا وبال بھی تم پر ہوگا؟''

بس چند جملے ہی تو تھے مگر دہکتی سلاخیں بن کر ہر لمحہ کچوکے دیتے رہتے تھے اسے معلوم نہیں تھا کہ ریاست علی کا ڈالا ہوا مذہب کا بیج اس کے اندر تک سرائیت کر کے ایک ننھا منا سا پودا بنا کھڑا ہے۔

وہ اس کے وجود سے لاعلم رہی مگر ریاست علی نے احساس دلایا تو اسے اپنی شناخت کا اور اس شناخت کی اہمیت کا اندازہ ہوا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ اپنی جگہ، دوسری طرف کبیر کی محبت جو اس کے پورے وجود کو ڈھانپے ہوئے تھی، اور جس کی جڑیں اس کے اندر بھی پھیلی ہوئی تھیں، اس محبت اور اس حقیقت سے فرار ممکن تھا نہ انحراف۔

ماریہ دو ٹکڑوں میں بٹتی جا رہی تھی، ایسی اذیت ناک زندگی کا تصور تو اس نے کبھی نہیں کیا تھا، وہ جو، سوچتی تھی کہ محبت کا نہ ملنا اذیت ہے، اسے اب معلوم ہو رہا تھا کہ محبت کا مل جانا بھی کبھی کبھی انسان کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔

کبیر اس کی ذہنی کشمکش اور پریشانی کو دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا مگر سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ ہر بار پوچھنے پر کچھ نہیں کہہ کر ٹال جاتی تھی۔

بیٹی کی پیدائش پہ ماریہ بہت خوش تھی، وقتی طور پہ ساری الجھنیں بھول گئی مگر وہ یکا یک عود آئیں۔ جب کبیر نے ننھی بچی کو گود میں لیتے ہوئے اعلان کیا۔

''یہ ہماری گیتا ہے۔''

''نہیں گیتی آراء!'' ماریہ نے پہلا اختلاف کیا، ریاست علی کو گل گوتھنی سی پوتی کا نام گیتی آراء تھا، ماریہ کو وہ بچی اور نام دونوں ہی بہت کیوٹ لگے تھے۔

''مگر یہ نام ہم نے پہلے بھی ڈسکس کیا تھا؟ تم راضی تھیں تب؟''

''اب نہیں ہوں۔'' کبیر کی نرمی دیکھ کر وہ اور شیر ہو گئی۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ! میں تم سے بھی محبت کرتا ہوں اور ممی سے بھی، دونوں کو خوش رکھنا اور دیکھنا چاہتا ہوں، ایسا نام رکھتے ہیں جو دونوں کے لیے قابل قبول ہو، نہ گیتا، نہ گیتی آراء، گیت ٹھیک رہے گا کیوں؟'' کبیر نے فوراً ہی مسئلے کا حل نکال لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ماریہ نے زیادہ بحث نہیں کی، یہ نام بھی اچھا تھا پھر کبیر کو پریشان کرنا یا پریشان دیکھنا، یہ بھی تو بہت مشکل امر تھا اس کے لیے۔

نام کا مرحلہ تو بخیر و خوبی نمٹ گیا مگر جب پیدائش کا فارم بھرنے لگے تو گھر میں ایک چھوٹا سا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا، مذہب کے خانے میں کیا لکھا جائے، ہندو یا مسلم؟

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اندر سے یہ وہی ہے، اپنے باپ کے مذہب پہ، بس وقتی طور پر خود کو بدل لیا تھا کبیر سے شادی کے لیے، ورنہ یہ لوگ بدلتے نہیں ہیں۔'' پشپا کھنہ اپنے شوہر کے سامنے پھنکاریں۔

''تم نے آگ کے گرد سات پھیرے لے کر مجھ سے شادی کی تھی، تمہیں باقاعدہ اور باضابطہ میرے مذہب میں شامل کر کے تمہارا نام شانتی رکھا گیا تھا۔ ممی تمہیں اسی نام سے پکارتی ہیں تمہیں آج تک کسی بات پہ کوئی اعتراض نہیں ہوا، آج کیا ہو گیا؟'' کبیر تحمل مزاج تھا مگر اب اس کے صبر کے پیمانے بھی بھر گئے تھے چھلکنے لگے۔

''میں اپنی بیٹی کو مسلمان ۔ بنانا چاہتی ہوں۔''
ماریہ نے بالکل وہی الفاظ دہرائے جو ریاست علی نے اس سے کہے تھے اس کے اپنے لیے۔

''اور تم، تم خود؟'' کبیر نے اسے غور سے دیکھا۔

''میں آج بھی اندر سے وہی دس سالہ ماریہ ہوں، میرا دل میرا اندرون نہیں بدلا کبیر!'' ماریہ نے اس کے سامنے اعتراف کیا۔

''گیت میری بھی بیٹی ہے، اپنے مذہب کے حوالے سے میری بھی وہی خواہش ہے جو تمہاری ہے پھر، اب کیا کریں؟'' سوال مشکل تھا، معاملہ الجھا ہوا تھا مگر آنند کھنہ نے آگے بڑھ کر ایک حل نکال لیا۔

''مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دو، بڑی ہو کر خود ہی فیصلہ کر لے گی۔'' مغرب میں یہ چلن عام ہے۔ اکثر والدین مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دیتے ہیں کہ بچے بڑے ہو کر اپنی مرضی سے فیصلہ کر لیں گے۔ سو گیت کے معاملے میں بھی یہی کیا گیا۔

مگر الجھنیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں، زندگی آسان تھی نہ معاملات، گیت کچھ بڑی ہوئی تھی۔ ماریہ اسے کلمہ سکھاتی اور یاد کرواتی تھی۔ اس کی دادی، اپنی پوتی کو پوجا کے کمرے میں اپنے ساتھ بٹھاتیں اور خود ماریہ کا اپنا حال بھی عجیب تھا۔

اسے اپنے ڈیڈ سے بہت محبت تھی، اتنی کہ اس کی خواہش اور اس کے کہے ہوئے لفظوں کو حرز جان بنا لیا، خود کو دو بلکہ تین ٹکڑوں میں تقسیم کر ڈالا تھا اس نے یا سب کچھ خود بخود ہو گیا تھا۔

کبیر کے ساتھ رہتے ہوئے اسے گناہ کا احساس بھی ہوتا، ندامت اور ملامت بھی، مگر اسے چھوڑنا بھی ماریہ کے بس کی بات نہیں تھی، محبت نے دامن پکڑا ہوا تھا۔

کبیر کو چھوڑنے کا تصور کرتی تو اس کی سانسیں رکنے لگتیں، پھر گیت سے قلبی لگاؤ جو دونوں کے رشتے کا فطری تقاضا تھا۔ وہ کبیر سے علیحدگی کا سوچتی تو یہ بھی خیال آتا کہ بیٹی اپنے باپ کی قربت اور شفقت سے محروم ہو جائے گی۔ کبیر کے ساتھ ساتھ گیت سے جدائی بھی اس کے لیے سوہان روح تھی۔

کبیر کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ اس کا والہانہ پن، خود سپردگی، چاہت سب کچھ برف کا تودا بنتا جا رہا تھا۔ ٹھنڈا، بے حس اور بے جان، کبیر اس ساری صورت حال سے، اس کے رویے سے تنگ آنے لگا تھا، بے زار ہونے لگا تھا۔ باپ کے ساتھ مل کر اس نے بزنس اسٹارٹ کیا تھا۔ اسے اب زیادہ تر سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ وہ سفر سے واپس آتا تو ماریہ کی پرجوش رفاقت کا تمنائی ہوتا مگر اب وہ کچھ تھکنے لگ گیا تھا۔

''تم ایک بار اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کر لو ماریہ! یا تو مجھے پہلے کی طرح اپنی محبت سے غلام بنا لو، نہیں تو اس بے مقصد قید سے مجھے بھی آزاد کرو اور خود کو بھی۔''

ایک روز اس نے صاف صاف کہہ ہی دیا۔ اسے اپنی بیوی کی پوری محبت، مکمل توجہ اور سارا وجود چاہیے تھا۔ ٹکڑوں میں بٹا ہوا انسان جذبوں کو اور زندگی کو بھی ادھورا کر دیتا ہے۔

''تمہیں ایک چیز کو چننا ہوگا مذہب یا میں، تم نے خود کو بھی اذیت میں ڈالا ہوا ہے اور مجھے بھی۔''

سات برسوں کی برداشت کے بعد کبیر کا ضبط بس جواب دے گیا۔

''کبیر! تم مسلمان ہو جاؤ۔'' ماریہ کے پاس بس یہی ایک طریقہ تھا خود کو، محبت کو زندگی کو اور اپنے گھر کو بچانے کا۔

''ماریہ!'' ایک گہری سانس لیتا ہوا وہ اس کے قریب بیٹھ گیا، اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

''دیکھو، یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا، مذہب کی تبدیلی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتی۔ نہ وقتی جذبہ اور نہ ہی کسی کے کہنے سے یہ عمل ہوتا ہے۔ یہ دل کی تبدیلی ہوتی ہے، انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے، تم اپنی مثال لے لو میرے لیے، محبت کے لیے، شادی کے لیے تم

نے میرے مذہب میں پناہ لے لی مگر وہ وقتی تھا سب کچھ، مجھے معلوم ہے تم نے اس وقت جان بوجھ کے یہ سب نہیں کیا۔ شاید اس وقت تم لمیچر تھیں، اپنے آپ سے لاعلم، مگر وہ جو تمہارے اندر ہے وہ بالآخر ایک دن باہر آ گیا۔ میں بھی تمہارے یا کسی کے بھی کہنے سے یہ سب نہیں کرسکتا، میں جو ہوں، اس پر مطمئن ہوں، تم تم اپنے بارے میں فیصلہ کرلو ایک بار، ایک فیصلہ۔''

''کبیرا میں تم سے اور گیت سے بہت محبت کرتی ہوں، میں اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہتی، مگر کوئی اندر سے مجھے اس زندگی پہ ملامت کرتا رہتا ہے میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ کبیر ترحم سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ خود بھی تو تقسیم ہوتا جارہا تھا۔ کبھی ماریہ پہ ترس آتا، کبھی خود پہ۔ محبت اور تعلقات میں گرم جوشی زندگی کی علامت ہے ورنہ وہ مردہ ہو کر لاتعلقی کے تابوت میں بند ہو جاتے ہیں اور رویوں کی، باتوں کی، حالات اور واقعات کی زنگ آلود کیلیں ایک ایک کر کے ٹھک ٹھک اس تابوت کا ڈھکن ٹھوکتی رہتی ہیں۔

کبیر اور ماریہ کی محبت، رشتے اور تعلقات کے تابوت میں آخری کیل بھی ایک دن لگ گئی، اس دن، جب کبیر نے اپنے ایک ضروری کاغذ کی تلاش میں الماریاں، درازیں، کیبنٹس سب کچھ چھان مارا، کاغذ تو اسے نہ ملا مگر جو کچھ ملا وہ اسے حیران اور پھر سن کر گیا۔

''یہ کیا ہے؟ کب سے استعمال کررہی ہو تم؟'' ماریہ واپس آئی تو کبیر اس سے جواب طلبی کررہا تھا، وہ مشتعل تھا اور بہت دکھی بھی۔

''تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں فیملی بڑھانے کا کتنا شوقین تھا، تم بھی تو یہی چاہتی تھیں کہ ہمارے کم از کم تین چار بچے تو ہوں، پھر تم...... تم کیسے کرسکتی ہو یہ سب؟'' اسے جھنجھوڑ کر وہ اب اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔

''میں آج تک یہی سمجھتا رہا کہ یہ قدرت کی طرف سے ہے میں نے سمجھوتا کرلیا تھا، ایک بیٹی کو ہی اپنی پوری دنیا مان لیا، مجھے معلوم نہیں تھا تم دھوکا دے رہی ہو مجھے، کیوں کرتی رہیں یہ سب؟'' وہ ایک بار پھر سوال کررہا تھا اس سے۔

''میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے جیسے اور بچے اس دنیا میں آئیں، جو ایک واضح سمت میں نہ چل سکتے ہوں۔'' ماریہ نے سر جھکا کر اعتراف کیا تو اس کی نظریں کبیر کے پھینکے ہوئے اس خالی ڈبے پر تھیں، جس میں موجود گولیوں نے گیت کے بعد کسی اور جان کو دنیا میں نہ لانے میں اس کی مدد کی تھی۔

''تم اپنے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی تباہ کر رہی ہو۔''

''کبیرا تم مجھ پہ ترس اور رحم کھائے بغیر جو فیصلہ کرنا چاہو کرلو۔'' ماریہ جو بات کہنے کے لیے ایک عرصے سے خود کو مضبوط کررہی تھی۔ آج اس نے کہہ ڈالی۔

اسے شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ کبیر کے ساتھ بھی زیادتی کررہی ہے۔ وہ کبیر سے محبت کررہی ہے مگر اسے وہ محبت دے نہیں رہی، کبیر کی جو خوشیاں اور ارمان اس سے وابستہ ہیں، انہیں پورا کرنے میں ناکام ہورہی ہے پھر اسے کیا حق ہے ایک انسان کی زندگی یوں تباہ کرنے کا۔

''گیت اب بارہ سال کی ہورہی ہے، اسے سمجھایا جاسکتا ہے۔''

وہ کبیر سے علیحدہ ہوگئی تھی، تمام تر دکھ اور تمام تر کرب کے باوجود اس نے یہ پل صراط عبور کرہی لیا گیت اس کے ساتھ بھی رہتی اور کبیر کے ساتھ بھی، اسی آنکھ مچولی میں وہ کالج پہنچ گئی۔ تب ماریہ کے دل نے ایک دن اچانک دھڑکنا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

اگرچہ وہ اپنی دانست میں فقط ایک آدھ گھنٹے کی مہمان بن کر یہاں آئی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ جو کچھ ہم سوچتے اور سمجھتے ہیں وہ اکثر پورا نہیں ہوتا وہ ایک گھنٹہ تقریباً تین گھنٹوں پہ محیط ہوگیا تھا۔ پہلے

کولڈ ڈرنک سے اس کی تواضع کی گئی پھر اسے اصرار کر کے کھانے کے لیے روک لیا گیا۔

''ہمارے ہاں یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ کھانے کے وقت کوئی مہمان آئے اور کھانا کھائے بغیر چلا جائے۔'' سیاہ آنکھوں والے اس لمبے سے لڑکے نے کہا، جس کا نام اسے بعد میں پتا چلا، سیف احمد۔

ریاست علی اسے جی بھر کے دیکھنا اور دل بھر کے باتیں کرنا چاہتے تھے، مگر ان کی صحت اور وقت دونوں ہی اجازت دینے میں متامل تھے۔

''تم مجھے ماریہ کے بارے میں بتاؤ۔''

''کیا بتاؤں ان کے بارے میں، آپ نے گناہ ثواب کی جس سولی پہ انہیں ٹانگ دیا تھا، وہ اسی پر مصلوب ہو گئیں۔'' گیت نے کندھے اچکاتے ہوئے آدھی اردو آدھی انگلش میں جواب دیا، یہ ٹوٹی پھوٹی اردو اس نے اپنے ایک پاکستانی کلاس فیلو سے سیکھی تھی۔ اس کی شادی میں تو ان کا پورا گروپ آیا تھا۔

''کیا وہ مجھ سے ناراض تھی؟'' ریاست علی بے چین ہوئے، اتنے عرصے بعد پھر سے سارے زخموں کے کھرنڈ اتر رہے تھے، انہیں اذیت ہونے لگی۔

''وہ تو ناراض نہیں تھیں آپ سے، مگر۔'' گیت نے کرسی پہ بیٹھے بیٹھے آگے جھک کر ریاست علی کا بیمار، بوڑھا اور بے بس چہرہ دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''مجھے اس شخص پہ کیوں ترس آ رہا ہے؟'' وہ جھنجھلائی۔

''میں صرف اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کرنے یہاں آئی ہوں، ورنہ یہاں آنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔''

گیت نے جتایا، وہ بار بار خود کو یاد دلا رہی تھی کہ اسے، اس شخص پہ ترس آنا چاہیے نہ رحم کھانا چاہیے اس نے اپنی ماں کو بہت تکلیف میں دیکھا تھا۔

کبیر تو دوسری شادی اور تین بچوں کے بعد پھر بھی سنبھل گیا تھا، بہل گیا تھا مگر ماریہ جس ان دیکھی آگ میں جل کر خاک ہوئی تھی، اس کی اذیت کا اندازہ گیت پوری طرح لگا بھی نہیں سکتی تھی۔ بس تھوڑا بہت محسوس ہی کر سکی تھی۔

وہ اس پوری داستان سے واقف تھی۔ ماریہ کے ساتھ اس نے زیادہ وقت گزارا تھا۔ دوسری شادی اور پھر بچوں کے بعد کبیر کا وقت توجہ، محبت، شفقت سب تقسیم ہو گیا تھا، مگر پھر بھی اس نے اپنی سی پوری کوشش کی تھی گیت کو ساتھ رکھنے کی، اس کا خیال کرنے کی۔

گیت اپنے باپ سے تو دور نہیں ہوئی تھی مگر اس گھر اور کبیر کی فیملی سے ضرور دور ہو گئی تھی اور ماریہ کے زیادہ قریب تھی۔ اگرچہ ماریہ نے اس کے سامنے کبھی ریاست علی کی برائی نہیں کی تھی، بس یہ گیت کی اپنی سمجھ، عقل اور شعور تھا کہ وہ جتنا اپنی ماں کی زندگی اور موت کے بارے میں سوچتی اسے سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کر ریاست علی کے سوا کوئی قصوروار نظر نہ آتا تھا۔

پھر بھی جانے کیا بات تھی، خون کی کشش والی بات سچ ہے یا وہ اپنا دل سخت کرنے میں ناکام ہو رہی تھی، وہ ایک بوڑھے اور بیمار شخص سے، زیادہ تلخ اور طنزیہ رویہ اختیار نہ کر سکی۔ اس کے پوچھے گئے چھوٹے چھوٹے سوالوں کے جوابات دے رہی تھی جب سیف احمد اندر آیا۔

''کھانا لگ گیا ہے۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے پھر راہ فرار اختیار کی۔

''تھوڑا سا کھا لو۔'' ریاست علی کے لہجے میں اتنی لجاجت تھی کہ وہ بس اٹھ ہی گئی۔ میز پہ موجود سارے افراد کا تعارف بھی ہو گیا۔ صاف رنگت اور شربتی آنکھوں والی خاتون اس کی امی تھیں اور بہت گوری رنگت پھیلے پھیلے نقوش اور ویسے ہی سراپے کی مالک سیف کی بچی تھیں۔ ان دونوں خواتین کے دو دو بچے بھی موجود تھے۔ پتا نہیں کیا کیا نام بتائے تھے،

گیت نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے سب سے تعارف حاصل تو کیا بعد میں بھول گئی۔ بس ایک ہی نام یاد رہا۔ وہ جو گھر میں سب سے بڑا تھا۔ عمر میں بھی، قد میں بھی اور جو ماریہ کو اپنے ساتھ اندر لایا تھا۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا تھا اور جب وہ واپس جانے کو کھڑی ہوئی تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

''بات سنو۔'' باہر چھوٹے سے صحن میں سیف نے اسے روکا۔

''تم جب تک یہاں ہو، تو یہیں ٹھہر جاؤ، داجی کے پاس۔''

''مگر کیوں؟ میں ہوٹل میں اپنے گروپ کے ساتھ ہوں اور خوش ہوں۔'' گیت نے ابرو اچکائے۔

''داجی نے کہا تھا کہیں کہ.....''

''ہاں مگر وہ ایک رسمی سی دعوت تھی یا پھر شاید وہ اپنا گلٹ کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' گیت نے اس کی بات کاٹی۔

''وہ رسمی دعوت نہیں تھی، وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم ان کے پاس رک جاؤ۔'' سیف میں اس کی نسبت تحمل اور ٹھہراؤ زیادہ تھا۔

''مگر میں نہیں چاہتی۔'' ٹکا سا جواب دے کر وہ آگے بڑھی۔

''میں، تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' سیف نے شاید مایوس ہو کر اسے پیش کش کی۔

''میں، رائڈ منگوا چکی ہوں۔''

''کینسل کر دو۔''

''تمہارے کہنے سے؟'' اس نے مڑ کر سیدھا سیف کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں، اپنی مرضی سے۔'' وہ بہت پرسکون ہو کر جواب دے رہا تھا۔

''چلو۔'' چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کندھے اچکائے اور ان پہ پڑا اپنا بیگ درست کیا اور آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

یہ زندگی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کچھ نہیں معلوم کہ اگلے پل کیا ہو، گیت کو بھی معلوم نہیں تھا کہ جس جگہ وہ اپنی دانست میں محض کھڑے کھڑے جا رہی ہے، وہاں سے چار گھنٹوں بعد واپس آئے گی اور واپس بھی اس طرح نہیں آئے گی جس طرح آئی تھی، یعنی اکیلی بلکہ واپسی پہ اس کے ہمراہ بے حد بولتی ہوئی سیاہ آنکھوں اور دراز قد کا مالک ایک لڑکا ہو گا، جو برسوں میں اس کا قریبی کزن مگر پھر بھی انجان اور اجنبی ہو گا اور جب اجنبیت اور سرد مہری کی برف پگھلے گی تو اس کے اندر سے کیا برآمد ہو، کون جانے؟

قدرت کے کھیل نرالے ہیں وہ آپ ہی جانے ہر بھید، انسان پہ تو جوں جوں کوئی بھید، کوئی حقیقت آشکار ہوتی ہے وہ بس حیران ہی ہوتا رہتا ہے۔

ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی سے اتر کر وہ کھڑکی میں جھکی۔

''تم سے مل کر اور باتیں کر کے اچھا لگا سیف!'' وہ جہاں کی پروردہ تھی وہاں کے باسی عموماً اپنے جذبات، احساسات، دھڑلے سے صاف گوئی سے بیان کرنے کے عادی ہیں، وہ بھی ایسی ہی تھی۔

''شکریہ، کیا میں کل لینے آؤں تمہیں؟''

''مجھے یہ لگ رہا ہے کہ میں ہاں کہوں یا نا، تم کل مجھے یہیں ملو گے؟'' گیت کی تیز چمک دار آنکھیں سیف کے اندر تک اتر رہی تھیں۔

''اتنی جلدی، اتنے قریب اور گہرائی سے جان لیا تم نے مجھے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہاں کے لوگوں کی خاصیت ہے یہ، زبردستی کرنا، من مانی کرنا، اپنی مرضی چلانے کی کوشش کرنا۔'' سیف سے وہ شستہ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

''آتے ہی ساری خصوصیات جان لیں؟'' سیف مسکرایا۔

''آنے سے پہلے بھی جانتی تھی، نسلاً میں آدھی مشرق سے ہوں آدھی مغرب سے، بائی دا وے اگر تم باتیں کرنے کے موڈ میں ہو تو میرے کمرے میں

آ سکتے ہو۔'' گیت کھڑکی چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

''میں کل آؤں گا۔'' سیف نے گاڑی آگے بڑھادی، چہرے کی مسکراہٹ اب سنجیدگی میں ڈھل گئی تھی۔

اگلی صبح، بہت صبح تو نہیں مگر دس بجے سے پہلے وہ ہوٹل کی کشادہ لابی میں گیت کے سامنے بیٹھا تھا۔

''تم اتنا اصرار کیوں کر رہے ہو، میرے دو چار دن رہنے سے تمہارے داجی کو کیا فرق پڑے گا؟ کچھ دن میری مہمان داری کر کے ان کی ندامت یا شرمندگی ڈھل جائے گی، ختم ہو جائے گی؟ میں تو ویسے بھی اپنے گروپ کے ساتھ آئی ہوں ہم اپنے دوست کی شادی انجوائے کریں گے، تمہارے شہر کی سیر کریں گے پھر لاہور اسلام آباد، پنڈی مری اور شمالی علاقہ جات، ہمارا پورا منصوبہ تیار ہے ہر دن کیلکولیٹڈ ہے، سارا بندوبست ہو چکا ہے ان سب میں، میرے لیے کہیں اور جانے اور رکنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

گیت نے ذرا تفصیل اور کچھ نرمی سے ہی اسے سمجھایا تھا مگر اس نرمی کے پیچھے ایک غیر محسوس سی سختی تھی۔

''اس شہر کی سیر میں کرادوں گا تم سب کو، یہاں کی حیرت انگیز باتیں اور دلچسپ مقامات، انوکھے لوگ، یقین کرو تم سب بہت انجوائے کرو گی اور شادی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ جتنے دن تقریبات ہیں، میں ذمے داری سے تمہیں پک اینڈ ڈراپ کردوں گا۔''

سیف کی آنکھوں میں التجا کے رنگ واضح تھے۔

''میری طرف سے معذرت کر لینا۔'' گیت بالکل ہی کٹھور بن گئی۔

''وہ مرنے والے ہیں گیت! خدا کے واسطے، ایک مرتے ہوئے شخص کو مزید تکلیف مت دو، تم سامنے ہو گی تو شاید ان.....'' سیف آگے جملہ مکمل نہ کر سکا۔

گیت کچھ کہے بغیر اپنی تیز نظروں سے اسے گھورتی رہی۔

''ان کے گردے جواب دے چکے ہیں، وہ ڈائیلسیز پر ہیں۔ زیادہ وقت نہیں ہے ان کے پاس۔'' سیف نے دھیمی آواز میں بتایا تو اس کی نگاہیں، گیت کی سرمئی آنکھوں سے الجھ رہی تھیں۔

''تم چاہتے ہو، میں ترس کھاؤں ان پر؟''

''میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم اپنی مرضی کی مالک ہو، اتنا نرم دل تو ہر انسان ہوتا ہے کہ ایک مرتے ہوئے انسان پہ رحم کھالے۔''

''یہی تو خرابی ہے ہم سب میں، مرتے ہوئے انسانوں پہ رحم کھالیتے ہیں، جیتے ہوئے، زندگی گزارتے ہوئے لوگوں پہ ترس نہیں آتا ہمیں۔''

گیت نے اپنے مخصوص انداز میں ابرو چڑھائے۔

سیف کچھ نہ بولا مگر اس کی سوالیہ نگاہیں گیت پر ٹکی تھیں جس کے صاف شفاف چہرے پہ الجھن تھی جو کسی نتیجے یا کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے چہرے پہ آجاتی ہے۔

''میں شام تک آجاؤں گی۔'' بالآخر فیصلہ ہو گیا اور قدرت اپنے فیصلے انسانوں سے کروالیتی ہے۔ ویسے یہ بھی ایک غور طلب بلکہ بحث طلب معاملہ ہے کہ قدرت اپنے فیصلے انسانوں سے کرواتی ہے یا وہ خود یہ فیصلے کرتے ہیں؟ آزادی و خود مختاری کتنی ہے؟ کیسی ہے؟ کہاں تک ہے۔

سیف ان معاملات کو سوچتا تھا، غور کرتا تھا، گیت نے اب سوچنا شروع کیا تھا۔

شام کی سرمئی ردا سیاہ ہونے سے پہلے گیت گھر آ گئی تھی۔ بلیک ٹائٹس اور پرنٹڈ کرتی میں ملبوس، ایک مختصر سا سفری بیگ، وہ ریاست علی کے کمرے میں موجود تھی، سیف انہیں ایک گھنٹہ پہلے ہی ڈائیلسیز کروا کر اسپتال سے گھر لایا تھا۔

''شکریہ۔'' سیف کی مسکراہٹ دھیمی مگر شکریہ بہت واضح تھا۔

''اپنا شکریہ اپنے پاس رکھو تمہارے لیے نہیں آئی۔'' گیت آ گئی تھی، مگر برہم تھی، شاید اسی لیے برہم تھی، جتنی بے رخی، بے گانگی بلکہ نفرت وہ سوچ کر اس ملک اور اس شہر میں آئی تھی، وہ سب کچھ دھواں

بن کر تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

ہر گزرتے لمحے زندگی کسی نہ کسی تجربے سے نوازتی ہے، گیت کو بھی تجربہ ہو رہا تھا کہ کسی سے نفرت کا ارادہ کرنا یا اظہار کرنا آسان ہوتا ہے اور سچ مچ نفرت کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

''تمہیں غصہ آ رہا ہے کہ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر یہاں کیا کر رہی ہو؟'' سیف بالکل سنجیدہ تھا، مذاق تو نہیں کیا تھا اس نے، مگر وہ تڑخ تڑخ گئی۔

''میرے چہرے پہ لکھا ہے جو تم نے پڑھ لیا؟''

''مجھے چہرے پڑھنے نہیں آتے، بس مجھے محسوس ہوا کہ تم شاید اسی وجہ سے برہم ہو کہ یہاں آنا نہیں چاہتی تھیں پھر بھی کیوں آ گئیں؟'' سیف کا چہرہ بھی سادہ تھا اور جواب بھی۔

''کیا میرے لیے الگ کمرے کا بندوبست ہے یا یہیں رہنا پڑے گا؟''

''دونوں سہولتیں ہیں جیسے تم پسند کرو۔''

''یہ تو سو رہے ہیں؟'' گیت نے اپنی پسند یا مرضی بتانے کے بجائے ریاست علی کے خوابیدہ چہرے کو ایک نظر دیکھا۔

''کچھ دیر میں جاگ جائیں گے، آؤ، میں تمہارا کمرہ دکھا دیتا ہوں۔''

گیت کو ساتھ لیے وہ صحن میں آیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ''تمہاری ممی نے اس صحن کا جو نقشہ تمہارے سامنے کھینچا تھا وہ بھی حقیقت تھا، پھر جب مکینوں کی تعداد بڑھ گئی تو مزید کمروں کی ضرورت ہوئی، لہٰذا اس بڑے سارے صحن کی کیاریاں، پھولوں کے جھاڑ اور پھلوں کے درخت کاٹ کر یہاں تعمیرات کی گئیں۔'' سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے وہ گیت کو بتا رہا تھا۔ اوپر کا پورا پورشن بنا ہوا تھا، کمرے، لاؤنج، کچن، صاف ستھرا، نیا نکور، وہ ایک کمرے کے آگے رکا۔ ''یہ تمہارا کمرہ ہے۔'' وہ دروازہ کھولنے لگا۔

''ابھی رہنے دو۔'' گیت نے اسے روکا، اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جو چھت پہ جا رہی تھیں، اس بار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گیت آگے تھی اور سیف اس کے پیچھے اوپر کھلی چھت تھی، بہت بڑی، ایک طرف ایک کمرہ تھا یا شاید اسٹور روم، اس کے ساتھ مختصر سا شیڈ تھا جس کے نیچے ایک تخت پڑا تھا اور ان سب کے اوپر کھلا آسمان تھا، تاروں بھرا آسمان، سچ مچ کے ستارے، چمکتے ہوئے۔ ''یہ آسمان اور یہ ستارے یہاں بھی ہیں؟'' گیت نے ایک نظر آسمان کی طرف کی۔

''تمہارے ساتھ چلتے ہوئے آ گئے ہوں گے۔'' سیف تخت پر بیٹھ گیا اور اس سے کچھ دور، کچھ قریب گیت بھی بیٹھ گئی۔

''میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ.....'' وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوئی۔

''کہ کبھی ایک رات، کسی نئے شہر میں ایک انجان گھر کی چھت پر تاروں بھرے فلک کے نیچے بیٹھی ہو گی۔'' سیف نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

''تم نے اس نئے شہر اور انجان گھر کے ساتھ ایک اجنبی شخص کا ذکر کیوں نہیں کیا جو میرے ساتھ موجود ہے؟''

''میں اجنبی نہیں ہوں تمہارے لیے۔'' سیف نے بہت نرمی سے تصحیح کی تھی۔

''اگر مجھے علم ہوتا کہ فیس بک پہ میرا پرانا دوست، مجھے یہاں ملے گا، ایک نئے رشتے، ایک نئے روپ میں، تو میں اس تعلق کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیتی۔''

گیت نے وہ پرکشش، سانولا چہرہ دیکھا، پچھلے ایک سال سے جس کے ساتھ وہ رابطے میں تھی، اور اگرچہ یہ تعارف ابھی روگ نہیں بنا تھا اور نہ ہی یہ تعلق ابھی بوجھ بنا تھا پھر بھی وہ خائف تھی۔

''تم جانتے تھے سب کچھ پھر بھی؟''

''ہاں میں سب کچھ جانتا تھا پھر بھی میں نے تم سے رابطہ کیا، اسی لیے کہا کہ تمہیں معلوم کرنا چاہیے اور کون کون سے رشتے ہیں جو تم سے جڑے ہوئے ہیں۔ دادی اپنی بیٹی کے حوالے سے جتنے پشیمان تھے

اور جتنا انہیں یاد کرتے تھے، میں جانتا ہوں، ان کی سانس شاید تمہاری آمد میں ہی اٹکی ہوئی ہے۔"

"کیا ہوگا پشیمان ہونے سے؟ سارہ نام کی عورت دنیا سے رخصت ہوئی اور ماریہ بھی، کیا فرق پڑا ریاست علی کو، سوائے اس کے کہ اس دنیا میں ایک کہانی اور چند کرداروں کا اضافہ ہو گیا۔" گیت نے سیف کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلملا رہی تھی۔

"میں جتنا غور کرتی ہوں اتنا ہی الجھتی جاتی ہوں، سارہ اور ریاست علی کے ملنے سے جو کچھ بھی شروع ہوا، رشتہ، تعلق یا کہانی؟ وہ کیا تھی؟ کیوں تھی؟ میری اس بے سمت زندگی کا ذمے دار کون ہے؟ میں اس سوال کا جواب حاصل کرنے بھی شاید یہاں آئی تھی مگر جواب نہیں ملا۔ میرے والدین نے مذہب کا خانہ خالی چھوڑ کر فیصلے کی ذمے داری مجھ پہ ڈال دی اور تم سمجھتے ہو کہ یہ فیصلہ کرنا آسان ہے؟"

گیت کے لیے اس وقت وہ ریاست علی کا پوتا سیف احمد نہیں بلکہ اس کا وہ فیس بک فرینڈ تھا جس سے وہ اپنی بہت سی فیلنگز اور بہت سے معاملات شیئر کیا کرتی تھی۔

یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا معاملہ، سب سے بڑا مسئلہ تھا۔

"اتنی مشکل اور اتنی بھاری ذمے داری، کیسے اٹھاؤں میں؟" وہ مستقل بول رہی تھی۔ "ڈیڈ ویسے تو لبرل بنتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ میں ان کی پیروی کروں، ممی کی خواہش تھی کہ میں ان کے عقیدے کو فالو کروں، مجھے دونوں سے محبت ہے، ڈیڈ سے بھی ممی سے بھی لیکن میں نے سوچا کہ اس معاملے میں مجھے اپنی عقل اور شعور استعمال کر کے پھر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔"

"پھر؟" سیف محویت سے اسے سن رہا تھا۔

"میری عقل اور میرا شعور کہتا ہے کہ خدا جو بھی ہے جیسا بھی ہے، اکیلا ہے، ایک ہے یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، اس کے بعد پھر میں....."

گیت نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اتنا سمجھنا بھی ابھی کافی ہے تمہارے لیے، مزید سوچو گی تو خود ہی راستے کھلتے چلے جائیں گے۔" سیف نے اسے تسلی دی۔

"تمہارے مشورے کا شکریہ مگر تم اس لہجے میں بات نہ کیا کرو مجھ سے اور ان نظروں سے نہ دیکھا کرو۔" وہ جز بز ہوئی۔

"کیوں، تم ڈرتی ہو کیا؟" سیف اس کے اعتراض پہ محظوظ ہو کر ہنسا تھا۔

"ہاں، میں ڈرتی ہوں، کہانیوں کے دہرائے جانے سے ڈر لگتا ہے مجھے۔" گیت نے اس کی طرف دیکھے بغیر، سامنے دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔

"یہ کہانیاں تھوڑی ہوتی ہیں جو دہرائی جاتی ہیں یہ تو محبت ہوتی ہے جو ہر بار دہرائی جاتی ہے گیت پیاری!" سیف اٹھ کھڑا ہوا۔

نیچے اتر کر جاتے ہوئے گیت نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جو سیف نے اس کے لیے بتایا تھا۔ کچھ دیر وہاں کھڑی وہ سوچتی رہی پھر نیچے آ گئی۔

ریاست علی اب بھی بے خبر تھے کہ ان کے پاس کون بیٹھا ہے، کس نے انہیں دیکھتے دیکھتے ان کا ہاتھ پکڑ کر پہلے اپنے رخساروں پھر ہونٹوں سے لگایا ہے، خون کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور لمس کی اپنی ایک مہک، گیت کو ریاست علی کے ہاتھ سے ماریہ کے لمس کی خوشبو آ رہی تھی۔

"میری ممی نے آپ سے بہت محبت کی ہے، آپ کی بہت باتیں کی ہیں مجھ سے، دس سال کی یادیں اور باتیں کم نہیں ہوتیں، میری ان سے محبت اور ان کی آپ سے عقیدت، مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں اس ہاتھ کو اور اس لمس کو محترم جانوں۔"

گیت کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں، انسان اتنا کمزور کیوں ہوتا ہے اور اتنا مجبور بھی کیوں؟ ریاست علی کا ہاتھ تھامے اس کے تصور میں سیف کا چہرہ ابھر رہا تھا۔

☆☆☆

ماڈل موڑ سے باہر آتے ہی اس کی کمنٹری شروع ہوگئی۔

''یہ قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ ہے اس سے تھوڑا آگے پرانا ایئرپورٹ ہے اسٹار گیٹ پہ، وہ حاجیوں کے کام آتا ہے۔ حج پروازیں وہیں سے جاتی ہیں وہیں پہ آتی ہیں۔ یہ ہم پاکستانیوں کی ایک خاص عادت کہہ لو یا ادا، نئی چیز آجاتی ہے پھر بھی پرانی شئے پھینکتے ہیں نہ ضائع کرتے ہیں، سینے سے لگا کر رکھتے ہیں جانے کس کام آجائے۔''

طارق روڈ اور بہادر آباد کے بازار دکھاتا ہوا پھر سیدھے اس نے مزار قائد پہ جا کر ہی دم لیا۔ سفید پرسکون مقبرہ دھوپ میں نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔

گیٹ سمیت وہ چار لڑکیاں تھیں اور دو لڑکے، ان کی ستائشی نظریں سنگ مرمر کی منفرد بناوٹ پہ پھسل رہی تھیں۔ کچھ دیر وہاں ٹھہر کے میوزیم اور دیگر جگہیں دیکھ کر سیلفیاں لیں، پھر وہاں سے آگے بڑھے۔

اب یہ ایم اے جناح روڈ ہے، کبھی بندر روڈ کہلاتا تھا۔'' تماثیل پہنچ کر سیف نے اعلان کیا۔

''بندر روڈ؟ کتنا عجیب نام تھا۔'' ایما ہنسی۔

''عجیب نام تو ابھی میں نے بتائے ہی نہیں، یہاں مچھر کالونی ہے، گیدڑ کالونی ہے، خاموش کالونی ہے، یہاں کریا اسٹاپ بھی ہے، مستانہ چوک بھی ہے اور مکا چوک بھی۔''

سیف ایک ایک کر کے نام گنوا رہا تھا اور نام گنواتے گنواتے ریڈیو پاکستان کی گنبد والی عمارت آگئی۔ جس کے برابر میں اردو بازار روڈ پار کر کے سامنے شوخ اورنج رنگ میں ایک عمارت چمک رہی تھی، آس پاس کی پرانی، پھیکی پھیکی عمارتوں کے درمیان وہ الگ ہی لگ رہی تھی۔

''یہ کوئی خاص جگہ ہے؟'' ٹروڈ اور پیٹریشیا نے خاص طور پر اسے غور سے دیکھا۔

''یہ؟ یہ تو اورنگ زیب مارکیٹ ہے، پتا نہیں کس نے مہربانی کی ہے جو یہ رنگ وروغن ہوگیا، اس کی دوسری منزل پہ ان ڈائجسٹوں کا آفس ہے جو میری امی اور چچی پڑھتی ہیں، خواتین، شعاع اور کرن، ایک بار آیا تھا میں یہاں، چچی جان کا لکھا ہوا افسانہ دینے۔'' سیف شروع ہوگیا۔

''تمہاری چچی رائٹر ہیں؟''

''بن جاتیں، اگر وہ افسانہ شائع ہو جاتا تو۔''

''اچھا یہ دیکھو یہ اس روڈ پہ اندر ڈاکٹر ادیب رضوی کا (Siut) گردوں کا اسپتال اور برابر میں سول اسپتال اور یہ سامنے جامع کلاتھ مارکیٹ، شاپنگ کرنی ہے تم لوگوں کو؟''

''ہاں، ابھی نہیں۔'' آدھوں کے سر ہاں میں ہلے تھے اور آدھوں کی زبان نہ میں۔

''چھوڑو، میرے پاس بھی وقت نہیں ہے۔'' سیف سیدھا آگے بڑھ گیا۔

''یہاں پرانی عمارتیں نہیں ہیں، تاج محل ٹائپ کی؟'' فریک نے بہت دیر میں سوال کیا تھا۔ وہ اپنی پچھلی چھٹیوں میں انڈیا کی سیر کر کے گیا تھا۔ اب جملہ حاضرین کو اپنے مشاہدات اور تجربات سے آگاہ کر دیا تھا۔

''ارے وہاں جو کچھ بنا ہوا ہے یہ تاج محل، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد اور اسی طرح کی دوسری تعمیرات سب ہم نے ہی تو کی ہیں؟'' سیف کا لہجہ تفاخر لیے ہوئے تھا۔

''تم نے؟ یعنی پاکستان نے بنائی ہیں وہ سب؟'' ایما کچھ چکرا سی گئی۔

''میرا مطلب ہے مغلوں نے بنائی تھیں نا، مسلمان حکمرانوں نے، وہی سب کچھ لاہور میں بھی ہے جو تم نے دہلی میں دیکھا ہوگا، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد وغیرہ وغیرہ۔''

''یہاں کی قدیم تعمیرات کیا ہیں؟ وہ دکھاؤ۔'' ٹروڈ اکتا کر بولا۔

''ہمارے سندھ میں پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کے آثار ہیں۔'' سیف کو اس کی اکتاہٹ بری لگی۔

''کراچی میں ہیں وہ آثار؟'' وہ تو سچ مچ اچھل

پڑا۔

''بس کراچی سے تھوڑا آگے ہیں، لانڑکانہ کے قریب، موئن جو دڑو کے کھنڈرات۔'' سیف نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''تم لوگ کہو تو وہاں کا پروگرام بنا لیتے ہیں، دکھلاؤں گا تم سب کو۔''

''ابھی جہاں ہو، وہاں کی بات کرو۔'' گیت نے مداخلت کی۔

''اچھا، یہ لو، یہ ڈینسو ہال ہے۔'' زرد پتھروں سے بنی مخصوص طرز تعمیر اور بناوٹ لیے اس عمارت کو سب نے دلچسپی سے دیکھا۔

''یہ انگریزوں نے بنائی تھی، لائبریری تھی ان کی۔''

''یہ فریئر ہال، نوکیلے مینار اور مخروطی چھت والی عمارت۔ انگریزی حکومت کا فلاحی مرکز تھی۔''

''خالق دینا، جہاں مولانا محمد علی جوہر پہ مقدمہ چلایا گیا تھا۔''

''سندھ مدرسہ السلام کی محرابوں والی آن بان شان رکھتی عمارت، قائداعظم سمیت متعدد رہنماؤں اور مشہور شخصیات کو ابتدائی درس گاہ۔

''جودھ پوری پتھروں سے بنی ایمپریس مارکیٹ، میری ویدر کلاک ٹاور، چرچ، موہاٹہ پیلیس نام کا خوب صورت محل، جواب میوزیم ہے۔

اسٹاف فلیگ ہاؤس جہاں قاعداعظم رہے تھے۔

پھر سیف کی گاڑی کا رخ آئی آئی چندریگر روڈ کی طرف ہوا۔

یہ سڑک یہاں کی وال اسٹریٹ سمجھ لو۔'' سیف نے انہیں بتایا، ملک کے مشہور اور بڑے اخبار کا دفتر۔ اشاعتی ادارہ دکھانے کے بعد اس نے وہ منفرد گول عمارت دکھائی، جس وقت یہ تعمیر ہوئی ایشیاء کی سب سے بلند عمارت تھی 1963ء میں حبیب بنک پلازہ۔''

پھر وہ انہیں لے کر کھارادر پہنچ گیا، وزیر مینشن بلڈنگ، قائداعظم کی جائے پیدائش یہاں کی عمارتوں، سڑکوں، گلیوں اور راستوں میں قدامت کی بو باس رچی ہوئی تھی۔ ''کھارادر، میٹھادر اور ان کے آس پاس کے علاقے کراچی کے قدیم علاقے ہیں، سیف نے پورا دن لگا کر سب کچھ دکھا دیا۔

اگلے دو دن میں سیف نے قابل ذکر مقامات دکھا ہی دیے، مگر فرینک بڑا ہی غیر مطمئن بندہ تھا، روم اور بھارت کی سیر کرنے کے بعد وہ ہزار، پانچ سو سال سے کم کسی تعمیر یا کھنڈر کو قدیم مانتا ہی نہ تھا۔

''میرے پیارے بھائی، یہ جو میرا پیارا شہر کراچی آپ نے دیکھا جہاں اب انسانوں، گاڑیوں اور مشینوں کی کثرت ہے، اب سے ڈھائی تین سو سال پہلے مچھیروں کی چھوٹی سی بستی تھی، ہمارے مغل حکمران لاہور سے آگے بڑھے تو ٹھٹھہ آ کے رک گئے، شاہجہانی مسجد تعمیر کر کے واپس لوٹ گئے، یہاں تک نہ کوئی آیا نہ کسی نے کچھ بنایا، یہ تو خدا بھلا کرے انگریزوں نے 1839ء میں سندھ پہ قبضہ یا فتح کرنے کے بعد ڈیڑھ دو درجن تعمیرات کر دی تھیں ورنہ تو 1947ء کے بعد کی تعمیرات ہی پر گزارہ کرنا پڑتا، ویسے ہمارے ہاں ہزاروں برس پرانی ایک شے ہے جسے تم یقیناً پسند کرو گے۔'' بہت پیار سے فرینک کو سمجھاتے ہوئے سیف نے آخر میں دعویٰ کیا۔

''کیا ہے؟'' سب ہی چونکے۔

''سمندر، ہمارے پاس صدیوں پرانا بحیرہ عرب ہے، کل دکھلاتا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں کلفٹن کا سمندر۔'' ایما نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔

''وہاں سمندر کہاں ہے، اب تو سیوریج کا پانی ہے۔'' سیف نے تاسف سے سوچا۔

''ہم تمہیں ہاکس بے، سینڈز پٹ یا گڈانی دکھائیں گے۔'' سیف نے اعلان کیا۔

☆☆☆

''سیف! ایک بات بتا سچ سچ۔'' ہنڈیا بھونتی ہوئی امی نے بیٹے کو تفتیشی نگاہوں سے گھورا۔

''ہوں۔'' اس کی توجہ امی اور ان کی تفتیش سے

زیادہ گاجر اور کھیرے کے ٹکڑوں پہ تھی جنہیں وہ اٹھا اٹھا کر منہ میں رکھ رہا تھا۔

''اس لڑکی کو تو نے روکا ہے یہاں یا بڑے میاں نے؟''

''نہ میں نے روکا ہے نہ داجی نے، قسمت لے آئی ہے یہاں۔''

''قسمت پہ ڈال دو سب کچھ، یہ آسان طریقہ ہے۔'' انہوں نے ہنڈیا میں تھوڑا سا پانی ڈالا۔

''پھر کس پہ الزام رکھیں پیاری امی جان! ہم پہ تو بلاوجہ کی تہمت ہے مختاری کی، ڈوریاں تو کسی اور کے ہاتھ میں ہیں، وہ اپنی مرضی سے ہلاتا رہتا ہے۔''

''سیف! یہ کتابی زبان میرے سامنے نہ استعمال کیا کر، مجھے الجھن ہوتی ہے ان مشکل مشکل باتوں سے، میری بات کا سیدھا سیدھا جواب دینا ہے تو دے۔'' امی کی توجہ ہنڈیا پر بھی تھی اور بیٹے پر بھی۔

''روکا تو داجی نے ہے مگر میری بھی خواہش تھی۔'' سیف نے امی کے سامنے سچ اگل دیا۔

''پوتے کس کے ہو، ان ہی کے نقش قدم پہ چلو گے۔'' انہوں نے چولہے کی آنچ دھیمی کی۔

''کون جانے کس کے نقش قدم ہوتے ہیں جن پہ ہم چلتے ہیں، انسانوں کے یا محبت کے؟ دنیا کا سب سے قدیم راز، جو دلوں پہ کب اور کیسے الہام ہو جاتا ہے؟ سمجھ سے باہر ہے۔'' سیف نے گاجر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

''اتنا فلسفہ لڑکی کے سامنے بولو گے تو بھاگ لے گی اٹھ کر۔''

''وہ مجھ سے زیادہ گاڑھا اور مشکل فلسفہ بولتی ہے امی جان!'' سیف نے انکشاف کیا تو وہ مسکرانے لگیں۔

''شکر ہے اونٹ، پہاڑ کے نیچے آیا، سیر کو سوا سیر تو ملا۔''

''اس سے پہلے کہ میری مزید کھنچائی ہو مجھے نکل لینا چاہیے۔'' سیف بڑی شرافت اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ہوا میں خنکی تھی، سرد ہوا نے دھیرے سے آ کر شرارت سے اس کے بال بکھیرے، گیت نے چونک کر جھرجھری لی۔

''موسم تبدیل ہو گیا ہے، تم نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا۔'' سیف کو آج خود بھی سردی محسوس ہو رہی تھی۔

''دو چار دن پہلے تک تو گرمی ہو رہی تھی، اب یکا یک ٹھنڈی ہوائیں چل پڑیں۔'' گیت نے اپنے بال سمیٹ کر ایک طرف کیے اسے بے اختیار اپنا پہلا دن یاد آیا جب وہ اس گھر میں آئی تھی۔

''کراچی کا موسم ایسے ہی بدلتا ہے، صبح کچھ، دوپہر میں کچھ اور شام میں کچھ اور۔'' سیف نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''لوگ بھی ایسے ہی ہوں گے یہاں کے؟'' گیت نے اس پہ چوٹ کی۔

''کم از کم میں تو نہیں ہوں۔'' سیف نے اٹھ کر اپنی جیکٹ اتاری اور اس کے شانوں پہ ڈال دی۔

''اسے ٹھیک سے پہن لو، تمہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔''

''میں بہت ٹھنڈے مقام سے آئی ہوں، یہ ذرا سی سرد ہوا میرا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' گیت نے بولتے بولتے ہی ایک زوردار چھینک ماری تھی۔

''سنتی نہیں ہو نا کسی کی، اپنی من مانی کرتی ہو۔''

''اپنی من مانی تو میں بالکل بھی نہیں کرنا چاہتی۔'' گیت نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

''کیسے لگ رہے ہو تم کلین شیو ہو کر۔ بالکل چھلے ہوئے مرغے۔''

''اچھا اور پہلے کون سا مرغا لگتا تھا؟'' سیف کو اپنی شان میں کی گئی یہ گستاخی کچھ زیادہ پسند نہیں آئی، تھوڑا سا بھنا گیا۔

''کچھ معقول قسم کے مرغے لگتے تھے، مجھے

دھوکا دینے کے لیے تم نے یہ شیو کی تھی نا، میں سچ مچ تمہیں پہچان نہیں سکی۔"

"دراصل تمہارے ذہن میں کہیں یہ خدشہ موجود نہیں تھا کہ تمہارا دوست تمہیں اس گھر میں ملے گا، اس لیے بھی تم نے زیادہ دھیان نہیں دیا مجھ پر۔"

"شاید!" گیت کچھ بولنے لگی تھی کہ دوسری چھینک آ گئی۔

"دیکھو یا تو تم یہ جیکٹ پہنو یا نیچے چلو۔"

"یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے، میں یہ جیکٹ پہن لیتی ہوں۔" گیت نے دوسرا آپشن قبول کرتے ہوئے جیکٹ پہن لی۔

"یہ بھی پہنو۔" جیکٹ کا ہڈ سیف نے اس کے سر پہ رکھا۔

"سیف!" گیت نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "محبت کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

"یہ تلقین مجھے کر رہی ہو یا خود کو۔" وہ بے اختیار ہنسا تھا۔

"تمہیں۔" اس کے یوں ہنسنے پر گیت کے چہرے پہ خفگی سج گئی۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہارا اتنا فرماں بردار ہوں؟"

"تمہیں عقل سے کام لینا چاہیے۔"

"ہمارے قومی شاعر نے منع کیا ہے۔" سیف نے مزے سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" گیت نے آنکھیں جھپکائیں سیف کا جواب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"ہمارے جو شاعر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انسان کو عقل کے بجائے دل کے کہنے پہ چلنا چاہیے۔ وہ عشق اور دل کو عقل سے پہلے اور آگے رکھتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"عقل نفع نقصان دیکھتی ہے، عشق نہیں دیکھتا، نہ ہی دل۔" سیف نے وضاحت کی۔

"دل سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہے دنیا میں، جو اس کے پیچھے چلتے ہیں، وہ بھی۔"

"گیت!" سیف نے کچھ کہنا چاہا مگر گیت نے اسے روک دیا۔

"سیف پلیز، میں نہیں چاہتی کہ اب ایک اور نئی کہانی جنم لے۔" گیت کے خوب صورت چہرے پہ اضطراب تھا۔

"مگر دنیا میں کوئی بھی کہانی نئی کب ہوتی ہے؟" سیف رخ موڑ کر پوری طرح گیت کے سامنے تھا۔

اس کے چہرے پہ، لہجے میں نرمی تھی اور آنکھوں میں ایسی چمک جیسی آج کی سیاہ رات میں آسمان پہ چمکتے ستارے، گیت مسمرائز سی اسے دیکھ اور سن رہی تھی۔

"چند ہی کہانیاں ہیں دنیا میں، جو بار بار دہرائی جاتی ہیں، ہر بار نئے ڈھنگ نئے انداز سے لکھی جاتی ہیں۔ دنیا میں اب تک جتنی بھی کہانیاں لکھی گئی ہیں ان میں خدا ہے، شیطان ہے، انسان ہے، محبت ہے، نفرت ہے، وصل ہے، جدائی ہے اور ہم ہیں۔"

"ہم؟" محویت سے سنتی گیت چونک پڑی۔

"میں اور تم، اس کے بغیر کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔"

"تم پھر مجھے لفظوں میں الجھا رہے ہو۔" گیت نے سر جھٹک کر جیسے خود کو کسی سحر سے آزاد کیا تھا۔

"محبت ایک چار حرفی لفظ ہی تو ہے، مگر کبھی پوری زندگی بن جاتا ہے۔"

"تم بار بار میرے سامنے محبت کا نام مت لیا کرو۔" گیت بڑی مشکل سے چہرے پہ بے زاری لے کر آئی۔

"کیوں؟"

"مجھے چڑ ہے اس لفظ سے بھی اور اس....."

"ہم دنیا میں دوسرے انسانوں، چیزوں اور جذبوں سے بھاگ سکتے ہیں مگر اپنے آپ سے نہیں، خود کو مت جھٹلاؤ، تم یہاں نہیں آئی تھیں، تب سے ہی میری ساتھ تھیں اپنے خوابوں میں۔" سیف نے دعویٰ یونہی نہیں کیا تھا۔ "ادھوری ادھوری باتوں سے

بھی کبھی ایک پوری کہانی بن جاتی ہے۔"

"وہ تم نہیں تھے، ریاست علی کے پوتے، وہ میرا دوست تھا، سب سے اچھا دوست، اگر مجھے ہوتا کہ میں یہاں آ کر ایک سچے اور مخلص دوست کو کھودوں گی تو کبھی یہاں نہیں آتی۔"

دل کی بے بسی اور آنکھوں کی نمی، گیت کی آواز میں گھل گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے شک وہ خود سے فرار حاصل نہیں کر سکتی تھی مگر سیف سے تو دور جا سکتی تھی۔

"ایک بار قریب آنے کے بعد کوئی دور نہیں جاتا، جا ہی نہیں سکتا۔" سیف نے اسے اپنے آگے سے گزر کر سیڑھیوں کے پاس جاتے ہوئے دیکھا تو بلند آواز میں بولا۔

"مگر میں چلی جاؤں گی۔" گیت نے خود کو سنبھال کر بہت مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

☆☆☆

جاذبیت سمیٹے سانولی رنگت، اب قدرے سیاہی میں بدل گئی تھی۔ پرکشش نقوش کی خوب صورتی، بیماری، کمزوری اور بڑھاپے نے چھین لی تھی۔ امنگوں، آرزوؤں سے بھرا دل اب بجھ کر راکھ ہو رہا تھا۔ توانا، پرشباب جسم کی رعنائیاں نمک کا ایسا ڈھیر بن گئی تھیں جو پانی میں پڑا ہوا ہو، گھل کر ختم ہونے میں بس تھوڑی دیر ہو یا کچھ دیر۔

گیت کے سپید موی انگلیوں والے ہاتھ میں، ابھری ہوئی رگوں والا وہ استخوانی ہاتھ بہت عجیب لگ رہا تھا مگر گیت کو نہیں، ان ہاتھوں میں اس کی ماں کا بچپن، اس کا لمس، خوشبو، ہنسی، بہت کچھ محفوظ تھا۔

"میں نے خود سے وابستہ تمام لوگوں کو بہت دکھ دیے، کسی کو خوشی نہیں رکھ سکا، نہ کوئی خوشی دے سکا۔" ریاست علی کمزور آواز میں بول رہے تھے۔

"شاید، یہ سب یونہی ہونا لکھا تھا۔" گیت نے سیف کے الفاظ یونہی ان کی تسلی کے لیے کہے، جن پر وہ خود بھی زیادہ یقین نہیں رکھتی تھی۔

"نہیں، ہم اپنی غلطیوں کو قسمت کے ذمے ڈال کر بری نہیں ہو سکتے۔" ریاست علی نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر مزید کہا۔

"تم نہیں جانتی ہو، نہیں سمجھ سکتی ہو، جب انسان لاچاری اور بے بسی کے عالم میں اپنی زندگی کا چراغ، اپنی آنکھوں کے سامنے بجھتا ہوا دیکھ رہا ہو تو کیسے اس کی پوری زندگی، اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہے، اگر اس میں پشیمانی کے لمحات زیادہ ہوں تو مرنے سے پہلے ہی انسان مرنے لگتا ہے۔"

ریاست علی نے بے حد خوف زدہ اور بے بس نگاہوں سے گیت کو دیکھا۔

"میرا گزرا وقت، میرا وقت آنے سے پہلے ہی مجھے مار ڈالے گا۔"

"آپ اتنا نہ سوچا کریں آپ کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"میرا کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں ہے، نہ میرا جسم، نہ میرا ذہن، میں لاکھ چاہوں مگر خیالات مجھے خود ہی جکڑ لیتے ہیں، میرے لیے ناممکن ہے ان سوچوں کی گرفت سے رہائی پانا۔"

"آپ مجھے ممی کے بارے میں بتائیں، جب آپ نے پہلی بار ان کے لیے ڈوگی خریدا۔" گیت نے موضوع بدلا۔

"ہاں، سارہ نے گفٹ کیا تھا اسے، بالوں والا پوڈل، جس کا منہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کہاں ہے۔" ریاست کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔

"اور ماریہ نے اعلان کیا کہ وہ اس کا نام ڈیڈ رکھے گی کیونکہ وہ ڈیڈ جتنا ہی کیوٹ ہے۔" ریاست نے مسکرانے کی کوشش کی مگر جانے کیوں مسکرا نہ سکے۔

"میں نے اسے قرآن پڑھوایا، نماز، کلمے، دعائیں سکھائیں اور یاد کروائیں، وہ بہت شوق اور دلچسپی سے سیکھتی تھی۔ سارہ نے اسے سوئمنگ سکھائی تھی اور وہ پانی سے باہر آنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا، خوش رکھنا چاہتا تھا، میں نے بہت بڑی خطا کی، میں....."

ریاست کی ذہنی رو پھر بہک گئی۔
''ممی کا اسکول میں پہلا دن، کیسا تھا، جب آپ چھٹی ہونے تک کلاس کے باہر بیٹھے رہے؟'' گیت نے پھر ان کا دھیان بٹایا۔
''اسی شرط پہ وہ کلاس میں بیٹھی تھی۔'' ریاست نے بولتے ہوئے بدقت اپنا چہرہ گیت کی طرف کیا۔
''تم نے تو مجھے معاف کر دیا ہے نا؟''
''مجھے تو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' گیت نے ایک بار پھر انہیں تسلی دی۔
''تم ماریہ کی طرح معصوم ہو، گناہ گار کی اولاد معصوم اور مظلوم ہو تو گناہوں کا بوجھ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔''
''آپ......!'' گیت نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی کہ سیف اندر آ گیا۔
''تمہارا فون خراب ہے یا سائلنٹ ہے؟ تمہارے دوستوں کا فون آیا ہے میرے پاس، زوار کی مہندی میں کب تک جاؤ گی؟''
''میں کال کرلوں گی ان لوگوں کو۔'' گیت نے رخ موڑے بغیر جواب دیا۔

☆☆☆

روایتی ہلے گلے والی پاکستانی شادی وہ پہلی بار اٹینڈ کر رہی تھی، شادی کی ساری شاپنگ کراچی کے ایک جدید مال سے کی تھی، یہاں کے فیشن اور ٹرینڈ کے حساب سے آج کے دن کے لیے تینوں لڑکیوں نے غرارہ سوٹ منتخب کیے تھے۔
لڑکے کرتا شلوار میں تھے۔ زوار کے خصوصی دوستوں کی وجہ سے ان کی بے حد آؤ بھگت کی جارہی تھی اور خصوصی پروٹوکول دیا جا رہا تھا جسے وہ سب ہی خوب انجوائے کر رہے تھے۔
گیت البتہ کچھ پریشان اور کھوئی کھوئی تھی، اگرچہ وہ مسکرا مسکرا کر سب سے گھلنے ملنے اور باتیں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''تم کچھ ڈسٹرب ہو؟ فرینک کی زیرک نگاہوں سے گیت کا بھید چھپا نہ رہ سکا۔ ''نہیں تو۔
''میں پوچھ نہیں رہا تم سے، بتا رہا ہوں، تم پریشان لگ رہی ہو، یہاں ہو مگر یہاں نہیں ہو۔'' فرینک نے چند لفظوں میں اس کا مکمل اور بھرپور تجزیہ کیا تھا۔
''نانا کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی مجھے، میں آنا نہیں چاہتی تھی یہاں مگر سیف نے مجبور کر کے بھیج دیا۔''
گیت نے اپنے اردگرد پھیلے رنگ و روشنیوں اور خوشبوؤں کے ماحول کو دیکھا، سب کچھ بہت پرکشش تھا پھر بھی اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
''وہ اپنے حصے کی زندگی جی چکے ہیں۔ اب آگے جو کچھ ہے وہ قدرت کا فیصلہ اور فطرت کا قانون ہے۔ ویسے یہاں آنے سے پہلے تم نے کبھی ذکر نہیں کیا ان کا۔'' فرینک نے اپنی ازلی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
''ارے گیت! تم یہاں اکیلی کھڑی کیا کر رہی، آؤ نا زوار بلا رہا ہے۔'' ایما اسے بلانے آئی تھی۔
''چلو۔'' گیت نے فرینک کے تبصرے کا جواب دیے بغیر ایما کا ہاتھ تھاما۔
''گیت!'' فرینک نے یکدم ہی پکارا...... وہ مڑی۔
''تمہیں یقین ہے کہ تم اسی وجہ سے پریشان ہو، اپنے نانا کی وجہ سے؟''
''ہاں!'' گیت نے وہ جواب دیا جس پر اسے یقین نہیں تھا اور فرینک کو بھی نہیں آیا۔
''یہ میری زندگی کا یادگار فنکشن ہے۔ میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی اسے۔'' ایما بہت پرجوش ہو کر زوار کو بتا رہی تھی۔
''یہ تو شروعات ہے بارات اور ولیمے میں اس سے زیادہ انجوائے کرو گی۔'' زوار زور سے ہنسا۔ زندگی اور خوشی سے بھرپور ہنسی، جو اس کے چہرے کا مستقل حصہ بنی ہوئی تھی۔
''یہ جو تمہارے ہاں پورے خاندان، رشتے داروں اور دوستوں کی اٹیچ منٹ ہے نا یہ بہت

زبردست بات ہے، مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔" ایما نے مزید سراہا۔

"کیا ہوا گیت، تم بہت خاموش ہو؟" زوار اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں، بس وہ....." گیت سے کوئی وجہ بتائی نہ گئی۔

"تمہارے نانا ٹھیک ہو جائیں گے، گاڈ بلیس ہم۔" زوار نے اس کی پریشانی کی وجہ خود ہی سمجھ کر اسے تسلی دی۔ اسے کسی نے آواز دی تو وہ وہاں چلا گیا، گیت نے ایما کی طرف دیکھا۔

"کیا میں بہت فکرمند لگ رہی ہوں؟"

"ہاں، کچھ کچھ لگ تو رہی ہو۔" ایما نے اب غور سے اسے دیکھا۔ اپنے دوستوں کو تو کئی برسوں سے دیکھ ہی رہی تھی۔ لہذا آج اس کی تمام تر توجہ نئے مناظر اور نئے لوگوں پر تھی۔

"چہرے کو آئینہ نہیں بننا چاہیے، جس کا جی چاہے عکس دیکھ لے نہ کھلی کتاب کہ جو دیکھے، پڑھ لے، گیت کی الجھن اور بڑھ گئی، کبیر کا فون آیا تو وہ ایک نسبتاً الگ تھلگ نیم روشن گوشے میں بیٹھ گئی۔

"تم ٹھیک ہو نا گیت؟" ہر دوسرے روز بات ہوتی تھی دونوں کی اور ہر بار سب سے پہلا سوال، کبیر یہی کرتا تھا۔

"ڈیڈ! میں شدید مشکل میں ہوں۔" گیت بے حد نازک لڑکی تھی، اکیلے بہت سارا بوجھ اٹھانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

"کیا ہوا؟" کبیر پہلے چونکا پھر فکرمند ہو گیا۔

"میں کھو گئی ہوں، راستہ گم ہو گیا ہے مجھ سے۔"

"راستے موجود ہوتے ہیں، بس ڈھونڈنے پڑتے ہیں، تمہیں کمزور نہیں، بہادری دکھانی چاہیے۔" کبیر ہر بات سے باخبر تھا۔ گیت اپنی ایک ایک بات اس سے شیئر کرتی تھی۔

"بہادر بننے سے کیا ہوگا؟ مجھے کوئی تمغہ نہیں چاہیے۔ نہ کوئی اعزاز۔" وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح ناراض ہو رہی تھی۔ سب سے خفا ہو رہی تھی، جس کے پسندیدہ کھلونے اور اشیاء اس کے سامنے ہوں مگر انہیں ہاتھ لگانے کی ممانعت ہو، وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو پلکوں کی دہلیز پہ بیٹھے اجازت کے منتظر تھے۔

"وقت، انسان، کہانیاں، جذبے یہ سب لوٹ لوٹ کر ہر بار واپس کیوں آتے ہیں؟" گیت کا دماغ سوالوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ ٹپے کھاتی گیندوں کی طرح ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر اچھل رہے تھے مگر جوابوں کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔

"اگر محبت ہے تو جرات سے آگے قدم بڑھاؤ، ورنہ واپس آ جاؤ، دنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے، ایک ہی شخص پہ ختم نہیں ہوتی۔"

کبیر دو جمع دو چار کرنے والا بزنس مین تھا، رسک لے کر جرات مندانہ فیصلے کرنے کا عادی تذبذب میں وقت گزارنے کا قائل تھا نہ زندگی۔

"دنیا کا سب سے زہریلا لفظ لگتا ہے یہ، محبت انسان کو مار دیتی ہے ڈیڈ۔" گیت نے دانت پیس کر کہتے ہوئے شکایت کی ہو جیسے۔

"محبت زندگی بھی عطا کرتی ہے، جینے کا، آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔" کبیر نے اس سے اختلاف کیا۔

"میں نے تو نہیں دیکھا۔" گیت بولتے بولتے جھنجھلا گئی، ایک تو یہ سیف، اس کی پانچویں کال آ رہی تھی، گیت نے پھر اسے نظر انداز کیا۔

"گیت!" پیٹریشیا کی آواز پہ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"سیف کا فون آیا تھا ابھی میرے پاس، وہ تمہیں لینے آ رہا ہے۔"

"کیوں؟" اس کے چہرے پہ غیر معمولی تاثر دیکھ کر گیت کا دل انہونی کے خیال سے دھڑک اٹھا مگر انہونی اب ہونی بن چکی تھی، پیٹریشیا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے گیت کا ہاتھ اپنی نرم گرفت میں لیا اور ویسے ہی نرمی سے بولی۔

"گرینڈ فادر گزر گئے ہیں۔"

☆☆☆

پرکشش نقوش والا سانولا چہرہ، گھنے چمکدار بال ایک طرف سے ماتھے پہ گرے ہوئے، اپنے دور کا مشہور و معروف ہیئر اسٹائل، ہلکی سی مسکراہٹ سفید چمکدار دانتوں کی ایک جھلک دکھلا رہی تھی۔ گیت نے اس چہرے پہ انگلیاں پھیرنی چاہیں۔

اس کا ہاتھ شیشے کی سرد سطح سے ٹکرایا۔ فریم میں لگی، ریاست علی کی اوائل جوانی کی تصویر، اس نے سیف کی اجازت سے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ تصویر کو اپنے بیگ میں رکھ کر وہ باہر آ گئی، کمرے سے باہر، پھر گیٹ سے باہر، ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

باہر نکلی تو اندازہ ہوا کاٹن کا سوٹ سردی روکنے میں ناکام تھا۔ چلتے چلتے جب تک وہ قریبی پارک میں پہنچی، سرد ہوا سے اس کے ہاتھ اور چہرہ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بالوں کو کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دیے اور بنچ پہ بیٹھ گئی، سہ پہر کا سورج اپنی بچی کھچی تمازت لٹا رہا تھا۔

سرد ہوا اس کے آڑے آ رہی تھی۔ بنچ کی ٹھنڈی سطح پہ بیٹھتے ہوئے ایک لمحے کو وہ سمٹ گئی پھر چند لمحوں بعد ٹھنڈ کے سارے احساسات ختم ہو گئے، شائد اندر کی تپش بہت زیادہ تھی۔

''بہت ضدی لڑکی ہو، مجھے پہلے اندازہ نہیں تھا۔'' سیف کی آواز کے ساتھ ہی ایک گرم شال اس کے کاندھے پہ پڑی۔

''تم کیا ہر وقت میرا پیچھا کرتے رہتے ہو؟'' گیت پھر چڑچڑی ہوئی۔

''جو میرے دل میں رہتے ہیں، ان پہ نظر رکھتا ہوں۔'' اس کے قریب بیٹھا ہوا بے حد اطمینان سے بول رہا تھا۔

''میں اس وقت تنہائی چاہتی ہوں۔''

''خود کو تنہا ہی تو کیا ہوا ہے تم نے، اب اور کتنی تنہائی چاہیے۔''

''سیف! کیا تم بند گلی سے نکلنے کا راستہ جانتے ہو؟'' گیت نے مدد طلب نگاہوں سے اسے دیکھا

بس ایسی ہی ہو رہی تھی آج کل وہ پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔

''میرا ہاتھ تھام لو، ہر بند گلی سے باہر لے جاؤں گا۔'' سیف نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''خوف زدہ بڑھے ہوئے ہاتھ تھامنے کی جرات نہیں رکھتے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم خوف زدہ نہیں ہو، مجبور ہو، محبت سے بڑی مجبوری کوئی نہیں، یہ انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔'' سیف اس کے ہمراہ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہر وقت محبت محبت مت کیا کرو میں چلی جاؤں گی کل پھر واپس نہیں آؤں گی۔'' وہ جھنجھلا کر اس پر برس پڑی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا گیت، یہ سب فیصلے کوئی اور کرتا، میں نے تو صرف محبت کی ہے تمہیں یہاں تک کوئی اور لایا ہے، واپس چلی بھی جاؤ گی تو وہ دوبارہ لے آئے گا۔'' سیف نے دعویٰ کیا۔

''نہ میں محبت پہ یقین رکھتی ہوں نہ قسمت پہ۔'' بے لچک لہجے میں بولتی ہوئی وہ چلے جا رہی تھی۔

''کسی شے پہ یقین نہ رکھنا اس کی عدم موجودگی کو ثابت نہیں کرتا اس دنیا میں بہت سے لوگ خدا پہ یقین نہیں رکھتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا موجود نہیں، ویسے تم ڈرائیو کرتے ہوئے سوچا کرو، میرے بارے میں بھی اور محبت کے بارے میں بھی اس وقت تمہیں جو خیالات آتے ہیں، خاصے معقول ہوتے ہیں۔''

پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ گھسائے وہ کسی طرح ہار ماننے پہ آمادہ نہیں تھا۔

''خراب یادداشت بھی ایک بڑی نعمت ہے اسے ہر بات کیوں یاد رہتی ہے میری؟ گیت نے اسے دیکھا جسے نہ دیکھنے کے لیے وہ اپنے دل کو منانے کے جتن کر رہی تھی۔

اس نے ہی تو ایک روز سیف کو بتایا تھا کہ خدا کی یکتائی کے بارے میں اسے ڈرائیو کرتے ہوئے خیال آیا تھا اور پھر مزید سوچتے سوچتے یہ خیال پختہ

ہو گیا تھا، ایک گاڑی کو ایک ہی ڈرائیور درست سمت میں چلا سکتا ہے ایک سے زیادہ ڈرائیور ہوں تو سفر اور منزل کھوٹے ہو جاتے ہیں، سواریوں کی خیریت نہیں ہوتی، اتنی بڑی کائنات کا نظم و نسق، ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے، تبھی سارا انتظام بخیر و خوبی اور حسن و کمال کے ساتھ چل رہا ہے۔"

"تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔" تھک ہار کر خود کو بہادر ثابت کرنے کے لیے اس نے سیف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"اور تم زندگی اپنی بھی میری بھی۔"

سیف کی آنکھوں میں کرب تھا لہجے میں بھی، چہرے پر بھی اور آواز میں بھی، وہ اندر چلا گیا، پھر اس نے گیت سے کچھ نہیں کہا، نہ رات میں، جب وہ اپنا بیگ تیار کر رہی تھی، نہ صبح ناشتے کی میز پر، جب امی نے اس سے کہا کہ۔

"پھر کب آؤ گی۔" تو گیت نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

"دیکھوں گی اگر وقت ملا تو، ویسے بھی زندگی بہت مصروف ہے۔"

اور سیف اس وقت بھی خاموش رہا جب وہ سب سے الوداعی گلے مل کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہاری ہر مہربانی کا شکریہ۔" سیف نے سر خم کر کے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ قبول کیا اور اب بھی خاموش رہا، وگرنہ جب گیت کے باقی دوستوں نے اس کی مہمان نوازی کا گرم جوشی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا شہر بھی اچھا ہے اور یہاں کے لوگ بھی، بس ذرا صفائی....."

تب سیف نے ہنس کر کہا تھا۔

"یہ شہر بیک وقت ایک ماں کی طرح سب کو اپنی آغوش میں سمیٹنے والا بھی ہے اور ایک تھوڑے بگڑے مگر لاڈلے بچے کی طرح پیارا بھی ہے۔ اپنے تمام تر مسائل کے باوجود ہمیں عزیز ہے۔ ہم خود اس میں چاہے کتنے کیڑے نکال لیں مگر کسی اور سے اس کی برائی برداشت نہیں ہوتی، رہے مسائل تو کبھی نہ کبھی حل ہو ہی جائیں گے۔"

مگر وہ اس وقت چپ ہی رہا، گیت چلی گئی، اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ جن کی واپسی کا یقین ہو، وہ انہیں الوداع کہنے پہ یقین نہیں رکھتا تھا۔

☆☆☆

کسی بھی جگہ تفریح کے لیے سب کا اصول ایک ہی تھا، عوامی سواری، عوامی کھابے اور ڈھابے سو اپنے اصول پر عمل کرتے ہوئے چھک چھک کرتی ٹرین میں سوار تھے، دیسی اور بدیسی دونوں اقسام کے مسافر حیرت اور دلچسپی سے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

دریائے سندھ کے میٹھے پانیوں سے سیراب سرسبز کھیتوں کو انہماک سے دیکھ کر فرینک اب اسی انہماک سے گیت کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو آئینہ بھی بن چکا تھا اور کھلی کتاب بھی۔

سیف اور گیت کے درمیان جو بھی کیمسٹری تھی جو تعلق تھا، وہ ان دونوں کے بغیر بتائے بھی سب کی نظروں میں آ چکا تھا۔ ماضی کی داستان سے واقف نہیں تھے وہ سب، مگر اتنا ضرور سمجھ چکے تھے کہ دونوں میں ان کہا سا ایک بندھن بھی ہے اور گریز اور تناؤ بھی۔

"جتنا تم آگے کی طرف سفر کر رہی ہو، تمہارا دل شاید اتنا ہی فاصلہ پیچھے کی طرف طے کر رہا ہے۔"

فرینک نے جھک کر گیت کو مخاطب کیا، جو اس جرات پہ اسے گھور رہی تھی مگر اس کا دل تو تسلیم کر چکا تھا جو سیف نے کہا تھا کہ۔ "ماضی کی داستانوں پہ مستقبل کی خوشیاں قربان نہیں کی جا سکتیں۔"

اور اسے یہ بھی آگہی ہو رہی تھی کہ اسے واپس جانا ہی پڑے گا۔

سیف کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کیونکہ وہ خود کو وہاں چھوڑ آئی تھی۔

حنا بشریٰ

ایک کروڑ

''مبارک ہو، آپ کا نور بناسپتی گھی بنانے والوں کی طرف سے ''ایک کروڑ'' کا انعام نکلا ہے!''

ایسی خبر کہ سمیرا کو لگا اس کا منہ ''موتی چور'' کے لڈوؤں سے بھر دیا گیا ہے۔ سماعتیں بے یقین، آنکھیں پھٹی کی پھٹی۔ اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''کک..... کیا؟.....؟؟'' نا جانے کیسے وہ یہ خبر سن کر اپنی خوشی سے بھرپور چیخ کو روک پائی تھی۔ مگر لرزتی آواز اس سے خوشی کی غماز بن گئی تھی۔ آواز تو کیا بلکہ اس کا پورا وجود ہی جوش میں لرز رہا تھا۔

اسے اپنے کانوں پر ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ من پگلا بھنورا بنا سارے گلشن کا ایک چکر لگا آیا تھا۔ ہر کلی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، اور ہر گل کا بوسہ لے آیا تھا۔

''جی محترمہ..... آپ کا ''ایک کروڑ'' کا انعام نکلا ہے!''

اس شخص نے جوشیلے انداز میں دوبارہ سے خبر سنائی تو سمیرا بس بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ بہت حسین سا خواب دیکھ رہی

ہے۔ تصدیق کے لیے اپنی کلائی پر چٹکی بھری تو منہ سے نکلتی ''ہائے'' کو بمشکل دانتوں میں دبا کر روکا تھا مگر آنکھوں میں آئے خوشی کے آنسوؤں کو روک نہ پائی۔

''ایک کروڑ..... آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟'' لرزتی آواز پر قابو پاتے ہوئے سمیرا نے فون کے دوسری جانب مخاطب شخص سے پوچھا تھا۔ یقین تو سمیرا کو آ ہی گیا تھا۔ تصدیق کے لیے سوال پوچھ کر وہ خود کو سنبھال رہی تھی اور دل کو بھی۔

''جی محترمہ..... اور وہ بھی نقد!''

''ایک اور دھماکے دار خبر..... یعنی رقم ہاتھ کے ہاتھ نقد.....!''

''مطلب ''فوری کے فوری''..... ''نہ چیک'' کا جھنجھٹ اور نہ ہی مہینہ دو مہینہ انتظار کے بعد رقم اکاؤنٹ میں منتقلی کا مسئلہ.....

سمیرا کی تو جیسے باچھیں ہی کھل گئیں۔ کیونکہ اس کا نہ تو ذاتی اکاؤنٹ تھا۔ اور نہ ہی کبھی ''چیک بک'' پہ دستخط کر کے رقم وصول کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

وہ ہاؤس وائف تھی۔ گھر حماد کی کمائی سے چلتا تھا۔ جو ایک سرکاری ملازم تھا۔ نیا نیا بینک میں ملازم ہوا تھا سو ابھی تنخواہ معقول تھی مگر بہت زیادہ نہیں تھی۔ اس تنخواہ میں بھی وہ بہت اچھے طریقے سے گھر کا انتظام وانصرام دیکھ رہا تھا۔ صابر وشاکر سا انسان تھا۔ کچھ خرچ بھی کر لیتا اور تھوڑا بہت بچا کر جمع بھی کر لیا کرتا تھا۔ تاکہ مشکل وقت میں کام آ سکے۔ اپنی استطاعت کے مطابق کچھ جیب خرچ سمیرا کے ہاتھ پہ بھی رکھ دیا کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کرتا کہ۔

''فضول خرچی انسان کو سوائے پریشانی کے اور کچھ نہیں دیتی!''

کسی حد تک تو سمیرا کو شوہر کی اس نصیحت پر غصہ بھی آیا کیونکہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ شادی کے بعد شوہر کی کمائی پر خوب کھل کر عیش کرے گی۔ مگر شوہر صاحب اس قدر کفایت شعار فطرت کے مالک تھے کہ سمیرا کے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سو شوہر کی حکم عدولی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ دل مار کر بہت سی خواہشوں کو دل میں دبا کر جیب خرچ استعمال کرنا شروع کیا۔ مگر دل کے نہاں خانوں میں چھپی اس خواہش کو کبھی دل سے نکال نہ پائی۔ کہ کوئی بڑا سا انعام یا ''پرائز بانڈ'' نکلے تو وہ بھی اپنے سارے ارمان جو اکثر ''آنسوؤں'' کی صورت میں بہہ جاتے تھے۔ پورے کرے اور آج اسے موقع مل ہی گیا تھا۔ ''ایک کروڑ'' کی صورت میں۔

''تو مجھے اب کیا کرنا ہوگا.....؟؟'' من پگلا قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی خود پر کنٹرول کرتے ہوئے سمیرا نے اس شخص سے سوال کیا۔

''اپنی انعامی رقم وصول کرنے کے لیے محترمہ بس آپ کو.....!'' اور پھر اس شخص نے سمیرا کو فون پر ہی سارا طریقہ سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اور وہ کس طرح اپنی انعامی رقم وصول کر سکتی ہے۔

نور بنا سپتی گھی ایک لوکل گھی بنانے والی کمپنی تھی۔

یہ لوکل کمپنی اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنی پروڈکٹ گلی محلوں میں بیچا کرتی تھی۔ ان کی پروڈکٹ کسی حد تک بازار میں ملنے والی اشیاء سے سستی بھی ہوتی تھیں۔ پھر کم قیمت کی چیزیں عورتوں کی نظر سے کیسے بچ سکتی تھیں۔ ان پروڈکٹ پر شاندار آفرز'' ایک کے ساتھ دو مفت''۔

یہ تو عورتوں کے کلیجوں پر چھریاں چلانے کے برابر تھا۔ جیسے ہی ان کے نمائندے آتے عورتیں گھر کے سب کام چھوڑ کر ان کی طرف لپکتیں۔

نمائندوں کے گرد یوں گھیرا ڈال دیتیں کہ جیسے کوئی مداری اپنے ساتھ ایک عدد بندر..... ایک عدد بکری اور ایک عدد کتا لے کر آ گیا ہو تماشا دکھانے کے لیے۔

شروع میں سمیرا نے اس طرف کوئی دلچسپی نہ لی مگر کسی نہ کسی پڑوسن کے منہ سے تعریف سنی تو پھر ایک آدھ چیز لے کر خود بھی تجربہ کیا۔ ذائقہ پسند آیا۔ چیز بھی مناسب دام کی تھی۔ پھر کسی حد تک حماد اور بچوں نے بھی تعریف کی تو اس کا حوصلہ بڑھا اور پھر اکثر ہی کچھ نہ کچھ

خریدنے لگی۔ نور بنا پتی گھی بنانے والوں نے اپنی اشیاء پر انعامی اسکیم شروع کر کے اپنی آفرز کو مزید دلکشی عطا کردی تھی۔ اسی انعامی اسکیم کے تحت سمیرا کا انعام نکلا تھا۔ جس کی اطلاع اسے فون پر دی گئی تھی۔

''ایک کروڑ..... اتنی بڑی رقم..... اتنا بڑا انعام!''

سمیرا کا دل تو خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا۔

کمپیوٹر سے تیز دوڑتے دماغ نے چند ہی سیکنڈ میں اس رقم کو استعمال کرنے کی ایک لمبی سی فہرست تیار کر کے اس کے سامنے رکھ دی۔

''پہلے تو ایک اچھا سا صوفہ سیٹ خریدوں گی وہی جو ٹی وی ڈرامے میں دیکھا تھا۔ ہمارا صوفہ سیٹ کتنا پرانے فیشن کا ہوگیا ہے نا.....!''

''ایک عدد ایل ای ڈی، بھلا کتنے انچ کی۔ چلو درمیانے سائز کی ہی سہی!''

پھر نظر پردوں پر ٹھہر گئی۔ ''حماد کو کتنی بار کہہ چکی تھی کہ پردے بہت پرانے ہوگئے ہیں۔ تبدیل کرلیں۔ مگر حماد اور خرچوں کی وجہ سے ہمیشہ ہی ''اگلی بار'' کا کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا۔ ''چلو اب اچھے سے پردے بھی خریدوں گی!''

اس کا دھیان اپنے پرانے چھوٹے سے موبائل کی طرف گیا تو ٹی وی میں نت نئے ماڈل کے موبائل نظروں میں گھوم گئے۔ ''تو دل نے ایک اچھا سا مہنگا ٹچ موبائل خریدنے کی تجویز پیش کردی.....!

''ٹچ موبائل کے بعد توجہ اپنی سونی کلائیوں کی طرف گئی تو دل سونے کے کنگن کے لیے مچلنے لگا تو اس شوق کو پورا کرنے کا ارادہ بھی باندھ لیا۔ ہر عورت کی طرح ''سونا'' سمیرا کی بھی کمزوری تھا۔ کبھی کسی گولڈ کی جیولری شاپ کے سامنے سے گزرتی تو آنکھوں میں ڈھیروں حسرت جمع ہوجاتی.....!''

''سونے کے کنگن کے بعد نظر اپنے کپڑوں کی الماری پر ڈالی۔ جس میں کوئی سوٹ بھی ڈھنگ کا نہ تھا۔ کچھ جوڑے شادی کے تھے۔ جو اب پرانے فیشن کے ہوگئے تھے اور کچھ سستے اتوار بازار سے خریدے ہوئے لان، کاٹن کے سوٹ تھے۔ جو حماد کسی تہوار پر لاکر دیتا تھا۔ وہ انہی کو بیسوں بار استری کر کے استعمال کرلیا کرتی۔ چلو اس بار بہت سارے نئے اور مہنگے جوڑے خریدوں گی!''

کپڑوں کے بعد دماغ جوتوں کی شاپ کی طرف گیا۔ جہاں سے جدید فیشن اور ڈیزائن کے جوتے خریدے اپنے لیے، بچوں اور حماد کے لیے بھی۔ دونوں ہاتھوں میں شاپنگ کے بیگ پکڑے باہر نکلی تو آنکھوں کے سامنے ٹریول ایجنسی کا بورڈ دیکھ کر آنکھوں میں فرط جذبات سے نمی در آئی۔

''چلو اتنا بڑا انعام نکلا ہے تو اسی بہانے وہ اور حماد عمرہ بھی کر آئیں!''

انسان کے پاس پیسے ہوں اور اللہ کا گھر نہ دیکھے۔ یہ تو کنجوسی ہوئی نا..... آنکھوں سے پانی خشک کرتے ہوئے دل ہی دل میں شاپ بھی سلیکٹ کرلی کہ کہاں سے عمرے کے لیے ضروری اشیاء خریدنی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ لیا کہ ٹریول ایجنسی میں حماد کا ایک دوست بھی ہے اس کے ذریعے سستا عمرہ پیکج بھی مل جائے گا۔ لو جی عمرہ پلاننگ بھی ہوگئی۔

کھجوریں، آب زم زم، جائے نمازوں

آپ کا بُرج

مصنف: کیرو

قیمت 150/- روپے

منگوانے اور دستی خریدنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

اور تسبیحوں کے حساب کتاب لگانے کے ساتھ یہ بھی سوچنے لگی کہ انعامی رقم میں کچھ بینک میں بھی جمع کرادوں گی اور اکاؤنٹ تو اپنے نام کا ہی کھلواؤں گی۔ آخر کو میری بچت سے تو ہی اتنا بڑا انعام نکلا ہے۔ یکا یک ڈور بیل نے توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ حماد آفس سے گھر آ گیا تھا۔

''حماد..... ایک اتنی بڑی خوشی خبری ہے کہ کیا بتاؤں؟''

وہ آفس سے تھکا ہارا گھر لوٹا تھا۔ سمیرا نے یہ خبر اسے فون پر سنانے کے لیے دس کالز کیں مگر وہ میٹنگ میں مصروف تھا۔ سو بات نہ ہو سکی۔

''ایک کروڑ.....!'' اس نے ساری رام کتھا شروع سے لے کر آخر تک حماد کے سامنے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ سنا ڈالی تو پہلے تو وہ تھوڑا حیران ہو اور پھر ہنسنے لگا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟'' حماد سمیرا کی سادہ لوح فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ جو آج کل کے دور کے اعتبار سے قدرے بے وقوف سی تھی۔ وہ ان معاملات میں اتنی جذباتی تھی کہ یہ تک نہیں سوچتی بھی کہ سامنے والا سچ بول رہا ہے یا جھوٹ..... یا کہیں وہ کوئی فراڈ تو نہیں کر رہا۔

''اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے؟'' سمیرا جو خوشی میں اتاولی ہوئی جا رہی تھی۔ حماد کی ہنسی اور اتنی بڑی خوش خبری کو اتنا ہلکا لینے پر بدمزہ ہوئی۔

''ایک انجان بندہ..... فون پر تمہیں ''ایک کروڑ'' انعام کی خبر دے رہا تھا اور تم اس پر یقین کر کے بیٹھ گئی ہو۔ اس پر ہنسوں نہ تو اور کیا کروں!'' وہ ہنوز ہنس رہا تھا۔

''حماد..... انجان کہاں..... نور بنا سپتی گھی بنانے والوں کا نمائندہ بول رہا تھا جو ہر دوسرے مہینے ہمارے محلے میں آتے ہیں.....!'' سمیرا کو حماد کی بے موقع ہنسی سخت چڑا رہی تھی۔ وہ حماد سے جس قسم کی توجہ چاہ رہی تھی اس کا عشرِ عشیر بھی دیکھنے کو نہیں ملا تو وہ جل بھن کر رہ گئی..... بلکہ اس کے مطابق حماد نے اتنی زبردست خوشی کی خبر کو ہنسی میں اڑا کر اس کا بھی مزہ کرکرا کر دیا تھا۔

''جناب وہی نور بنا سپتی گھی جس میں پکے مزے مزے کے کھانے آپ اور بچے کھا کر انگلیاں چاٹتے ہیں!''

سمیرا چاہ رہی تھی کہ حماد مزید تفتیش ختم کر کے اس نمائندے نے جو آگے کی کارروائی بتائی تھی وہ کرے اور اپنی انعامی رقم ''ایک کروڑ'' پورے پانچ دن بعد وصول کرے۔ مگر یہ کیا وہ تو مسلسل اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''اس دور میں بھی کوئی اتنا بے وقوف!'' حماد قدرے سنجیدہ سا رہتا تھا مگر آج یوں کھل کر ہنس رہا تھا جیسے سمیرا نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

اسے یہ ساری کہانی ''فراڈ'' اور ''دھوکے بازی'' کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اور سمیرا کی بے وقوفی پر ہنسی آ رہی تھی جو اس سنی سنائی خبر کو سچ مان بیٹھی تھی۔

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ فراڈ ہے؟''

''نہ کوئی جانا پہچانا نام ہے اس کمپنی کا۔ نہ ہی یہ پتا کہ یہ کمپنی کہاں ہے یا کس علاقے یا شہر میں ہے۔ مارکیٹ میں کبھی میری ایسے کسی نام پر نظر نہیں گزری!'' حماد کے لبوں پر ابھی بھی مسکراہٹ تھی وہ سمیرا کی بچکانہ باتوں پر خاصا محظوظ ہوا تھا۔

''پھر اپنی انعامی رقم وصول کرنے کے لیے پہلے دس ہزار روپے بذریعہ ''ایزی پیسہ'' اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنا۔ تم خود ہی سوچو سمیرا۔ یہ سارا معاملہ کہاں سے فراڈ نہیں لگتا؟؟''

حماد کی مضبوط دلیل لمحے بھر کے لیے سمیرا کو لاجواب کر گئی تو وہ بھی تذبذب کا شکار نظر آئی۔ تاثرات بتانے لگے کہ عقل کچھ سمجھا رہی ہے مگر وہ سمجھنے پر شاید آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔

اس کمپنی کے نمائندے نے انعامی رقم ''ایک کروڑ'' وصول کرنے کے لیے یہ پراسس بتایا تھا کہ دس ہزار روپے پہلے بطور فیس آپ ہمارے موبائل اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کریں اور پھر پورے پانچ دن کے بعد ہمارا نمائندہ انعامی رقم وہ بھی نقد لے کر آپ کے دروازے پر کھڑا ہوگا۔ اور سمیرا نے بنا سوچے سمجھے ہامی بھر لی تھی۔ وہ

تو شکر تھا کہ حماد سے بات کر لی تھی۔ ورنہ خوشی میں دیوانی سمیرا کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی کے ابھی دس ہزار روپے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دے.....

''سمیرا..... زمانہ اب اتنا بھی سادہ نہیں رہا جتنا تم سمجھ رہی ہو.....!'' حماد اب کچھ سنجیدہ سا ہوا تھا۔

''نہ میں تمہیں اس کام کی اجازت دوں گا اور نہ ہی تمہاری کسی ایسی بے وقوفی کا حصہ بنوں گا.....'' حماد نے حکمیہ انداز میں دوٹوک بات کی تھی۔

مگر سمیرا کے اندر کی بے چینیوں کو قرار نہیں مل رہا تھا۔ اسے لگا حماد بہت زیادہ منفی ہو کر سوچ رہا تھا۔ بھلا کوئی پاگل ہے جو اتنا بڑا انعام دے..... رات بھر ''ایک کروڑ'' کی رقم خواب میں دیکھتے ہوئے سوئی جاگی کیفیت میں رہی۔ اسے صبح ہونے کا انتظار تھا اور حماد کے آفس جانے کا.....

☆☆☆

حماد آفس جا چکا تھا اور بچے اسکول روانہ ہو گئے تھے۔ سمیرا نے جلد از جلد گھر کے کام سمیٹے اس دوران اس نے دو سو مرتبہ گھڑی کی طرف دیکھا۔ نمائندے نے کہا تھا دن کے بارہ بجے تک یہ رقم آپ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دیں۔ جتنی جلدی آپ رقم ٹرانسفر کروائیں گے۔ یہ انعامی رقم اتنی جلد آپ تک پہنچا دی جائے گی۔

سارے کام مکمل کر کے اس نے بیگ میں دس ہزار رکھے۔ جو اسے حماد جیب خرچ کے طور پر دیتا رہا تھا۔ وہ اکثر اس میں سے کچھ نہ کچھ بچا لیا کرتی تھی۔ اب اس کے پاس مطلوبہ رقم موجود تھی۔ اسے حماد سے مانگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہر صورت اپنا انعام حاصل کرے گی۔ حماد کی باتوں میں آ کر بے وقوفی نہیں کرے گی۔ جب اتنا بڑا انعام اس کے ہاتھ میں ہوگا تو حماد خود بخود اس کی کفایت شعاری، عقل مندی کا معترف ہوگا۔

بس حماد سے چوری چھپے کام کرنا تھا۔ وہ جب ایک کروڑ کی رقم وصول کرے گی تو بہت اعتماد کے ساتھ حماد کو سب جتائے گی۔

''کہ جناب زمانہ اب اتنا بھی خراب نہیں ہوا جتنی آپ نے سوچ بنائی ہے!''

چادر لیے وہ گھر سے نکلنے ہی لگی تھی کہ چڑوں ناہید آپا آ گئیں۔ چہرے پر چھائی رنجیدگی کسی خاص پریشانی کا اشارہ دے رہی تھی۔ یوں اچانک آمد پر سمیرا کو سخت ناگواری ہوئی تھی۔ اسے جانے کی جلدی تھی اور ناہید آپا کی آمد اس کام میں رکاوٹ بن گئی تھی۔

ناہید آپا کی رنجیدگی کی وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ انہیں بھی ایسے ہی ''انعام رقم'' کی کال آئی تھی۔ کمپنی کے نمائندے نے آٹھ ہزار اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنے کو کہا جو انہوں نے گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود جمع کروا دیے۔ نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ پانچ تو کیا پندرہ دن گزرنے کے بعد بھی انعامی رقم موصول نہیں ہوئی اور نمائندہ کال تک وصول نہیں کر رہا تھا۔ اس صورت حال کے بعد ناہید آپا کا شوہر کے ساتھ خاصا جھگڑا ہوا۔

سمیرا کی آنکھیں مزید حماد کے ایک اور انکشاف نے کھول دیں کہ ایک ایسا فراڈ گروہ پکڑا گیا ہے جو ''ایک کروڑ'' کی انعامی رقم کی خوشی خبری سنا کر سادہ لوح لوگوں کو بیوقوف بناتا ہے۔ اور پھر ان سے اچھی خاصی رقم بٹور کر کسی اور علاقے یا شہر کا رخ کرتا ہے۔ سمیرا یہ تفصیل سن کر اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ وہ بھی ایک انجان شخص کی بات کا اعتبار کر کے بے وقوفی کرنے جا رہی تھی۔ جو ناہید آپا کر چکی تھیں۔

''سمیرا تمہارے پاس کچھ بچت پڑی ہے تو مجھے دے دو اس بار میری تنخواہ لیٹ ہے۔ مجھے بجلی کا بل جمع کروانا ہے۔'' حماد نے ضرورت پڑنے پر پیسے مانگے تو اس کے پاس وہی رقم تھی جو وہ انجان اکاؤنٹ میں بھیجنے والی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ بروقت آنکھیں کھل گئیں۔ اور ساری سچائی سامنے آ گئی۔ ورنہ وہ بھی یوں ناہید آپا کی طرح ہی شرمندگی سے دوچار ہوتی۔

''ایک کروڑ'' کی رقم تو ملی نہیں تھی ہاں ''کروڑ'' کی خبر کیا اسے حماد سے ضرور سننے کو مل جاتیں۔ کیوں کہ ہر کسی پہ اعتبار کر لینا بھی دانش مندی نہیں اور ہر سنی سنائی بات پر بغیر تحقیق کے کوئی قدم اٹھانا انسان کو پچھتاوے اور افسوس کے سوا کچھ نہیں دیتا۔

☆

ثمرہ بخاری

خوشبو کا پیغام

اس کی آنکھ اسٹیشن پہ بھانت بھانت کی آتی آوازوں سے کھلی تھی۔

"اوہو کیا مصیبت ہے؟" گرمی اور سفر کی اکتاہٹ وہ بڑے خراب موڈ میں تھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ یہ کوئی چھوٹا سا گمنام اسٹیشن تھا اور یہ آوازیں جنہوں نے اسے ڈسٹرب کیا تھا۔ ٹھیلے اور چھابڑی والوں کی نہیں بلکہ ٹرین پر سوار ہونے والے نئے مسافروں کی تھیں۔ اس نے توجہ سے دیکھا۔ دو ادھیڑ عمر صحت مند خواتین، ایک جوان دوسری نوجوان لڑکی ایک پہلوان نما مرد ایک ادھیڑ عمر کے حضرت اور جوان لڑکا جوان سب میں معقول تھا اور ان لوگوں کے ساتھ سامان اتنا تھا کہ لگ رہا تھا ایک سال کے لیے کہیں ڈیرے جمانے کا پروگرام ہے خواتین نے اس تیز چلچلاتی دھوپ میں شوخ ریشمی کپڑے اور زیورات

پہن رکھے تھے۔ البتہ مرد ہلکے پھلکے موسم کے مطابق لباس میں تھے۔ خواتین اسی ڈبے میں سوار ہوئی تھیں اور اب مرد سامان رکھ رہے تھے۔ ذرا دیر کے بعد یہ پرسکون ڈبا شور سے بھر گیا۔

"بھابی! آپ اکیلے اتنی بڑی سیٹ پر بیٹھے ہو۔ ادھر چھوٹی سیٹ پر جا کر بیٹھو۔" پہلوان نما مرد نے آتے ہی شماس کو مخاطب کیا۔

وہ بے زاری سے اٹھا اور جا کر سنگل سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"خالہ اختری! آپ ادھر آ جاؤ۔"

اس مرد کی آواز کھردری اور بھاری سی تھی۔ شماس کے تو کانوں میں کھجلی ہونے لگی۔ سامنے کی سنگل سیٹ پر بیٹھی رسالے میں مگن لڑکی نے سر اٹھا کر نئے مسافروں کو دیکھا اور پھر دوبارہ اپنے ڈائجسٹ میں مگن ہو گئی وہ اور شماس ایک ہی اسٹیشن سے سوار ہوئے تھے جگہ بھی ایک ہی ڈبے میں ملی اور شماس نے دیکھا تھا اس نے آتے ہی بیگ سے ڈائجسٹ نکالا اور اس میں گم ہو گئی۔ ایک دو بار جب شماس نے اس پر نگاہ ڈالی تو اسے لگا تھا۔ وہ مسلسل ایک ہی صفحے پر نگاہ جمائے بیٹھی ہے۔ خیر وہ زیادہ دھیان نہیں دے سکا کہ اس وقت اس کے ساتھ چند لڑکے بیٹھے تھے وہ ان سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ وہ اترے تو اسے نیند آ گئی اور آنکھ اس شور سے کھلی تھی۔

"خالو جی! آپ کہاں گوالچی گاں کی طرح پھر رہے ہیں۔ ادھر آئیں سیٹ قبضے میں کریں۔"

لڑکے نے انتہائی بیزار لہجے میں بزرگوار کو پکارا تھا۔ وہ ادھر آئے تنقیدی نگاہ سے آس پاس دیکھا وار منہ بنا کر بولے۔

"یہ کیسی جگہ لے لی ہے تم لوگوں نے میں تو کہتا ہوں۔ اٹھو اگلے ڈبے میں چلتے ہیں۔" انداز دانشمندانہ اور اٹل سا تھا۔

لڑکے نے گہری سانس لے کر ہاتھوں پر اٹھائی اٹیچی برتھ پر رکھی پھر بولا۔

"ہاں خالو جی! جگہ واقعی بڑی ہی غیر مناسب ہے۔ اگلے ڈبے میں جانا ہی بہتر ہے مگر میں کیا کروں۔

مجھے چلتی گاڑی میں ایک ڈبے سے اتر کر دوسرے میں جانا اور اتنا سارا سامان بھی چڑھانا نہیں آتا۔"

"جمیل: ادئے بھنے مرغ کا دیگچہ کدھر ہے؟"

پہلوان نما مرد گھبرا کر سامان پر نظر دوڑا کر اس لڑکے سے پوچھ رہا تھا۔

"وے الیاس! فکر نہ کر وہ تو میں نے اپنی سیٹ کے نیچے رکھ لیا ہے۔"

صحت مند خاتون جنہوں نے گہرے پیلے رنگ کا ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا جس کے بازوؤں اور گلے پر سرخ سبز دھاگے سے کڑھائی کی گئی تھی۔ بڑے جوش سے بتا رہی تھیں۔

الیاس جو کہ دیکھنے میں ہی خوش خوراک دکھائی دے رہا تھا۔ اس اطلاع سے کافی خوش ہوا اور بولا۔

"آپا انوری! ذرا سا ادھر کھڑکی کے ساتھ ہو جاؤ تو میں ادھر تمہارے برابر بیٹھ جاؤں۔"

"نہ وے، گرمی بڑی ہے۔ یوں سب کے سب جڑ کر بیٹھ گئے تو مر جائیں گے۔"

"نہیں اتنی ساری تو جگہ ہے کچھ نہیں ہوتا۔ تم تھوڑی ادھر کو کھسکو۔"

"نہ میں نہیں ہوتی۔" وہ بھی اڑ گئیں۔

"آپا اختری! سالن کا دیگچہ بھائی الیاس کو دے دو، ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔"

جمیل نے مشورہ دیا۔ اسی وقت چودہ پندرہ سالہ لڑکی جو گلابی اور سبز پھولدار سوٹ میں ملبوس تھی کھڑکی کے پاس بیٹھنے کی خواہش کا اظہار..... مچل کر کرنے لگی۔

"فی مرن جوگی! اب میں تیرے لیے یہاں درمیان میں کھڑکی لگوانے سے تو رہی۔"

اس کے برابر میں بیٹھی دوسری دوسری صحت مند

خاتون ایک ہاتھ جڑنے کے بعد بولی تھیں۔
''تو میں نے کب کہا۔ یہاں کھڑکی لگواؤ بس مجھے کھڑکی کے پاس بٹھاؤ۔''
''باہر کوئی باغات کا سلسلہ نہیں ہے جو تم اتنی ضد کر رہی ہو۔'' جمیل کو غصہ آ گیا۔
''نہ میں ادھر ہی بیٹھوں گی۔'' لڑکی بھی سخت ضدی تھی۔ شاس اور ڈائجسٹ والی لڑکی دونوں پوری طرح ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے مگر انہیں پروا نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے گھر کے آنگن میں ہی بیٹھے ہیں۔
''انوری! تو ادھر آ جا۔ اس چڑیل کو ادھر کھڑکی کے ساتھ بیٹھنے دے۔ شاید کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے۔''
''خالہ اختری! تم دیکھ تو رہی ہو۔ میری گود میں بچہ سویا ہوا ہے۔ میں نہیں اٹھ سکتی۔'' ادھر سے کورا جواب موصول ہوا۔
''شگو! تو ہی اپنی سیٹ دے دے۔'' اب خاتون نے دوسری کھڑکی کے سامنے بیٹھنے والی لڑکی سے کہا۔
وہ غالباً صلح جو تھی۔ اٹھنے لگی مگر جمیل نے روک دیا اور بولا۔
''شگو کو تو میں نے عارضی طور پر بٹھایا ہے وہاں، اصل میں وہ سیٹ میری ہے۔ میں ہی وہاں بیٹھوں گا۔''
''مجھے نہیں پتا۔ مجھے..... کھڑکی کے ساتھ بیٹھنا ہے۔'' لڑکی نے پاؤں فرش پر پٹخے۔
''کیسے بچوں کی طرح ضد کرتی ہے، اتنی بڑی ہو گئی شرم نہیں آتی۔'' جمیل نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''خیر اتنی بڑی بھی نہیں۔ بس قد ذرا جلدی لمبا ہو گیا ہے۔'' اس کی ماں اختری بی بی نے فوراً دفاع کیا۔
''ہاں قد لمبا، عقل چھوٹی رہ گئی ہے۔'' جمیل نے گھور کر بسورتی لڑکی کو دیکھا۔
''جمیل او جمیلے پراٹھوں والی پوٹلی کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی۔'' الیاس بھائی بے چینی سے سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
''فکر نہ کرو الیاس بھائی! کھانے پینے کی ساری چیزیں میں نے احتیاط کے ساتھ رکھی ہیں۔''
وہ مطمئن ہو کر سر اثبات میں ہلا کر بیٹھ گئے۔
''میں کھڑکی والی سیٹ لوں گی۔'' لڑکی نے جو موضوع بدلتا دیکھا تو اونچی آواز میں دہائی دی۔
اب اختری بیگم نے نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ڈائجسٹ والی لڑکی کے پاس آ کر بولیں۔
''بی بی! تم ادھر ہمارے پاس آ جاؤ میری لڑکی بڑی ضدی ہے۔ اسے کھڑکی کے پاس سیٹ نہ ملی تو جینا حرام کر دے گی۔''
''جی میں؟'' لڑکی خاصی پریشان ہو گئی۔
''ہاں ہاں۔ ایسی کیا بات ہے۔ یہ سارا ڈبہ ایک ہی جگہ جا رہا ہے۔ تم اس سیٹ پر بیٹھو گی تب بھی اپنے شہر ہی پہنچو گی۔'' لڑکی کی گھبراہٹ انہیں دلیر بنا گئی۔
''مگر وہاں تو آپ کے ساتھ مرد بھی ہیں۔ میں کیسے؟''
''لو بھلا۔ تم کیا بسوں، ویگنوں میں سفر نہیں کرتیں؟ اور پھر ہمارے مرد کوئی بدمعاش تھوڑی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناول

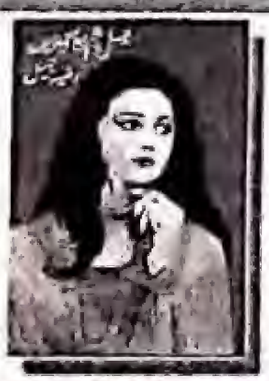

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

قیمت -/300 روپے

ہیں۔"

"ہاں ہاں بی بی! تم اٹھ جاؤ ادھر آ کر خالہ اختری کے ساتھ بیٹھ جانا۔" الیاس نے بھی کہا اور خالو جی بھی سر ہلانے لگے۔

شماس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی ڈری سہمی اور بے بس دکھائی دے رہی تھی۔

"عجیب بزدل لڑکی ہے انکار بھی نہیں کرنا آتا۔ یوں ڈر رہی ہے جیسے نہیں اٹھے گی تو وہ قتل کر ڈالیں گے۔"

"اب اٹھو بھی کیا چلّہ کاٹنے لگی ہو؟" اختری کی بیزاری اور تیزی عروج پر تھی۔

"نہیں اٹھیں گی۔" آخر شماس نے کہہ دیا۔ وہ کچھ چونکیں۔ مڑ کر مدد کے لیے اہل خانہ کی طرف دیکھا۔

"تم کون؟" الیاس نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ میرے ساتھ ہیں۔" اس نے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

"اوہ اچھا اچھا!" الیاس صاحب اب کھڑکی سے باہر چٹیل میدانوں کو دلچسپی سے تکنے لگے۔

"اچھا یہ بی بی تمہارے ساتھ ہے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔" اختری بیگم نے بھی یہ سنتے ہی پسپائی اختیار کر لی اور واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھیں۔

لڑکی نے شکر گزار نظروں سے شماس کی طرف دیکھا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے نگاہ جھکالی۔

"پڑ گئی ٹھنڈ کلیجے میں؟" جمیل ضدی لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا میں نے کھڑکی والی سیٹ لینی ہے۔" اس کی ضد برقرار تھی۔

"ایسا کرو۔ آپا! انوری کی گود سے کاکا لے کر اپنی اماں کو پکڑا دو اور خود چڑھ جاؤ ان کی جھولی میں اور دیکھو کھڑکی سے باہر کے نظارے۔"

اس کا انداز ایسا تھا کہ شماس اور لڑکی کو بھی ہنسی آ گئی۔

"اماں! سمجھالو بھائی جمیل کو، یہ ہمیشہ میری مخالفت کرتا ہے۔"

"ہاں جمیل! میری بشی سچ کہہ رہی ہے تم واقعی بڑا تنگ کرتے ہو اسے۔"

"خالہ! تمہاری بشی کبھی عقل کی کوئی بات کرے تو میں بھی اس کی مخالفت نہ کروں۔"

"میں کہتا ہوں ڈبا ٹھیک نہیں ہے۔ اگلے ڈبے میں چلو۔" خالو جی کی سوئی غالباً ایک جگہ اٹک گئی تھی۔

"میں نے کب روکا ہے۔ آپ بسم اللہ کر کے اتریں آپ کے پیچھے ہوں۔"

شماس کو ہنسی آ گئی۔ جمیل نے جو اسے ہنستے دیکھا تو مسکرا دیا اور اشارے سے کہا۔

"ہمارے سب ساتھی ہی کریک ہیں۔"

"جمیل! میرا اچھا بھائی۔ ذرا اٹھ کر کولر سے پانی تو نکال، میرا کاکا پیاسا ہے۔"

"چل بشی! پانی نکال۔" جمیل کو یہ حکم پسند نہیں آیا آگے ٹرانسفر کر دیا۔

"مجھے نہیں پتا۔ میں تو آئی اسی لیے تھی کہ کھڑکی کے پاس بیٹھوں گی نظارے کروں گی جب کوئی چیز بیچنے والا آئے گا تو میں چیز خریدوں گی۔"

"ہائے ہائے۔ تیرے تو سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ ایسا کر جا کے دروازے میں بیٹھ جا۔ وہاں سے نظارے بھی دیکھنا اور چیزیں بھی خریدنا۔"

"اوئے جمیل! دیکھ تو چھت ہل رہی ہے نا۔"

خالو جی اس ڈبے میں خرابیاں ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔

"چھت؟ چھت ہی نہیں ہم سب ہل رہے ہیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے، چھت کمزور ہے کہیں نیچے ہی نہ آ جائے۔"

"اے میں کہتی ہوں بشی کے ابا! اب جیسی بھی جگہ ملی ہے ٹک کے بیٹھ جاؤ۔" خالہ اختری کو کل کے بچے جمیل کا اپنے شوہر کے ساتھ مذاق کرنا پسند نہیں آیا تو شوہر کو سمجھانے لگیں۔

"شگو او شگو! اٹھ دو گھونٹ پانی نکال کولر سے میرا

کا کا بڑا پیاسا ہے۔"

شگو چادر سنبھالتی اٹھی۔ گلاس پتا نہیں کس بیگ سے برآمد کیا اور جب کولر کی ٹونٹی کھولی تو گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پانی بھائی الیاس اور روتی بسورتی بشی پر گرا دونوں اچھل پڑے۔

"گھبراؤ نہیں۔ پانی ہے۔ کوئی ایٹم بم نہیں گرا تم پر۔"

جمیل نے دونوں کو حوصلہ دیا۔

"سارے بال خراب ہو گئے۔" الیاس کا موڈ خراب ہوا۔ بشی کو ٹھنڈے پانی سے ویسے ہی چڑ تھی۔ گرمیوں میں بھی کم کم نہاتی تھی۔ یہ تو ایسا یخ برفیلا پانی تھا وہ بھلا کیوں کہ صبر شکر کے بیٹھ جاتی۔

پیاسا کا کا کھڑکی سے باہر جھانک کر اللہ جانے کیا دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جمیل نے انوری سے کہا۔

"آپا! یہ سارا فساد تیرے اس کا کے کا پھیلایا ہوا ہے نہ اسے پیاس لگتی نہ ہی ٹھنڈے پانی کے گرنے سے بشی زندگی کی آخری سانس لیتی۔"

"اے ہے تیرے منہ میں خاک ایسی بات پر۔" خالہ اختری تڑپ اٹھی۔

شگو نے گلاس میں پانی ڈالا، انوری کو پکڑایا اور پھر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ بشی اچک اچک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش میں تھی مگر درمیان میں الیاس اور انوری کے صحت مند وجود حائل ہو جاتے تھے۔ منہ بنا کر ماں سے بولی۔

"ابھی تک تو کوئی چھابڑی والا آیا نہ کوئی چاٹ، فروٹ، بوتلوں کا ٹھیلا دکھائی دیا۔ سارا اسٹیشن بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔"

"صبر کرو ابھی بڑا لمبا سفر باقی ہے۔" ماں نے تسلی دی۔

"اماں! میں نانی کے گھر جا کر بال کٹوالوں گی۔"

بشی کو شاید بولے بغیر چین نہ تھا۔

اور بات وہ چھڑنی ہوتی تھی جس سے باقی سب کو اختلاف ہو اب بال کٹوانے کا اعلان ہوا تو ماں کے علاوہ سب نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ جمیل بولا۔

"ہاں تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ سر بالکل صاف کروالو ورنہ اس میں پلنے والی جوئیں تمہارا دماغ بھی کھا جائیں گی۔"

"خبردار جو بال کٹوائے۔ یہ شریف لڑکیوں کا شیوہ نہیں۔" الیاس بھائی جی دھاڑے۔ انوری آپا نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا اور اختری سے بولیں۔

"بوا! آپ سمجھاتی کیوں نہیں ہیں بیٹی کو۔"

"یہ بیٹی کو کیا سمجھائے گی۔ اسے تو خود ابھی عقل نہیں آئی۔" خالو جی نے لب کشائی فرمائی۔

"اچھا تم تو بڑے عالم فاضل ہو خود سمجھا لو۔" نیا محاذ کھلنے لگا۔

شماس نے بیزار ہو کر ادھر سے دھیان ہٹا لیا اور سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ اس نے ڈائجسٹ بیگ میں رکھنے کے بعد سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔ وہ بھی اس شور کی وجہ سے بیزار بیٹھی تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟" جمیل نے شماس کو متوجہ کیا۔

"سرگودھا اور آپ؟" اس نے پوچھا اس سے پہلے کہ جواب میں جمیل کچھ کہتا۔ اوپر رکھے سامان میں سے کوئی چیز دھڑام سے نیچے آ گری۔ خواتین تو چیخ ہی اٹھیں۔ خالو نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ چھت نیچے آ پڑی ہے۔ اس لیے ایک مردانہ چیخ بھی بڑی نمایاں سی تھی۔

"یہ بیگ اس جگہ کس نے رکھ دیا تھا؟ اب خالو شرمندہ تھے اور سب کو مشترکہ ڈانٹ پلا رہے تھے۔

"ہائے اس بیگ میں تو میری چوڑیاں تھیں!" بشی نے دہائی دی۔

"بس یہ ان ہی کی نحوست کی وجہ سے گرا ہے۔" جمیل نے اعلان کر دیا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" وہ آپس کی لڑائی

میں مصروف تھے۔ شماس نے لڑکی سے پوچھا۔

''سرگودھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔'' اس کے یوں کہنے پر لڑکی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کہ میں ان لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ ہم ساتھ ہیں اگر آپ پہلے اتر جاتیں اور میں بعد میں تو جھوٹ پکڑا جاتا۔'' لڑکی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''وہاں آپ کا گھر ہے یا کسی سے ملنے جا رہی ہیں؟''

یہ سوال لڑکی کو پسند نہیں آیا۔ چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''دیکھیے، میں کوئی بدتمیز راہ چلتی لڑکیوں کے پیچھے چلنے والا لڑکا نہیں ہوں۔ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں اور شریف شہری ہوں۔''

اس وضاحت سے ادھر کافی تسلی ہوئی اور چہرے پر چھائے، بیزاری کے بادل چھٹ گئے۔

''میں سرگودھا میں جاب کے سلسلے میں ہوتا ہوں۔ چھوٹا شہر ہے۔ پرسکون ہے۔ اب تو مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ یوں سمجھیں میں نے تو مستقل وہیں سیٹل ہونے کا پروگرام بنا لیا ہے۔''

''میں وہاں جاب کے سلسلے میں جا رہی ہوں۔'' لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا ویسے رہائش کہاں ہے آپ کی۔'' لڑکی نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن بڑی نمایاں تھی۔

''سوری شاید مجھے یہ سوال کرنا نہیں چاہیے تھا۔ اصل میں میرے لیے خواتین کوئی ممنوعہ چیز نہیں ہیں۔ تعلیم بھی ان کے ساتھ حاصل کی اور اب بھی کئی ڈاکٹر لڑکیوں سے اچھی سلام دعا ہے بس اسی وجہ سے آپ سے بھی یہ سوال کر گیا۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں نے برا نہیں مانا۔ اصل میں آپ کے اس سوال کا جواب میرے پاس ہے ہی نہیں۔''

ڈاکٹر شماس کا لہجہ ہدیٰ کو اس پر اعتماد کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور اس کی پرسنالٹی واقعی متاثر کن اور ڈیسنٹ لگتی تھی۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کی ڈیتھ کے بعد میری زندگی آزمائشوں میں گھر کر رہ گئی ہے۔ کبھی چچا کے گھر، کبھی ماموں کے ہاں۔ اب میری ایک رشتے کی خالہ نے سرگودھا سے خط لکھا تھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ یہاں تمہارے لیے جاب کا انتظام ہو جائے گا اور تم میرے گھر کا ایک کمرہ کرائے پر لے کر ہمارے ساتھ ہی رہ سکتی ہو۔''

''خالہ ہو کر کرایہ لیں گی؟'' شماس نے افسوس کیا۔ ''وہ خود بھی کچھ زیادہ آسودہ حال نہیں ہیں میرے لیے یہی بہت ہے کہ انہوں نے میرا خیال کرتے ہوئے میرے لیے جاب کا بندوبست کیا ہے۔ آپ دعا کریں مجھے جاب مل جائے۔ سچ اب تو میں بہت تھک گئی ہوں۔ زندگی سے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔''

''نہیں ایسا نہیں سوچتے۔ زندگی تو اللہ کا دیا تحفہ ہے۔ اونچ نیچ تو ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ بہت سی خوشیاں بھی دیکھیں گی آپ۔''

ہدیٰ مسکرائی اور بولی۔

''آپ ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر اپنے مریضوں کو ایسے ہی انداز میں تسلیاں دیتے ہیں جس طرح اس وقت آپ نے مجھے دی ہے۔''

''مس!'' پھر رکا اور بولا۔ ''اگر پسند کریں تو نام بتا دیں۔''

''میرا نام ہدیٰ ہے ہدیٰ علوی۔''

''بہت اچھا نام ہے آپ کا میں یہ کہہ رہا تھا مس ہدیٰ! کہ غم اور خوشی، آزمائش تو ہر کسی کے ساتھ ہے۔ اس دنیا میں بہت ہی کم ایسے خوش نصیب ہوں گے جنہیں کوئی پریشان نہیں ہوگی۔ اب مجھے ہی دیکھ لیں۔ ماں کو ارمان تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں میں بہت چھوٹا تھا جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ میرے ماموں مجھے

اور ماں کو اپنے گھر لے آئے تھے مگر وہ خود بھی بال بچے دار تھے مجھ پر کہاں توجہ دے سکتے تھے۔ میری امی نے بڑی محنت کی۔ جہاں بھی کام ملا۔ انہوں نے کیا۔ برف کے کارخانے میں مزدوری کر کے ان کے ہاتھ دکھنے لگتے تھے۔ بالکل سن ہو جاتے مگر وہ کام میں لگی رہتیں۔ ان پر بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ بیٹے کو دوسروں کا محتاج نہیں بنانا اس کے لیے محنت کرنی ہے، اسے یہ فخر دینا ہے کہ وہ دوسروں کے ٹکڑوں پر نہیں پلا۔ ماں نے اس کے لیے دن رات محنت کی ہے۔ مجھے اپنی ماں کی محنت، خراب صحت اور پیار کا پورا احساس تھا۔ میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو میری ماں کو دکھی کرے، جب میں میٹرک میں تھا تو میں نے اخبار بیچنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے ڈاکٹر کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی اور میں جانتا تھا۔ میڈیکل کی تعلیم لٹ ہونے کے ساتھ ساتھ مہنگی بھی ہے۔ میری غریب بیمار ماں جتنی بھی محنت کر لے، اخراجات پورے نہیں کر سکے گی۔ بس پھر میں نے بھی دن رات ایک کر دیے۔ مزدوری کی، مشقت برداشت کی اور پھر ایک دن وہ بھی آیا۔ جب مجھے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن مل گیا۔ میں جہلم سے ملتان آ گیا۔ وہاں اتنی دور آ کر بھی ماں ہر دم میرے ساتھ رہتی تھی۔ میں بڑی باقاعدگی سے اپنی امی کو خط لکھتا اور انہیں بتاتا۔ بس تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر دکھ کے یہ دن ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔ ہم سکھ کے موسم دیکھیں گے۔ میری سب سے بڑی خواہش ہی یہ تھی کہ اپنی ماں کو قیمتی لباس پہنا کر خوب بڑے سے پلنگ پر بٹھا دوں اور ان کی خوب خدمت کروں۔ انہیں اتنی خوشی دوں کہ ماضی کے دکھ ان کے لیے خواب بن جائیں۔ میں پوری لگن سے پڑھتا رہا۔ میں نے نہ تو اپنے پرانے کپڑوں کی پروا کی۔ نہ ہی کبھی یہ دیکھا کہ میرے ساتھیوں کے پاس کتنے خوب صورت فائل اور پین ہوتے ہیں۔ وہ ایک وقت میں کتنے پیسے خرچ کر دیتے ہیں بس مجھ پر تو جیسے ایک دھن سوار تھی۔ جی چاہتا یہ دن پر لگا کر اڑ جائیں اور وہ وقت جلد آ جائے جب میں اپنی ماں کی آرزو کی تکمیل کر دوں

مگر ہدیٰ! میری بدنصیبی — دیکھیں جب میں میڈیکل کے آخری سال میں تھا تو میری پیاری ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ بیمار تھیں مگر انہوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ وہ بیماری کی حالت میں بھی میرے لیے محنت کرتی رہیں مگر جسم کی عمارت اندر سے بہت کھوکھلی ہو چکی تھی۔ ان کا عزم ہی تھا جو انہیں یہاں تک لے آیا کہ میں آخری سال میں پہنچ گیا۔ مگر پھر وہ چلی گئیں۔ شاید میں بکھر جاتا۔ بالکل ٹوٹ جاتا۔ تعلیم ادھوری چھوڑ دیتا مگر ماموں نے بتایا میری ماں کی وصیت تھی کہ میں اپنی تعلیم ضرور مکمل کروں، بس پھر میں نے ماں کی وصیت کو دل میں اتار لیا۔ اور ایک روز میں ڈاکٹر بن گیا مگر مجھے وش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ میں قبرستان جا کر ماں کی قبر پر پھول چڑھا کر روتا رہا اور ڈھیروں باتیں کرتا رہا۔ آج اس واقعے کو تین سال گزر چکے ہیں۔ مگر میرے دل کو کسی پل قرار نہیں آتا میں جب آرام دہ بستر پر سوتا ہوں تو مجھے ماں کی مشقت اور تھکا ہوا کمزور جسم یاد آ جاتا ہے۔ تب نیند آنکھوں سے اچاٹ ہو جاتی ہے اور میں ماضی میں کھو جاتا ہوں۔"

ڈاکٹر شماس کی کہانی سن کر ہدیٰ کی آنکھوں میں نمکین پانی تیرنے لگا تھا۔

"کاش میں اس عظیم عورت سے مل سکتی۔" اس نے بے ساختہ اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"کبھی میری ماں بہت خوب صورت تھی مگر پھر دن رات کی مشقت نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ مگر میرے لیے تو وہ دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ وہ عظیم ماں تھی اور دنیا کو دیکھو ہدیٰ! وہ ممانی جو کبھی ہم دونوں کو اپنے گھر رکھنے پر راضی نہیں تھیں جنہیں یہ بھی برا لگتا کہ ہم ان کے گھر کے اسٹور میں پڑے رہتے ہیں۔ ہم تو دو وقت کی روٹی بھی اپنی محنت کی کمائی سے کھاتے تھے۔ مگر پھر بھی ممانی اور ان کے بچوں کی آنکھوں میں ہمارا وجود بری طرح کھٹکتا تھا۔ میری ممانی کو پورا یقین تھا کہ میں کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ وہ کہا کرتی تھیں ایسے بھیک منگے چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے اگر ڈاکٹر بننے لگے تو سمجھو، قیامت کے آثار ہیں اور جب میں ڈاکٹر بن

گیا تو وہی ممانی میرے صدقے واری ہونے لگیں ۔اب اس گھر میں میرے لیے بہت جگہ ہے۔ بقول ممانی ان کی بیٹی تو میری راہ دیکھتی ہے کہ میں کب سرگودھا سے جہلم آتا ہوں، مجھے شدید نفرت ہے ان دوغلے لوگوں سے مگر میں نے کبھی ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ میں تو جہلم صرف ماں سے ملنے جاتا ہوں۔اس کی قبر پر پھول چڑھاتا ہوں اور دل کی ساری باتیں اس سے کرتا ہوں۔"

بدی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اتنی دیر میں بچی نے پھر کوئی ہنگامہ شروع کر دیا تھا۔انوری کا بچہ بھی گرمی سے گھبرا کر رو رہا تھا۔

"جمیل! ذرا اس کا منہ تو دھلا دے۔ گرمی سے تڑپ رہا ہے میرا بچہ!"

"ابھی دریا آئے گا تو ڈبکی لگوا دینا۔" جمیل نے مشورہ دینے کے بعد بشی کو دیکھا جو شگو سے کہہ رہی تھی۔

"اتنی دیر سے تم کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہو۔ اب میری باری ہے۔"

شگو اٹھنا نہیں چاہتی تھی مگر خالہ اختری کی ڈانٹ نے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ بشی جھٹ اس کی جگہ پر بیٹھ گئی اور شگو کچھ پریشان سی کھڑی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ یوں منہ اٹھائے کھڑی کیوں ہو۔" خالہ نے ڈانٹا تو اسے بشی کی چھوڑی جگہ پر جمیل کے برابر میں بیٹھنا پڑا۔

جمیل نے نظر بچا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ گھبرا کر ادھر ادھر ہمسفروں کو دیکھنے لگی۔ شکر کیا کوئی ادھر متوجہ نہیں تھا۔ سب روتے ہوئے کاکے کو دیکھ رہے تھے جبکہ جمیل نچلا ہونٹ شرارت سے دبائے اس پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔

شماس نے اس کی یہ شرارت اور لڑکی کا گھبرانا دیکھ لیا تھا۔اور جب شگو گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی تب نگاہ ڈاکٹر شماس کی طرف اٹھ گئی۔ بہت شرم آئی اور اشارے سے جمیل کو بتایا۔جمیل نے شماس کی طرف دیکھا دونوں ہنس پڑے۔

"کیا ہوا کیوں ہنس رہے ہو؟" خالہ اختری کو دوسروں کے معاملات میں بہت جلدی دلچسپی پیدا ہو جایا کرتی تھی۔

"لو جی اصل سین تو دیکھ نہیں سکیں اب جو معصوم کی ہنسی دیکھی ہے تو اتنا تجسس ہو رہا ہے خالہ! آپ ایک بہت خوب صورت سین نہیں دیکھ سکیں۔ وہ تو ایسا تھا کہ آپ اس پر یہیں بیٹھے بٹھائے دو گھنٹے کی تقریر کر سکتی تھیں۔"

"اس کیا مطلب جمیلے! کیا ہوا تھا اور تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"کیسے بتاتا اور کیوں بتاتا؟" وہ مسکرایا۔شگو گھبرائی تھی کہیں وہ کچھ ایسی بات نہ کر دے جو خالہ سب سمجھ جائیں اور ہو جائے پھر اس کی شامت کا آغاز، خود بھی کھنچائی کریں گی گھر جا کر اماں کو بھی بتائیں گی۔

"خالہ! میں ادھر آ کر آپ کے برابر میں بیٹھ جاؤں۔" وہ جمیل کے قریب سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔ ڈر تھا کہیں پھر کوئی شرارت نہ کر دے۔

"کیوں ادھر کیا تکلیف ہے؟ اتنی گرمی میں ہم پہلے ہی اتنے لوگ جڑے بیٹھے ہیں۔ تجھے پتا نہیں کون سی خالی جگہ نظر آ گئی ہے۔"

"اماں؟ دیکھیں تو آموں کا باغ!" بشی خوشی سے چلائی۔

"تم تو ایسے خوش ہو رہی ہے جیسے تمہاری نظر پڑتے ہی یہ آموں کا باغ تمہارا ہو جائے گا۔"

"رب سائیں خیر کرے آج کل گاڑیوں کے حادثے بہت ہو رہے ہیں۔" خالو نے ٹھنڈی آہ بھر کر ایک منحوس سے تاثر کے ساتھ کہا۔

"گاڑیوں کے ہی نہیں ویسے بھی بہت حادثے ہو رہے ہیں۔" جمیل نے معنی خیز انداز میں شگو کو دیکھ کر کہا۔اس کا دل زور سے دھڑکا اور چادر کو چہرے کے تھوڑا آگے کر کے بیٹھ گئی۔

"لو یہ شگو تو خالو جی سے بھی پردہ کرنے لگی ہے۔" سامنے چونکہ وہی بیٹھے تھے۔اس لیے جمیل نے ان کے بارے میں کہا۔ خالہ اور آپا انوری نے

بیک وقت شگو کو دیکھا اور بولیں۔

''اے ہے شگفتہ! تیری تو مت ماری گئی ہے اری یہاں کون سے بچے، لفنگے بیٹھے ہیں جو اتنی گرمی میں تم نے منہ لپیٹ لیا ہے۔ ہمارا تو دیکھ کر ہی دم الجھ رہا ہے۔''

''میرا تو اپنا سانس لینا محال ہو رہا ہے۔'' اسے یوں لپٹے لپٹائے دیکھ کر جمیل نے منہ بنایا۔

''شگو باجی اسٹیشن آ رہا ہے کہو تو تمہارے لیے بوتل خرید لوں۔'' بشی نے اس ساری بات میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ تو بس کھڑکی سے باہر کا نظارہ آنکھوں میں سمونے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

''کون سی بوتل لوگی زہر کی یا آب حیات کی؟'' جمیل نے پوچھا۔ بشی نے جواب نہیں دیا۔ کندھے پر لٹکائے گولڈن پرس سے پیسے نکالنے لگی۔

شماس کب سے جمیل کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ لڑکا اپنی فیملی سے ہٹ کر پڑھا لکھا اور خوش گفتار دکھائی دیتا تھا۔ شگو یعنی شگفتہ بھی باقی کی خواتین سے ذرا مختلف، خاموش سی دبلی پتلی نازک نقوش والی لڑکی تھی۔ شماس اور ہدیٰ ان دونوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اسٹیشن آ گیا۔ بشی نے مرنڈا کی بوتل اور ساتھ میں بسکٹ کا پیکٹ خرید لیا۔ جمیل نے دیکھا تو خوب ہنسا اور بولا۔

''ہاں تمہیں میٹھا کھانے کی ضرورت بھی بہت ہے۔ شاید اس طرح ہی کڑواہٹ کم ہو جائے۔ ویسے ذرا مجھے بھی چکھانا مرنڈا اور کریم والے بسکٹ کیسے لگتے ہیں؟

''تمہارے پاس اپنے پیسے بھی ہیں جمیل بھائی! خود خرید لو۔'' اس نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔

''کیا خیال ہے کھانا کھا لیں؟ بھوک لگ رہی ہے۔'' الیاس بھائی نے ایک زوردار انگڑائی کے ساتھ کہا تھا۔

''واہ جی بھائی جی! کیا انگڑائی ہے سچ اگر بھینس بھی دیکھ لے تو شرما جائے۔''

الیاس بھائی کا کالا رنگ، بھاری بھدا جسم جمیل نے غلط نہیں کہا تھا۔ بھینس شرما سکتی تھی۔

''ادھر دو ذرا میں بھی چکھوں۔'' انہوں نے لپک کر بشی کے ہاتھ سے بوتل چھین کر منہ سے لگا لی۔ بشی نے برے برے منہ بناتے ہوئے مدد طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی فوراً تیار ہوئیں۔ الیاس بھائی سے الجھنے لگیں۔

''خالہ ذرا سی چکھی ہی تو ہے۔ تمہاری بیٹی کی تو جان ہی نکلنے لگی ہے۔''

''ذرا سی چکھنے میں ہی آدھی کر دی ہے تم نے۔''

''بوتلیں، ٹھنڈے شربت، لیموں پانی بیچنے والے اب ٹرین میں بھی آ گئے تھے شماس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے کوک خریدی ہاتھ میں لی تو نظر خالہ اختری پر پڑی۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھیں اور ان کے یوں دیکھنے سے ہی شماس کو خیال آیا۔ اس وقت وہ اکیلا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے اور یہ خاتون شاید یہی اندازہ لگانے کو گھور کر دیکھ رہی ہیں کہ اس کے لیے بھی کچھ خریدتا ہوں یا خود ہی چڑھا جاتا ہوں۔

''کیا لیں گی آپ؟'' اس نے ہدیٰ سے پوچھا۔ ''کچھ نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا کہ اس کے پاس گنی چنی رقم تھی جسے وہ بچا بچا کر خرچ کر رہی تھی اب پتا نہیں جاب کا مسئلہ حل ہونا تھا یا نہیں تو ایسے میں وہ کوئی فضول خرچی کہاں کر سکتی تھی۔

''کوک ہی لے لوں آپ کے لیے بھی؟'' شماس نے پھر پوچھا۔

''بہت شکریہ مگر۔'' وہ اس سے کچھ کیسے لے سکتی تھی۔

''دیکھیے اس وقت ہم دونوں ایک ہی فیملی سے ہیں۔ ایک ہی جگہ جا رہے ہیں۔ اگر ان خاتون کو شک پڑ گیا کہ میں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو ابھی آپ کو اٹھا کر یہاں اپنی لاڈلی بشی کو بٹھا دیں گی۔''

وہ مسکرا دی اور خالہ اختری کی طرف دیکھا واقعی وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ شماس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کوک اسے پکڑا دی۔ اور خود دوسری خریدنے لگا۔

جمیل نے شگو سے پوچھا۔ ''بوتل پیو گی؟'' اس نے جواب نہیں دیا تھوڑا اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''یہ میری بات کا جواب ہے؟'' جمیل کچھ روٹھ

کر بولا۔

''اگر سب کو پلاؤ گے تو میں بھی پی لوں گی۔''

''اچھا جی، اب کل کو میں پوچھوں گا مجھ سے شادی کرو گی تو کہنا اگر سب سے کرو گے تو مجھ سے بھی کر لینا۔''

''تم دونوں نے کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے؟'' انوری آپا نے نوٹس لیا۔

''کچھ نہیں۔ میں اسے کہہ رہا ہوں، اس لڑکی نے پرنٹ کتنا خوب صورت پہن رکھا ہے، ایسے اچھے پرنٹ ہمارے شہر میں ملتے نہیں ہیں یا آپ ہی لوگوں کو نظر نہیں آتے۔''

اس کا اشارہ ہدیٰ کی طرف تھا۔ انوری نے بغور اس کا سوٹ دیکھا پھر منہ بنا کر بولیں۔

''لو بھلا، یہ بھی کوئی ڈیزائن ہے اور رنگ بھی کیسے ہلکے ہلکے۔ نہ ہم تو جوانی میں ہی بوڑھوں والے رنگ نہیں پہن سکتے۔''

''جوانی میں ضروری تو نہیں کہ بندہ باؤلا ہی بن کر پھرے۔''

''جمیل! تم دو جماعتیں کیا پڑھ گئے ہو، تمہاری سوچ مت سب الٹی ہو گئی ہے۔ کوئی بات ہم سے نہیں ملتی۔''

''میں تو شروع سے ہی آپ لوگوں سے مختلف ہوں۔ یاد نہیں پڑوس میں رہنے والی پھوپھو حمیدن کہا کرتی تھیں، مجھے تو لگتا ہے یہ بچہ ان لوگوں کا ہے ہی نہیں۔ کسی پڑھے لکھے کی اولاد اغوا کر لی ہے۔''

''اے انہیں تو بکواس کرنے کی عادت تھی۔''

''میں پوچھتا ہوں، روٹی کیا سامان زیادہ کرنے کے لیے ساتھ رکھی ہے۔ اتنا وقت ہونے کو آیا، ابھی تو کھانے کا دور دور تک کوئی پروگرام نہیں ہے۔'' الیاس بھائی کی سوچ پر کھانا سوار تھا۔

''الیاس بھائی! یہ بھی دیکھ لیں، سفر کتنا لمبا ہے، اگر ابھی سب کچھ چٹ کر گئے تو پھر باقی کا سفر آپ کس کے سہارے پر کاٹیں گے۔''

''فکر نہ کرو، یہاں راستے میں کچھ ایسے اسٹیشن بھی آتے ہیں جہاں کا کھانا بڑا اچھا ہے اور پھر ملتان اسٹیشن سے آم کا کریٹ بھی تو لینا ہے کہ نہیں؟'' کہنے کے ساتھ ہی ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''اگر آپ میں سے کسی کے فالتو پیسے ہیں تو آم ہی نہیں، سوہن حلوے کا بھی کریٹ خرید لیں۔'' جمیل نے بے پروائی سے کہا۔

''اماں اماں! آموں کا ایک کریٹ تم بھی لے لینا۔ گھر جا کر کھائیں گے۔'' بشی نے اختری خالہ کو مشورہ دیا۔

''زندہ بچ گئے تو کچھ کھائیں گے۔ دیکھو یہ ڈبا صحیح سلامت منزل تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔'' خالو کے دل سے وہم نہیں جا رہا تھا۔

''تم نے کیا منحوس باتیں شروع کر رکھی ہیں، اگر اچھا نہیں بول سکتے تو خاموش رہو۔'' ان کی بیگم اختری صاحبہ نے ڈانٹا۔

''کیا کروں، صبح سے آنکھ پھڑک رہی ہے، میں ٹال رہا تھا۔ مگر جب ڈبے کی حالت دیکھی تو سمجھ گیا غیبی اشارہ ہے جو مجھے ہوا ہے۔''

''خالو! اگر ایسا ہی ڈر پڑا ہے تو آپ جا کر دوسرے ڈبے میں بیٹھ جائیں۔'' جمیل نے ان کی باتوں سے بیزار ہو کر کہا تھا۔

''لاؤ، میرے حصے کا کھانا نکال دو۔ چلا جاؤں گا۔''

''توبہ ہے، حد ہوتی ہے بزدلی کی۔ بیٹی اور بیوی ادھر بیٹھی ہیں اور خود دوسرے ڈبے میں جا رہے ہیں۔'' خالہ اختری کو ان کا یہ فیصلہ بے حد ناگوار گزرا تھا۔

''خالو جی! ادھر ہی بیٹھو۔ سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ جئیں گے تو اکٹھے، مریں گے تو ساتھ۔'' الیاس بھائی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کچھ بڑبڑا کر رہ گئے۔

''شگو! چل اٹھ کر کھانا نکال۔'' الیاس بھائی کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''احتیاط سے، کچھ گرا نہ دینا۔'' الیاس بھائی کافی فکرمندی کے عالم میں سانس روکے اسے دیگچے ڈونگے ڈبے نکالتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''تم لوگوں نے کہاں جانا ہے؟'' خالہ اختری نے ہدیٰ سے پوچھا۔

''سرگودھا۔'' اس نے شماس کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے بولی۔

''ہم بھی سرگودھا جا رہے ہیں۔ میری پھوپھی کے بیٹے کی شادی ہے۔ اب بندہ پوچھے ایسی گرمی میں شادی کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ گے تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ پر جی کیا کریں، میری پھوپھی نے سارے کام ہمیشہ غلط وقت پر کیے ہیں اور جس جگہ شادی کر رہے ہیں وہاں بھی ہم میں سے کوئی راضی نہیں ہے۔ برادری سے باہر رشتہ جوڑا ہے لڑکے کا۔ ہم نے بڑا کہا اپنی شگو میں کس بات کی کمی ہے۔ اس جمیل کو سرگودھا بھیجا کہ جا کر پھوپھی کو سمجھاؤ۔ وہ شگو کا رشتہ لے کر تو اب کمائے، یہ شگو یتیم ہے ناں، باپ نہیں ہے اس کا، پر ایک نہیں سنی بلکہ جمیل سرگودھا میں ہی تھا کہ رشتہ طے کر دیا اور یہ منگنی کی مٹھائی کھا کر واپس آ گیا۔''

شماس اور ہدیٰ اس منگنی کی وجہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ دونوں نے جمیل کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

''خیر سے کتنا عرصہ ہو گیا ہے شادی کو؟'' اختری بیگم کا اگلا سوال سن کر ہدیٰ اچھل ہی پڑی جبکہ ادھر دلچسپی ہی دلچسپی تھی۔

''شادی تو.....'' ہدیٰ نے سچ بولنا چاہا مگر اس سے پہلے شماس نے کہہ دیا۔

''یہ دوسرا مہینہ ہے۔''

''دوسرا مہینہ۔'' انہوں نے سر سے پاؤں تک بغور ہدیٰ کو دیکھا پھر بولیں۔ ''غضب خدا کا شادی کو دوسرا مہینہ، ہاتھوں میں چوڑیاں، نہ گلے کان میں زیور اور کچھ نہیں تو دو چار انگوٹھیاں ہی چڑھا لیتیں۔ یہ تمہارا میاں بھی ایسے اجڑے حلیے پر تمہیں کچھ نہیں کہتا۔''

اب تو انوری، شگو اور بشیٰ بھی ادھر متوجہ ہو گئی تھیں اور سب کی سب بڑی دلچسپی سے اس نئی نویلی دلہن کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کا لباس سادہ تھا اور زیور کے نام پر ناک میں ایک لونگ تک نہیں تھی۔ ادھر ہدیٰ سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ اسے شماس کے یوں کہہ دینے پر غصہ بھی آیا تھا اور شرم بھی۔

''اصل میں ہم دونوں جاب کرتے ہیں۔ اس لیے زیور وغیرہ نہیں پہنتیں۔'' شماس نے وضاحت کی تھی۔

''اے تو اس وقت کون سی ڈیوٹی پر ہو تم؟'' انوری نے مذاق اڑایا جبکہ اختری خالہ ہدیٰ کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''عورت کو زیور گہنا پہن کے رکھنا چاہیے۔ اس سے روپ بڑھتا ہے۔ اب تم اپنی صورت دیکھ لو، کیسی اداس اور اجڑی لگ رہی ہو اور مجھے اور انوری کو دیکھو، شادی کے اتنے برس بعد بھی کیسا روپ ہے ہمارے چہروں پر۔''

ان کی یہ بات سن کر خالو نے آگے ہو کر خالہ اختری کے چہرے پر روپ تلاش کرنے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر اس ڈونگے کی طرف دیکھنے لگے، جس کا ڈھکن بھائی الیاس نے ابھی ابھی اٹھایا تھا اور سوجی کے حلوے کی خوشبو یہاں وہاں پھیلا دی تھی۔

''کھانا کھائیں گے آپ لوگ؟'' الیاس بھائی نے شماس سے پوچھا۔

اس نے شائستگی کے ساتھ شکریہ ادا کر کے پیش کش لوٹا دی۔

''بھابھی تو کھائیں گی، خالص دیسی گھی سے بنایا ہے یہ حلوہ۔'' انہوں نے کہا اور پھر تھوڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا۔ کھاتے ہی سر درد آ گیا ہے انہیں دیکھ کر یہی حرکت خالو نے بھی کی۔ جمیل نے برتن بھائی الیاس کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاس رکھ لیا اور بولا۔

''میٹھا بعد میں کھایا جاتا ہے۔ آپ لوگ آغاز ہی میٹھے سے کر رہے ہیں۔''

''او چھوڑ یار، ان اصولوں کو۔ میں تو کہتا ہوں بندے کا جس طرح جی چاہے وہ کھائے، کھانے میں یہ پابندیاں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔''

جمیل نے شگو سے کچھ کہا۔ وہ پراٹھے کباب اور انڈے نکال کر پلیٹ میں رکھنے لگی پھر یہ پلیٹ جمیل نے شماس کی طرف بڑھا دی، اس نے انکار کیا تو بولا۔

''میں جانتا ہوں آپ تکلف سے کام لے

رہے ہیں۔ سفر بہت لمبا ہے، کچھ کھالیں اور پھر اس رشتے کے بارے میں سوچیں جو آپ دونوں کے درمیان ابھی ابھی قائم ہوا ہے۔"

اس کی آواز دھیمی اور شرارت سے پُر تھی۔ شماس نے حیرت سے اسے دیکھا تو مسکرا دیا اور بولا۔

"میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا مگر گھبرائیں نہیں، خالہ سے نہیں کہوں گا۔" شماس نے ہنس کر پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی اور بولا۔

"بہت شارپ ذہن ہے آپ کا۔ سچ تو یہ کہ مجھے آپ بہت اچھے لگے ہیں۔ سوچ رہا ہوں ایڈریس لے لوں اور اس سفر کے بعد بھی آپ سے رابطہ رکھوں۔"

"ضرور، یہ تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے۔ آپ میرا ایڈریس لے لیں اور اپنا مجھے دے دیں۔ اب تو رابطہ رہے گا اور یہ بتائیں کباب کیسے بنے ہیں پسند آئے آپ کو؟"

"کیوں آپ نے بنائے ہیں۔" شماس مسکرایا۔ جمیل نے شگو کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا پھر بولا۔

"ایک ہی بات ہے۔"

"ناں، کیا ایک بات ہے ساری محنت ہم عورتوں نے کی اور اب تم لوگ کہہ رہے ہو۔ ایک ہی بات ہے۔" باجی انوری کو خاصا رنج پہنچا تھا اس بات سے۔

"یہ حلوہ میری بیوی نے بنایا ہے، وہ حلوہ بڑا اچھا بناتی ہے۔" بھائی الیاس نے ایک بار پھر حلوہ پر حملہ کیا۔

"جی ہاں بھائی جی نے یہ شادی کی ہی اس لیے تھی کہ ان کے حلوے کی بڑی شہرت سن رکھی تھی۔"

جمیل کی بات پر بھائی الیاس بڑے بھرپور انداز میں مسکرائے پھر بولے۔

"نہیں صرف حلوے کی بات نہیں۔ وہ سری پائے چھولے اور نہاری بنانے میں بھی جواب نہیں رکھتی۔"

"زن مرید ہے پورا۔ پتا نہیں بیوی نے کیا گھول کر پلا دیا ہے، ہمارے میاں نے یوں کبھی ہماری تعریفیں نہیں کیں اور تمہارے میاں کو دیکھ کر تو لگتا ہے اسے سرے سے تم میں کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں، قصور تمہارا بھی ہے یوں اجڑے حلیے میں جو رہتی ہو ویسے کیا کرتا ہے تمہارا میاں؟"

خالہ اختری اپنی سیٹ سے ادھر جھکی ہدیٰ سے سوال کر رہی تھیں۔

"ڈاکٹر ہیں۔" اس نے مری مری آواز میں جواب دیا اور چپکے سے ایک نظر شماس پر ڈالی۔ کہیں وہ تو یہ ساری باتیں نہیں سن رہا، شکر کیا وہ جمیل کے ساتھ باتوں میں لگا ہوا تھا۔

"اچھا ڈاکٹر ہے؟" خالہ اختری کی انداز میں ستائش تھی بولیں۔ "میں تو پہلے ہی پہچان گئی تھی یا تو ڈاکٹر ہے یا پھر وکیل، اے بی بی! ڈاکٹروں کے ساتھ تو نرسیں بھی کام کرتی ہیں تم ذرا ہوش میں رہا کرو اور اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔"

"خالہ! کیوں ان کی ہنستی کھیلتی زندگی کو برباد کرنے لگی ہو۔" جمیل نے ایک نظر گھبرائی ہوئی ہدیٰ پر ڈالی اور پھر مسکراہٹ دبا کر خالہ اختری سے کہا۔

"تم چپ رہو۔" انہوں نے بڑی سرعت سے ڈانٹا پھر دوبارہ ہدیٰ کی طرف متوجہ ہوئیں مگر اس نے رسالہ کھول کر درمیان سے ہی کوئی افسانہ پڑھنا شروع کر دیا۔ خالہ کو اس کی یہ حرکت بہت بری لگی۔ منہ بنا کر انوری کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ لڑکی خاصی بد دماغ ہے البتہ میاں اچھے مزاج والا ہے۔

"اماں! ملتان کب آئے گا؟" بشی نے کھانے سے انصاف کرتے ہوئے بے قراری سے سوال کیا۔

"کیوں کیا سرگودھا کے بجائے ملتان اترنے کا ارادہ کر لیا ہے اگر یہ بات ہے تو اچھا ہے۔ شگو بے چاری کو بھی اپنی سیٹ واپس مل جائے گی یہاں بے چاری بڑی تنگ ہے۔" وہ شگو کی گھبراہٹ اور سمٹنے سمٹانے سے محظوظ ہو کر کہہ رہا تھا۔

"مجھے وہاں سے سوہن حلوہ اور کھسّے خریدنے ہیں۔"

"دونوں ہی کھانے کی چیزیں، تم کھانے پینے کے علاوہ بھی کچھ سوچ لیا کرو۔" بشی نے سخت برا مانا

اور بولی۔
''میں نے کھٹے پہننے کے لیے خریدنے ہیں۔''
''پتا نہیں وہ ہاتھیوں کے ناپ کے بناتے بھی ہیں یا نہیں؟'' اس نے بشی کے بھاری اور بڑے پاؤں پر چوٹ کی۔
''اماں! تم چپ کر کے بیٹھی ہو۔ کچھ کہتی کیوں نہیں ہو اسے؟''
''میں سب سن رہی ہوں جواب اسے ایک بار ہی دوں گی۔ تم بُرا نہیں مانو۔ صبر سے بیٹھو۔'' انہوں نے بیٹی کو تسلی دی۔
''کیا آپ دونوں میں لڑائی ہے جی، میں نے تو ایسے میاں بیوی کبھی نہیں دیکھے۔ قسم سے اگر میری بیوی ساتھ ہوتی تو ایک منٹ خاموش نہ بیٹھتی۔'' بھائی الیاس نے تفصیلی جائزے کے بعد حیرت کا اظہار کیا تھا۔
''اصل میں دونوں ہی پڑھے لکھے، مہذب اور کم گو ہیں۔'' جمیل نے کھلی کھلی چوٹ کی مگر الیاس بھائی سمجھے نہیں بولے۔
''مجھے تو گڑبڑ لگتی ہے، میاں بیوی میں صلح صفائی کروانا بڑے ثواب کا کام ہے اور ہمیں یہ ثواب ضرور کمانا چاہیے۔''
''الیاس بھائی! آپ نماز روزے سے تو کوسوں دور ہیں، ایسے ثواب اب کما کر جنت خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر میرا خیال ہے ناکامی ہوگی۔''
''نہیں جمیل! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ بھابی جی بالکل چپ بیٹھی ہیں اور ڈاکٹر باؤ بجائے انہیں منانے کے تم سے باتوں میں لگے ہیں۔ نئی نئی شادی ہو اور ایسے حالات، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ مجھے یاد ہے جب میری شادی ہوئی تو۔''
''خدا کے لیے اب وہ قصّے نہ دہرانے بیٹھ جانا۔ یہاں خواتین بھی بیٹھی ہیں۔''
''اب میں کوئی ایسی باتیں بھی نہیں کرتا۔'' الیاس بھائی نے شرمندہ ہو کر آہستہ سے کہا اور پھر کھانے کے برتنوں میں جھانک کر ایک عدد کباب حاصل کر لیا۔
''اچھے لوگ ہیں یہ۔'' شماس نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ ہدیٰ کی طرف دیکھا۔ اور دھیرے سے کہا۔ جواب میں وہ کچھ نہیں بولی۔ سر کو تھوڑا جھکا لیا۔
''زندگی یوں تو نہیں کٹتی، تنہا اور اداسی، کیا خیال ہے آپ کا؟'' ان لوگوں کی باتیں شماس کو ایک نئی اور روشن راہ دکھا گئی تھی۔
''میرے خیال سے کیا ہوتا ہے ہوگا تو وہی جو قسمت میں لکھا ہے۔''
''مگر یہ بھی سچ ہے کسی حد تک قسمت ہمارے ہاتھ میں بھی ہے، ہم اپنے عمل سے اپنی زندگی خوب صورت بھی بنا سکتے ہیں اور بدصورت بھی۔''
''وہ کون ہوگا جو خود اپنے آپ کو برباد کرے۔'' ہدیٰ نے اس کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔
''ہاں یہ سچ ہے۔ خود سے دشمنی جانتے بوجھتے نہیں کی جا سکتی مگر ہمارے غلط فیصلے ہی ہمیں تمام عمر کے افسوس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں پہلے تولو پھر بولو۔ ہدیٰ ہم ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ مگر ہم میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے ہماری تنہائی اور تنہائی زندگی کا بہت بڑا دکھ ہے، دکھ انسان کو انسان کے قریب کر دیتے ہیں۔ اگر آپ میری بات پر غور کیے بغیر چلی جاؤ گی تو یقین کرو، مجھے تمام عمر افسوس رہے گا۔ صرف اس لیے نہیں کہ آپ نے مجھے ٹھکرا دیا بلکہ اس لیے بھی کہ آپ خلوص کی قدر نہیں کر سکیں اور دنیا کی بھیڑ میں پھر اکیلی رہ گئیں۔''
اس کے لہجے میں سچائی اور گہرائی تھی۔ یہ پہلی نظر کی محبت کی بات نہیں تھی۔ یہ تو ایک سے حالات تھے جو انہیں ایک دوسرے کے اتنے قریب لے آئے تھے۔
''آپ تو کامیاب ڈاکٹر ہیں آپ کے لیے رشتوں کی کیا کمی۔ ایک سے ایک خوب صورت امیر لڑکی آپ کو مل سکتی ہے جبکہ میں نہ تو خوب صورت ہوں اور نہ ہی امیر۔''
''آپ میرے لیے تو بہت خوب صورت ہیں، میں ایسی لڑکی کو لے کر کیا کروں گا جس کا چہرہ تو حسین

ہو مگر دل میرے درد کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ وہ دولت میرے کس کام کی جس کے ساتھ سکون نہ ہو۔ مجھے تو ایسا ساتھی چاہیے جو میری جیسی سوچ اور جذبات رکھتا ہو۔"

جمیل دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تو لڑکی کو سمجھا رہے ہیں، اس کی طرف مائل ہیں۔ مگر وہ کچھ بے یقین ہے یا شاید جھجک رہی ہے، وہ اپنی سیٹ سے اٹھا شماس کے پاس ہدیٰ کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"خلوص کی قدر کریں اور خوب صورت لمحوں کو ہاتھ میں لے کر مٹھی اس زور سے بند کرلیں کہ یہ لمحے ہمیشہ کے لیے قید ہو کر رہ جائیں۔ میں یہ مشورہ پورے خلوص سے دے رہا ہوں، آپ سوچ رہی ہوں گی "تو کون میں خوامخواہ" ایسی بات نہیں ہے، اصل میں، میں تو ہر کسی کی بھلائی چاہنے والا سب کو اپنا سمجھنے والا لڑکا ہوں، سب کا دوست اور دشمن کسی کا نہیں۔ آپ کو بہن اور اچھی دوست سمجھ کر مشورہ دے رہا ہوں مجھے پورا یقین ہے آپ دونوں بہت خوش رہیں گے۔"

ہدیٰ نے پلکیں اٹھا کر شماس کی طرف دیکھا۔ وہ امید اور یقین کے ساتھ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہدیٰ نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔ شماس نے کچھ الجھن کے ساتھ جمیل کی طرف دیکھا وہ ہنس پڑا اور بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو عمر کتابوں میں گنوا دی ہے۔ جبکہ ہم کتابوں کے ساتھ ساتھ چہرے بھی پڑھتے رہے ہیں اور اس لیے پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سو فی صد راضی ہیں۔"

"کیا واقعی؟" شماس نے براہ راست ہدیٰ سے جواب چاہا۔ وہ لبوں سے یہ بات کہتی جھجک رہی تھی۔ جمیل نے کہا۔

"وقت مت گنواؤ لڑکی۔ بلکہ وقت کی قدر کرنا سیکھو۔" تب اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ دونوں کو بہت مبارک ہو۔" جمیل نے پرجوش انداز میں خاصی اونچی آواز میں کہہ دیا۔

"کس بات کی مبارک باد؟" سب متوجہ ہوئے۔

"آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے۔" اس نے بات بتائی۔

خالہ اختری نے پوری آنکھیں گھمائیں پھر ہدیٰ کے چہرے پر گاڑ دیں اور بولیں۔

"ابھی تو کہہ رہے تھے دوسرا مہینہ ہے۔"

ہدیٰ نے گڑبڑا کر جمیل کی طرف دیکھا وہ مسکرایا اور بولا۔

"خالہ ان کے ہاں سالگرہ مہینوں کے حساب سے منائی جاتی ہے۔"

"اب ہم ایسے الو بھی نہیں ہیں، مجھے تو پہلے ہی شک تھا بیاہ شیاہ کچھ نہیں ہوا۔ دل میں کچھ کالا ہے۔"

"تو اور کیا نہ زیور نہ گہنا۔ ایسی ہوتی ہیں بھلا دلہنیں۔" باجی انوری نے بھی وار کیا۔

"پڑھی لکھی دلہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں اور دو مہینے والی بات تو شرما کر ڈاکٹر صاحب نے کہہ دی تھی۔ اصل میں دوسرا سال ہے ان کے بیاہ کو۔"

خواتین کو جمیل کی بات پر یقین نہیں آیا وہ کچھ مشکوک ہی تھیں اور جمیل ان سے کہہ رہا تھا۔

"بہت مبارک ہو اب آپ میں واقعی محبت بھی ہو چکی ہے، جبھی تو دنیا والے نظر بدل رہے ہیں۔ یہ گہرے پیار اور خوب صورت محبت کی نشانی ہے۔ آپ ان نظروں کی پروا مت کریں، میرے اور شگو کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیں۔ ہماری محبت پھلے پھولے اور کامیابی سے ہمکنار ہو۔"

"ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔" دونوں نے یک زبان ہو کر اس مخلص لڑکے کو دیکھا۔

سفر تو چند گھنٹے کا تھا مگر کتنا یادگار اور حسین رہا کہ اس سفر میں تمام عمر کا ہمسفر مل گیا۔ اچھا دوست ملا اور زندگی کے رنگ بدلنے لگے، پھیکے پھیکے مٹیالے رنگوں کی جگہ شوخ چمک دار زندگی کی نوید دیتے رنگوں نے لے لی اور ان رنگوں کی تازگی نے چہروں اور روح کی ساری تھکن دور کر دی۔ موسم اب بھی وہی ہے مگر ہوائیں جب ان تک آتی ہیں تو گرم نہیں ہوتیں۔ نسیم سحر محسوس ہوتی ہیں اور یہ سارا اعجاز محبت کا ہے۔

☆

''ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو اور میری بات غور سے سنو!'' بلال نے نائمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا ''اگر تم تھوڑا دل بڑا کر دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا تم دیکھ تو رہی ہو سب کتنے خوش ہیں۔ امی بھی یہی چاہتی ہیں اور بھائی، بھابھی انہیں تو لگتا ہے جیسے ہفت اقلیم کی دولت ملنے والی ہو اگر تم مان جاؤ تو۔''

بلال نے بڑی امید سے نائمہ کی طرف دیکھا۔ مگر اس کے تاثرات میں ذرا برابر تبدیلی نہ آئی وہ بس خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھے گئی۔ اب بلال زچ ہوا اور ذرا تیز لہجے میں بولا۔

''اب کیا منہ میں گھنگھنیا ڈالے بیٹھی ہوئی ہو۔ کچھ تو بولو۔''

''میرا خیال ہے کہ میں آپ کو جواب دے چکی ہوں اور میرا اب بھی وہی جواب ہے یہ ناممکن ہے۔''

''سب کچھ ممکن ہے بس اسے تمہاری ضد ناممکن بنا رہی ہے۔''

بلال کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا۔

''ضد کہاں بلال یہ تو میری التجا ہے۔'' نائمہ کراہی۔

''مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ساتھ تو بھائی صاحب کا گھر ہے وہ کون سا سمندر پار رہتے ہیں۔''

''بات سمندر پار کی نہیں ہے۔ بات میرے دل کی ہے۔''

''دیکھو نائمہ۔'' بلال نے خود کو تھوڑا ٹھنڈا کیا۔ ''اگر خدا نے ہمیں ایک چیز دی ہے تو.....''

''خدا کا خوف کریں بلال وہ کوئی چیز نہیں ہے میری اولاد۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔'' نائمہ نے بات مکمل نہ ہونے دی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' بلال نے اپنے جذبات کو کچھ قابو کیا اور لمبا سانس کھینچ کر بولا۔

''دیکھو، اللہ تعالیٰ نے ہمیں چار بچے دیے ہیں۔ اور بھائی صاحب خالی ہاتھ ہیں۔ اگر حرا، بھائی اور بھابھی کی گود میں ڈال دیں تو ہمارے پاس نمرا، شاہ میر اور شاہ نل تو ہیں ناں اور ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کو

یہ عمل پسند آئے اور.....

نائمہ بات کاٹتے ہوئے تقریباً چیخ کر بولی۔

''بلال! آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حرا کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم اس کی کمی باقی بچوں سے پوری کریں گے۔''

''بلال آپ کیوں نہیں سمجھتے، وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ اگر جسم کا ایک حصہ کٹ جائے تو باقی جسم اس کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔''

نائمہ کی آواز شدت جذبات سے پھٹ سی گئی۔

''بس! میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی چاہے اس کے لیے مجھے آخری حد تک کیوں نہ جانا پڑے۔ میں آخر تک لڑوں گی چاہے تم مجھے اپنی زندگی سے کیوں نہ نکال دو مگر میں اپنی بیٹی کسی کو نہیں دوں گی۔''

نائمہ آنکھوں میں سیلاب لیے کمرے سے نکل گئی۔ اور اپنے پیچھے ہکا بکا شوہر چھوڑ گئی۔

بلال تقریباً صوفے پر گر سا گیا۔ یہ نائمہ اس کی من پسند فرماں بردار بیوی کیا کہہ گئی تھی۔ کیا ان کا تعلق اتنا کمزور تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی وہ تو اس کی ہر خواہش بن کہے جان جاتی ہر بات یوں مانتی جیسے اٹل ہو۔ اس کا پیار، غصہ کوئی چیز اس پر اثر کیوں نہیں کر رہی تھی۔

وہ اسے کس مشکل میں ڈال گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اگر ایک طرف من چاہی بیوی تھی تو دوسری طرف باپ جیسا بھائی تھا۔ جس نے زندگی میں صرف دیا ہی تھا۔ مانگا کچھ نہیں تھا اور اب اگر مانگ ہی لیا تھا تو وہ کیسے انکار کرتا۔

بھائی صاحب کی شادی کو بارہ سال ہو گئے تھے مگر ابھی تک اولاد کی خوشی سے محروم تھے نہ تو ڈاکٹر چھوڑے اور نہ ہی عامل بابے مگر سب بے سود۔ آخر تھک کر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے اپنی جھولی پھیلائی تھی۔ تو وہ کیسے انکار کرتا؟ یہ ایسا نہیں تھا کہ اسے اپنی اولاد سے محبت نہ تھی۔ مگر بھائی کی محبت کا پلڑا زیادہ بھاری تھا۔

بھائی بھی وہ جس نے باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ ہر چیز مانگنے سے پہلے مہیا کی تھی۔

سوچ سوچ کر دماغ درد سے پھٹنے لگا۔ چائے اور دوائی کی تلاش میں جوں ہی کچن کی طرف جانے لگا تو سیڑھیوں پر ہلکی زرد روشنی میں اسے نائمہ نظر آئی۔ چائے اور دوائی کا ارادہ موقف کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر بات کرنے یا پھر منت کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور چپکے سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جیسے نئے سرے سے تمہید باندھنے لگا۔

''دیکھو نائمہ میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ ہم.....''

نائمہ نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی اور تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اب میری زندگی پرسکون ہے۔ اب اس میں کوئی ہلچل نہیں ہوگی مگر میں یہ بھول گئی تھی کہ اکثر بیٹیاں ماؤں جیسی قسمت لے کر پیدا ہوتی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' بلال نے نا سمجھنے والے انداز میں دیکھا۔

''میں بہت چھوٹی تھی شاید سال یا ڈیڑھ سال کی۔'' نائمہ نے دھیرے سے کہا۔

''ہمارے گھر میں بھی بالکل ایسے ہی حالات تھے۔ ہمارے تایا بے اولاد تھے اور بدقسمتی سے بابا کو ان سے بہت محبت تھی۔ اتنی محبت تھی کہ اس میں وہ اپنی اولاد کو بھی بھول گئے۔ بابا نے مجھے تایا کی گود میں ڈال دیا۔ مجھے یہی بتایا گیا کہ وہ میرے والدین ہیں سب ٹھیک رہا۔ وہ میرا حد سے زیادہ خیال رکھتے کبھی کسی چیز کے لیے نہ ترسنا پڑا اور نہ کوئی خواہش دبانی پڑی۔ میں آٹھ سال کی تھی تب پتا نہیں کیا ہوا اچانک تایا اور تائی کو اپنا گھر نامکمل لگنے لگا۔ انہیں اپنے کاروبار اور جائیداد کے لیے وارث اور بڑھاپے کے لیے سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اور تائی بھی ان کی ہمنوا بن گئیں۔ جب بابا لوگوں نے منع کرنا چاہا تو انہوں نے بس اتنا کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم لوگوں کی نظر میرے کاروبار پر ہے۔''

بابا خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئے مگر آتے

ہوئے مجھے بھی ساتھ لے آئے۔ میرا خیال تھا کہ تایا اور تائی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ وہ مجھ سے دور نہیں رہ سکیں گے مگر وہ تو شاید اسی انتظار میں تھے۔

وقت گزرنے لگا تایا کی دوسری شادی ہوگئی اور انہیں وارث بھی مل گیا۔ میں اپنے بہن، بھائیوں اور امی بابا کے گھر آ گئی۔ نئے اسکول میں ایڈمیشن ہوگیا ہر چیز جوتے، کپڑے، کھلونے ہر چیز نئی آ گئی۔ کچھ عرصہ بعد سب کچھ معمول پر آتا گیا۔ لوگ اس واقعہ کو بھولنے لگے بابا اور تایا کے تعلقات ختم ہوگئے۔ دیکھنے والوں کو سب ٹھیک نظر آنے لگا۔"

مگر اس واقعہ کا اہم کردار تو جیسے کسی کو نظر ہی نہ آیا۔ اس سب میں میں کہاں تھی؟ میں نے کیا محسوس کیا؟ میرے دل پر کیا گزری؟ کسی کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور پھر سے تایا اور تائی کا رویہ جیسے میں ایک دم ان کے لیے اجنبی ہوگئی اور میرے سگے ماں باپ بہن، بھائی اور شاید ان کے لیے بھی۔ کئی سال ان سب کے دل میں اپنی جگہ نہ بنا سکی۔

بلال بتائیں مجھے! کیا آپ اس بات کا تصور کر سکتے ہیں کہ آپ کے ماں، باپ بدل جائیں زندگی کے آٹھ سال جنہیں آپ اپنا سب کچھ سمجھیں اچانک وہ پرائے ہو جائیں۔ اچانک بتایا جائے کہ وہ آپ کے کچھ نہیں لگتے تو آپ کس کرب اور تکلیف سے گزریں گے کیا اس درد کو محسوس کر سکتے ہیں۔

"نہیں بالکل نہیں.....؟" وہ رک کر خود ہی بولی۔

"آپ ان لمحوں کے دکھ کو کبھی خود پر محسوس نہیں کر سکتے۔ لمحوں میں اگر کوئی گھائل ہوا تو وہ میں تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں جیسے کسی میلے میں کھو گئی ہوں۔ اس گھر میں میرے بہن بھائی تھے میرے حقیقی ماں باپ تھے مگر میں کسی کے مزاج کو نہیں سمجھتی تھی۔ اس گھر میں تو مجھے جگہ مل گئی مگر ساری زندگی کسی کے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ میں جو کلاس کی سب سے ذہین اسٹوڈنٹ تھی ایک کلاس میں دو دو سال لگانے لگی۔ میں جو تتلیوں کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ ایک دم سہم گئی اندر سے خالی ہوگئی۔ کتنے سال اس درد، تکلیف سے نکلنے میں لگے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ تایا کی فیملی سے تعلقات بھی بحال ہوگئے تقریباً سب کچھ پہلے جیسا ہوگیا۔

"اگر نہیں بدلا تو میرے اندر کا موسم تھا۔ ساری دوریاں سمٹ گئیں۔ نہ پر ہوا تو وہ میرے اندر کا خلا تھا یہ خلا تب کم ہونا شروع ہوا جب میری آپ سے شادی ہوئی۔ آپ کی توجہ اور محبت اس خلا کو بانٹنے لگی۔ اور آہستہ آہستہ میرے اندر کا درد کم ہونے لگا مگر۔

جب آپ نے حرا کو بھائی صاحب کی گود میں ڈالنے کی بات کی تو مجھے لگا وہ حرا نہیں میں ہوں جو ایک بار پھر آزمائش سے گزروں گی۔"

نائلہ باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"بلال آپ نے ایک بار مجھ بکھری ہوئی کو سمیٹا ہے اب دوبارہ بے رحم ہواؤں کے سپرد مت کریں۔ یہ مجھے اڑا لے جائیں گی۔ اب مجھ میں نہ ہمت ہے اور نہ برداشت کا حوصلہ۔"

اس نے بلال کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"خدارا یہ ظلم مت کریں۔"

بلال جیسے ایک دم ہوش میں آیا اور بے ساختہ اس کے جڑے ہوئے ہاتھ پکڑ لیے۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو۔ بس چپ کر جاؤ۔"

"نہیں پہلے آپ وعدہ کریں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کریں گے جس کے لیے مجھے ایک بار پھر پل صراط سے گزرنا پڑے۔" نائمہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں میرا وعدہ ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" بلال نے نائمہ کو بازوؤں میں بھینچتے ہوئے کہا۔ "جیسا تم چاہتی ہو سب ویسا ہی رہے گا۔ اب کوئی دکھ تمہارے پاس نہیں آئے گا۔" حقیقتاً آج بلال نے نائمہ کے کرب کو اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔

مسلسل اس کے بال سہلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ بھائی صاحب کو دوسری شادی کے لیے رضا مند کرنا مشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو وہ ایک بار پھر نائمہ کی کہانی نہیں دہرائے گا۔

☆

مکمل ناول

گل ارباب

سب جھوٹ نہیں ہوتا

''چھوڑ دے پشمینے اس اللہ ماری کتاب کا پیچھا، ہزار بار کہا ہے کچھ گھر داری سیکھ لے، پرائے گھر جانا ہے تجھے، تیرے داجی نے خانساماں نہیں دینا جہیز میں۔''

پشمینہ نے ڈائجسٹ تکیے کے نیچے بڑے سلیقے سے یوں رکھا جیسے سرورق پر موجود سجی سنوری حسینہ حقیقت میں بیٹھی ہے اور ذرا سا تکیہ لگنے سے اس کا گہرا تہہ دار میک اپ خراب ہو جائے گا۔

''مور جانہ! سب سے پہلے تو مائیں سسرال کو پرایا گھر کہہ کہہ کر نفسیاتی طور پر بیٹیوں کو یہ باور

کرادیتی ہیں کہ بٹیا، اس گھر کو کبھی بابا کا گھر نہ سمجھنا، مطلب یہ ہوا کہ نہ سسر کو دادی والا مقام دینا نہ ہی ساس کو مورجان والا۔"

ماں نے ان سنی کر کے پوچھا۔

"اصل بات کی طرف آؤ، سوال کا جواب دو۔"

"مورجانہ! مجھے اس ڈائجسٹ کے ہوتے ہوئے گھرداری سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ کچے قیمے کے کباب۔ پلاؤ بریانی۔ ٹینڈوں کے کوفتے، کدو کا حلوہ، پنیر سے بنائی گئی چودہ قسم کی ترکیبیں۔ ہر ملک کے سلاد۔ چین کے کھانے، ترکی ردس، ملائیشیا کے قومی پکوان۔ ہر چیز ہے اس میں پوری دنیا سمٹ کر اس کتاب میں سمائی ہوئی ہے۔"

وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے بولی تو مورجانہ نے دھکا دے کر پرے ہٹایا۔

"تیرے یہ ہی ڈرامے تو مجھے پسند نہیں۔ یہ قصوں کہانیوں والی زندگی صرف کتابوں میں ہی ملتی ہے۔ ایسی زندگی ڈھونڈنے نکلے گی تو پاؤں میں ہی نہیں دل پر بھی چھالے پڑ جائیں گے۔"

وہ مورجانہ کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دی اور ان کی گھوریاں نظر انداز کرتے ہوئے شریر لہجے میں بولی

"ویسے قسم کھا کر بتائیں مورجانہ! کہ ابھی ابھی آپ نے جو بولا ہے، وہ شبنم اور ندیم کی کسی فلم کا ڈائیلاگ ہے کہ نہیں؟"

وہ ذہن پر زور دے کر گنگنانے لگی۔

''سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جان من
تجھ کو میں دے سکوں گا.....''

اب کی بار مورجانہ نے تکیہ اٹھا کر شکارے مارتا ڈائجسٹ نکالا اور اسے مارنے ہی لگی تھیں کہ وہ تڑپ کر چیل کی طرح جھپٹی اور ان کے ہاتھ سے ڈائجسٹ کھینچ کر سینے سے چمٹالیا۔

''دیکھ لے اس مانی کی بیوی کو، کہیں چوٹ شوٹ تو نہیں لگ گئی۔ اگر لگ بھی گئی ہوگی تو اس نے لمبے بالوں کو جھٹکا دے کر کہنا ہے۔ جا تجھے معاف کیا مارنے والے۔''

وہ سرورق پر مسکراتی حرامانی کی تصویر پر نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے حیرت سے ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔

''واہ مورجانہ! خود تو ڈرامے فلمیں سب دیکھیں اور مجھ غریب کا ڈائجسٹ پڑھنا گوارا نہیں۔ نہ آپ پڑھنے دیتی ہیں نہ ہی داجی کے سامنے پڑھ سکتی ہوں۔ اچانک کہیں پڑھتے ہوئے دیکھ بھی لیں تو یوں گھورتے ہیں جیسے ان کی نسوار کی ڈبیا میں نے کہیں چھپائی ہو۔''

مورجانہ اکثر داجی کی نسوار کی ڈبیا چھپا لیتی تھیں اس وقت تک، جب تک کہ داجی برداشت کر سکتے تھے، دوسری صورت میں کسی کو بھیج کر بازار سے دوسری منگوا لیتے یا وہ ان کے مسلسل سر درد پر ترس کھا کر ڈبیا سامنے رکھ دیتیں۔

''یاد ہے نا، گل بانو کو اس کے شوہر نے طلاق کیوں دی تھی؟'' مورجانہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو اسے وہ سب یاد کر کے ہنسی آ گئی۔

''وہ تو سراسر ظلم کیا تھا اس یوسف خان لالہ نے گل بانو بھابھی پر۔ اس میں ڈائجسٹ پڑھنے والیاں ویسے ہی بدنام ہوگئی تھیں۔''

وہ ڈائجسٹ دوبارہ سے تکیے کے نیچے رکھ کر بولی تو مورجانہ نے اسے گھورتے ہوئے جواب میں تلخ انداز میں کہا۔

''یوسف خان کا قصور نہیں تھا۔ وہ صبح چار بجے سارے رات کا سفر کر کے ٹرک لایا اور پانچ بجے تک سامان اتارتا رہا۔ پانچ بجے گھر آ کر سویا اور صبح ساڑھے چھ بجے نئی نویلی بیگم نے اس کتاب میں لکھی کہانی کی ہیروئین بن کر اسے اٹھانے کے لیے گرم گرم چائے کی پیالی میں اس کی انگلی ڈبو دی

اسے شرارت کہنے والی دلہن بیگم کو یہ تو پتا تھا کہ میاں کو اٹھانے کا یہ طریقہ افسانوی ہے لیکن یہ نہیں تھا پتا کہ افسانے کی ہیروئین پیالی میں چائے چینی ڈال کر پانی اور دودھ ڈالتی ہے، بڑے سے بنگلے کے کچن اور بیڈروم کے درمیان ایک بڑا سا لاؤنج حائل ہے اور پانچ منٹ اسے اپنے میک اپ کو ٹھیک کرنے میں بھی لگتے ہیں۔ جب وہ میاں کی انگلی چائے میں ڈبو کر نیند سے جگاتی ہے تو چائے کی ہلکی سی نیم گرمی سے سکون ملتا ہے۔ جبکہ یہاں پہلے ڈرائیور شوہر کی پسند کی کھوکھے کی چائے بنتی ہے۔ دو پیالی دودھ میں پتی ڈال کر اتنا ابالو کہ بے خبر سوئے شوہر کی انگلی ہی جل جائے۔ چائے تھرماس سے ڈالتے ہوئے اسے اندازہ تو ہوا ہوگا کہ ابلتی ہوئی چائے ہے اور پٹھان بچہ ہے لیکن پٹھان بھی انسان ہوتے ہیں بے شک سخت جان ہوتے ہیں۔''

مورجانہ کی تفصیلی بات سن کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

''مورجانہ آپ نے تو نہیں دیکھا لیکن اس دن یوسف لالہ کی انگلی پر جو آلو جتنا بڑا چھالا بنا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کو دکھا رہے تھے اور گل بانو بے چاری شرمندہ سی اپنی ہی بغل میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔''

''ہاں افسانوں کی لڑکیاں تو پھر یوں ہی کرتی ہیں نا؟''

مورجانہ کے طنز پر وہ پوچھ بیٹھی۔

''آپ کو کیسے پتا کہ افسانے کی لڑکی کیا کرتی ہے؟ کبھی ایک کہانی بھی نہیں پڑھی پھر بھی نہ جانے کیوں ساری مائیں افسانوں کی لڑکیوں سے اللہ واسطے کا بیر رکھے ہوئے ہیں؟''

''پڑھی نہیں مگر اندازہ تو ہے نا۔''

وہ بھی تو مورجانہ تھیں پشمینہ کی بھی ماں۔

''گل بانو کے ہاتھ میں بھی تو ہر وقت یہ ہی کتاب ہوتی تھی۔'' انہوں نے ڈائجسٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مور جانہ! اس کے عمل سے تو نہیں لگتا کہ اس نے یہ ڈائجسٹ پڑھے بھی ہیں۔ پڑھنے والیاں سیکھتی ضرور ہیں اور سچ کہتی ہوں، جتنا بندہ پڑھنے سے سیکھتا ہے۔ اتنا جینے سے بھی نہیں سیکھ پاتا، مطلب یہ کہ زندگی سے بڑی استاد کتاب ہوتی ہے۔ ویسے یوسف لالہ نے طلاق انگلی جلانے پر تو نہیں دی تھی۔''

مور جانہ نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے ہاتھ میں پکڑے شیشے کی دھندلاہٹ صاف کی اور اپنے ڈھلتے حسن کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''ہاں تو وہ کون سا حقیقت پسندی والا کام کیا تھا اس نے۔ افسانوی ہی تھا نا۔ ارے دسمبر کی ٹھنڈی یخ صبح اور یوسف خان کو گلے کا انفیکشن۔ لرزے والے بخار میں ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ گل بانو بی بی سرتاج کے منہ سے لحاف ہٹا کر بولیں۔

''سرتاج چائے پی لیں۔'' اس دن کے بعد چائے میں انگلی ڈبونے سے توبہ کر لی تھی کیونکہ سارے گھر میں جو اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی دیکھتا، اپنی انگلیاں چھپانے لگتا تھا۔ اس بے وقوف نے اپنے لمبے بھیگے بالوں سے ٹپکتے ٹھنڈے پانی کے قطرے اس لرزے کے بخار میں تپتے مریض پر یوں گرائے جیسے گرمی کی شام ہم کچے آنگن میں مٹی پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔''

مور جانہ کو حال ہی میں انفیکشن کی وجہ سے بخار ہوا تھا اور انہوں نے چار چار کمبلوں میں گھس کر بھی چین نہیں پایا تھا، اس لیے بات کرتے ہوئے، انہیں ٹھنڈ سے جھرجھری سی آ گئی تھی۔

''ہاں، تو اس میں گل بانو کا اتنا قصور تو نہیں تھا کہ طلاق ہی دے دیتے وہ۔''

''ہاں ہاں۔ ایک سو تین بخار میں لرزے کی حالت میں تیرے داجی پر سے کمبل ہٹا کر میں بالوں سے پانی سیدھا ان کے منہ پر ٹپکاؤں تو وہ ہیرو کی طرح اچھل کر ٹپ ٹپ برسے پانی گانا تو نہیں شروع کریں گے بلکہ سیدھا دھی کریں گے جو یوسف نے کیا۔''

''داجی کی اتنی ہمت؟''

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تو مور جانہ قریب آئیں۔

''یہ تم کوئی جادو وغیرہ تو نہیں سیکھ رہی ہو جو بڑبڑاتی رہتی ہو؟'' مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں مور جانہ! اس ڈائجسٹ میں بہت سارے وظیفے بھی ہوتے ہیں۔ میں اچھے رزلٹ کے لیے وظیفہ پڑھتی ہوں۔'' وہ بچوں کی طرح انہیں سمجھا رہی تھی۔

''کوئی ایسا وظیفہ ہے جو بیٹی سے ڈائجسٹ کا نشہ چھڑا دے؟''

ان کا معصوم بن کر پوچھنا پشمینہ کو ہنسا گیا لیکن وہ بنا کچھ کہے بات ختم کر کے اندر چلی گئی۔ جاتے ہوئے صحن میں پڑی چارپائی سے ڈائجسٹ اٹھانا نہیں بھولی تھی۔ اس کے پسندیدہ ناول سالم کی نئی قسط آئی تھی اور وہ بے قرار تھی کہ کچھ مزید ناقابل یقین واقعات پڑھنے کو ملیں گے۔

کھلتے ہوئے سنہری مائل گورے رنگ، اونچے لمبے قد کے ساتھ چمکیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی پشمینہ کو بچپن ہی سے بہت پڑھے لکھے اعلا عہدوں پر فائز لوگ اچھے لگتے تھے۔ اس پاس کے سارے مرد پڑھ لکھ کر اپنی زمینداری وغیرہ کرتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی شادی جس سے ہو وہ ان سب مردوں سے جدا اور منفرد ہو۔ اعلا تعلیم کی ڈگری کے ساتھ اس کے نام کے ساتھ اعلا افسر بھی لکھا ہو۔

وہ ہزار خوبیوں کو نظر انداز کر کے آس پاس کے سارے لڑکوں کو ناپسند کرتی تھی۔

''توبہ ہے ودانہ! تم شہباز لالہ سے شادی پہ کتنی خوش لگ رہی ہو بمشکل پرائیویٹ بی اے پاس ہیں وہ'' وہ اپنی چچازاد ودانہ کو چھیڑ رہی تھی۔

''میرے لیے تو جب تک کوئی اعلا تعلیم یافتہ بہت بڑا آفیسر نہ آیا میں نے شادی وادی نہیں کرنی۔ بندے کے پاس اعلا تعلیم کی ڈگری نہ ہو تو سب کچھ

ہوتے ہوئے بھی شوہدا نظر آتا ہے۔" وہ اپنے آئیڈیل ہیرو کے بارے میں سوچتے ہوئے کہتی۔

آج بھی ڈائجسٹ پڑھتے پڑھتے تھک کر سینے پر رکھتے ہوئے وہ اسے تصور کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جو اس کی نیندیں چرانے آیا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

"پشمینہ! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" وہ ابھی رجسٹر کھول کر نوٹس دیکھنے لگی تھی کہ..... اس کی سہیلی گلونہ نے رازدارانہ انداز میں قریب آ کر کہا تو اس کے خیالات کی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ مسلسل جو سوچتی آ رہی تھی اسے لگ رہا تھا وہ سب سچ ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ چند دنوں سے اسی ایک جملے کے انتظار میں کئی بار اس کی طرف دیکھتی تھی آج وہ بول پڑی تھی۔ اس سے بڑی بات کوئی نہیں تھی۔ اس کے آس پاس جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

"یقیناً یہ مجھے اپنے ہینڈسم بھائی کا یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ اسے مجھ سے پہلی نظر میں ہی محبت ہو گئی ہے اور وہ اپنی ماں کو ہمارے گھر بھیجنا چاہتا ہے۔ اتنی آسانی سے تو کوئی ناولٹ یا ناول کی ہیروئن نہیں مانتی۔ میں بھی پہلے تو ذرا سے نخرے شخرے دکھاؤں گی پھر اس کے بھائی کی خودکشی کی دھمکی اور گلونہ کی منت سماجت پر مان جاؤں گی۔"

وہ تصور میں ازرک خان کی گہری نیلی آنکھوں کے سحر میں ڈوبتے ابھرتے سوچ رہی تھی کہ گلونہ کی آواز نے اسے خیالوں کی حسین و جمیل وادی سے کھینچ کر سیدھا حقیقت کے تپتے صحرا میں پھینک دیا جہاں خدشات امیدوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اب اللہ جانے دونوں میں جیت کس کی ہوتی ہے اگر خدشے جیت گئے تو میں ہار جاؤں گی اور امیدیں جیت گئیں تو خدشے اپنی موت آپ ہی مر جائیں گے۔

"کہاں گم ہو یار! ایک راز کی بات کرنی تھی تجھ سے۔"

وہ شدید قسم کے اشتیاق کو دبانے کی کوشش میں اور لاپرواہ نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے اور ایکٹنگ کر گئی۔

"ٹھیک ہے، تجھے دلچسپی نہیں تو میں نہیں بتاتی۔"

اسے احساس ہوا کہ تھوڑی ایکٹنگ کم کرنی تھی اس لیے نوٹس بیگ میں رکھ کر اشتیاق ظاہر کیا۔

"بول دے اب۔ مجھے تجسس ہو رہا ہے۔"

اس کی دھیمے لہجے بلکہ تقریباً سرگوشی میں کی گئی غیر متوقع بات سن کر پشمینہ کے گال لال ہو گئے

"یار! میرے بیگ میں دو کرکرے رکھے ہوئے ہیں، کہیں اکیلے بیٹھ کر ان ندیدیوں سے چھپ کر کھاتے ہیں۔ اوکے؟" وہ خود شروع سے ہی بہت۔ ندیدی تھی۔

آج پہلی بار اسے کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا والی کہاوت ٹھیک سے سمجھ میں آئی تھی۔ دو چار صبر کے گھونٹ اوپر نیچے پیتے ہوئے وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

دونوں کالج کے لان میں قریب ایک صدی پرانے برگد کے پیڑ تلے بیٹھ کر باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں اور منہ بھی چل رہا تھا۔ آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے وہ بھائی کے قصیدے پڑھ رہی تھی اور وہ جو پہلے ہی اس کے متاثرین میں سے تھی مزید امپریس ہو رہی تھی۔

اچانک گلونہ کے سامنے رکھا پیکٹ کوا اٹھا کر لے گیا اور گلونہ بے اختیار کوے کے پیچھے بھاگنے لگی پشمینہ پیٹ پکڑ کر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی تھی۔ اب کوا سامنے لگے جامن کے پیڑ پر بیٹھا حیران نظروں سے گلونہ کو گھور کر دیکھتے ہوئے جیسے پوچھ رہا ہو کہ ارے دس روپے کی چیز کے لیے ایسا ندیدوں والا رویہ؟ تم انسان بھی نا۔

"یہ بتاؤ، کیا ارادے ہیں۔ بھائی تو باہر سے آ گیا ہے اب کچھ ہلا گلا بھی کرتا ہے یا نہیں؟" اسے خود ہی کریدنا پڑا۔

"ہاں یار! ارادے تو نیک ہیں لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ لالہ کیا کہتے ہیں۔ داجی اور مورا کئی نے لالہ سے کہہ دیا ہے کہ خاندان کی جو لڑکی آپ پسند کریں گے ہم اسے بیاہ لائیں گے۔ جلدی فیصلہ کر کے بتاؤ کیونکہ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے، چٹ منگنی

پٹ بیاہ کریں گے۔"

"تو انہوں نے کیا جواب دیا؟"

اب کی بار وہ اپنا اشتیاق نہ چھپا پائی۔

"انہوں نے کل تک کا وقت مانگا ہے فائنل جواب دینے کے لیے۔ لیکن ایک بات میں نے نوٹ کی ہے یار!"

وہ پرسوچ انداز میں اب بھی درخت پر بیٹھے کوے کو گھورے جا رہی تھی۔

"وہ کیا؟" جلدی سے پوچھ کر وہ اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہوگئی۔

"وہ یہ کہ لالہ جب سے آئے ہیں، اسی مقصد یعنی لڑکی کی تلاش میں خاندان کے کئی گھروں میں جا چکے ہیں، کہیں چائے پر اور کہیں کھانے پر لیکن جس دن سے لالہ تم لوگوں کے گھر سے واپس آئے ہیں۔ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ان کا کچھ گم ہو گیا ہو۔" وہ عام سے لہجے میں یہ بات کر کے دوسرا پیکٹ کھول رہی تھی۔

گلونہ کی بات سن کر اس کا دل کچھ زیادہ ہی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ ہمیشہ سے بہت پڑھے لکھے اور اعلا عہدوں پر فائز لوگوں سے وہ متاثر ہوتی تھی اور گلونہ نے اسکول اور کالج میں اپنے بھائی کی تعریفیں کر کے اسے غائبانہ اس کے پسندیدہ ترین لوگوں میں شامل کر رکھا تھا۔ اس کی کوئی بھی نئی کامیابی پشمینہ سے ضرور شیئر کرتی تھی وہ اسی کی زبانی اسے علم ہوا تھا کہ بھائی بہت قابل اور محنتی بھی ہے، سارے خاندان میں کوئی ایسا نہیں تھا۔

"ارے تمہارا چہرہ کیوں اس قدر لال ہو رہا ہے کہیں بخار شخار تو نہیں؟"

وہ حیرانی سے اس کے سرخ گالوں کو ہتھیلی سے چھو کر دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں یار! ایسے ہی شاید دھوپ تیز ہے۔" اس نے تپتے ہوئے گالوں کے کھلتے رنگ چھپانے کے لیے منہ نیچے کر لیا اور اس سے دو قدم آگے چلنے لگی۔

☆☆☆

کلائی میں موجود کانچ کی رنگ برنگی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے وہ ان کی چھن چھن سے لطف نہیں لے سکتی تھی کیونکہ باہر کے سارے موسم اور منظر اندر کے اچھے موسموں کی تازگی سے مشروط ہوتے ہیں۔

اس رات بھی وہ پچھلی کئی راتوں کی طرح بے چین رہی۔ اسے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ پہلی پہلی بار دل نے دھڑکنا سیکھا تھا۔ جاگتی آنکھوں کے خوابوں میں نیلے نینوں والا شہزادہ ازرک خان سفید گھوڑے پر بیٹھ کر اس کے دروازے پر آتا تو کبھی وہ دلہن بنی سرخ اور سفید پھولوں سے مزین حجلۂ عروسی میں اسی شہزادے کی منتظر بیٹھی گھونگھٹ کی اوٹ سے سجے سجائے کمرے کا جائزہ لیتی۔ ایک خواب تو اس کی جذبات سے مزین آنکھوں میں جیسے ٹھہر سا گیا تھا وہ شہزادے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے سرسبز شاداب وادیوں کی سیر کر رہی تھی یکا یک ایک پہاڑ سے گرتے جھرنے کے قریب کھلے سرخ اور گلابی پھولوں میں سے سب سے حسین پھول کا انتخاب کر کے شہزادہ محبتوں کے خمار میں ڈوبے دلنشین اور نشیلے لہجے میں کہتا ہے۔

''جانم! اس پھول کی اتنی اوقات نہیں کہ یہ تمہاری حسین زلفوں میں سج کر اپنی قیمت بڑھائے لیکن میری خواہش ہے کہ میں یہ پھول ان ریشمی زلفوں کی نذر کروں۔

وہ شہزادہ اس کی زلفوں میں پھول سجاتا ہے تو وہ پھول کی تیز اور سحر انگیز خوشبو سے مسحور سی ہو جاتی ہے۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ خوشبو تو اس کے محبوب شہزادے کے ہاتھوں کی ہے پھول تو اس کے سامنے قطعی بے وقعت ہے۔

فضا میں پھیلی روشنی کا سبب اس کی آنکھوں کی چمک اور ہواؤں سے سرگوشیاں کرتی جلترنگ اس کی ہنسی کی بدولت ہے۔

وہ جاگتی آنکھوں کے خوابوں کو اپنی آنکھوں کا اثاثہ سمجھ کر پلکوں کا پہرہ لگاتے لگاتے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تو وہ پھر سے خواب میں آ گیا۔

''تم کتنی حسین ہو پشمینہ۔ یہ تمہاری ریشمی زلفیں جی چاہتا ہے ان کو اوڑھ کر سو جاؤں اور پھر کبھی نہ اٹھوں۔'' اس نے شرماتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یوں تو نہ کہیں نا ازرک خان'' وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

''تمہارے لب لعلیں سے نکلا ہوا میرا نام کتنا معتبر ہو گیا ہے۔ یقین کرو، مجھے تو خود پر رشک آ رہا ہے۔''

''پشمینے! اٹھ بھی جا بیٹا!''

ماں نے اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھے تو وہ تڑپ کر بولی۔

''ایسا تو نہ کریں یہ گناہ ہے۔'' مورجانہ نے جھنجھوڑا ''کیا اول فول بک رہی ہو، اب اٹھ بھی جاؤ۔''

وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی مگر خواب کا سرور ابھی تک جسم و جاں کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے انگڑائی لی اور ماں کے گلے لگ کر ان کا گال چوم لیا۔

''تمہاری آنکھوں کی لالی کئی دنوں سے چغلیاں کھا رہی ہے کہ تم نے ساری ساری رات ڈائجسٹ پڑھے ہیں۔ دیکھو میری بیٹی! یہ لوگ خواب بیچتے ہیں اور ان خوابوں کی خریدار معصوم لڑکیاں تعبیروں کے تعاقب میں نکل پڑتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کے انتظار میں کئی شکاری گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں ان شکاریوں کی پہچان یہ ہے کہ..... خوابوں سے بھی حسین تعبیروں کے لالچ کا دانہ ڈال کر محبت کا جال پھینکتے ہیں۔ اس جال میں پھنساتے ہی سب سے پہلا خراج وہ شکاری عزت کا مانگتے ہیں بلکہ مانگتے بھی نہیں ہیں، چھین لیتے ہیں۔

پھر نہ آنکھیں رہتی ہیں نہ خواب اور نہ ہی تعبیروں کی امید۔'' مورجانہ کو تو موقع چاہیے تھا اس کی کہانیوں پر سارا الزام لگانے کا۔ کبھی یوسف لالہ کی بیوی کی طلاق۔ کبھی میمونہ کی شادی نہ ہونے کا سبب اور کبھی اپنی چچازاد بہن کی بیٹی کی پسند کا رشتہ نہ ہونے پر خودکشی کا الزام۔ ان سب کی وجوہات الگ تھیں، بس مشترک تھا تو ان ساری لڑکیوں کا

ڈائجسٹ پڑھنا۔ وہ آج کوئی جواب دیے بنا نظریں چراتے ہوئے کالج کے لیے تیار ہونے چل دی۔ ماں کی چھٹی حس کسی طوفان کی خبر پا چکی تھی۔ ایسی آنکھوں کی لالی اور پھر غیر متوقع خاموشی طوفان سے پہلے ہی اس کی خبر دے جاتی ہے۔ وہ دل میں اٹھتے خدشات کے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا بستر ٹھیک کرنے لگیں۔

☆☆☆

''آج دیر کردی تم نے؟''

وہ بڑی بے قراری سے کالج کے گیٹ کے قریب ہی گلونہ کی راہ دیکھ رہی تھی، اس کے اندر ایک عجیب قسم کی بے چینی نے ہلچل سی مچا رکھی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے رگوں میں خون کی جگہ خواہشات کی دوڑ لگی ہوئی ہے، بجس اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہا تھا۔

''ڈائجسٹ میں کتنا مزہ آتا ہے ایسے سینز پڑھتے ہوئے۔'' اس کے اندر سے کسی نے صدا لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے گلونہ کے بند ہونٹوں کی طرف دیکھنے لگی، ان لبوں پر تالے کیوں لگے ہوئے ہیں؟

''سوری یار! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ اصل میں ازرک لالہ منہ اندھیرے ہی واک کے لیے نکل جاتے ہیں، ان ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ ازرک خان کے نام کے ساتھ مزید کچھ سننا چاہ رہی تھی لیکن گلونہ نے کچھ نہ کہا۔

وہ چپکے چپکے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔

''جانے کیا کہا ہوگا ازرک نے؟ یہ منہ سے کچھ پھوٹتی ہی نہیں کہ بھائی نے کس لڑکی کا نام فائنل کیا ہے۔ آج سے قبل گلونہ اسے کبھی اتنی بری نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگ رہی تھی۔

''بھوتنی کہیں کی۔'' وہ اس کے گلابی چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

چھٹی کا وقت ہوا تو جیسے گلونہ کو کچھ یاد آ گیا وہ باہر نکلتے ہوئے مڑ کر عام سے انداز میں بولی۔

''شام کو ہم سب آ رہے ہیں تم لوگوں کے گھر۔ اور ایک بڑا خوب صورت سا سرپرائز ہے جو تم سب کو حیران کر دے گا اور تمہیں تو بہت ہی خوشی ہوگی۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی، اس کی گاڑی نکل چکی تھی، وہ دھڑکنوں کے خوشگوار گیتوں پر سرد ہنتی خوابوں کے اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر محبت کی حسین اور پراسرار وادیوں کی سیر کو نکل چکی تھی۔

''دل چیز ہے کیا جاناں! یہ جاں بھی تمہاری ہے۔'' گنگناتے ہوئے اس نے دھوپ میں چمکتے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان بھری لمبی سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

پشمینہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی جبکہ بھائی دو تھے اس کے بابا اور تایا جنہیں وہ بڑے داجی کہتی تھی ایک ہی گھر میں رہتے تھے، کھاتے پیتے خاندانی لوگ تھے ان کے علاقے کی اچھی روایات میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کہ — شادیوں کے بعد بھی بھائی اپنے پورشن بنا کر ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ جوائنٹ فیملی سسٹم نے سب ہی رشتوں کو جوڑ رکھا تھا، خاندان ٹوٹے نہیں تھے بلکہ آج بھی مشر خان خاندان کے بڑے بیٹے کو بتایا جاتا تھا، جس کے ہر فیصلہ پر سب راضی رہتے۔ ان دونوں بھائیوں اطلس خان اور عسکر خان کی ایک چھوٹی بہن شاہ گل تھیں جو دوسرے شہر میں بیاہی ہوئی تھی۔ ان کے شوہر کا اچانک ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوگیا تھا اور اس کے دو بیٹے ہی اب ان کی بیوگی کا سہارا تھے۔ بھائی ہر طرح سے بہن کی دل جوئی کرتے لیکن وہ شوہر کے مرنے کے بعد بہت اداس رہنے لگی تھیں۔ ہمیشہ ہنستی مسکراتی اکلوتی بہن شاہ گل کو اس طرح اداس دیکھنا بھائیوں اور بھابیوں کو دکھی کر دیتا تھا لیکن ان کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

بڑے داجی عسکر خان کی ایک ہی بیٹی دوانہ تھی، اللہ نے بڑے داجی کو تین بیٹے دیے لیکن بچپن میں ہی وہ ایک پراسرار بیماری کا شکار ہو کر فوت ہوتے رہے۔ دوانہ کی پیدائش پر سب کے دل خدشات سے بھرے

ہوئے تھے کہ جانے یہ بچتی ہے یا نہیں۔ اس کو معمولی بخار بھی ہو جاتا تو والدین اس کے ماتھے کی حرارت پل میں کئی کئی بار چیک کرتے۔ لیکن وہ پوری طرح سے ایک صحت مند بچی تھی۔ یوں تو وہ پشمینہ سے دو سال بڑی تھی لیکن دونوں میں بہت دوستی تھی۔ پشمینہ کے دونوں بھائی چھوٹے تھے اس لیے بڑی بہنیں انہیں زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھیں۔ ان دونوں کزنز کی ساری دلچسپیاں یکساں تھیں سوائے ڈائجسٹ ریڈنگ کے۔ ودانہ کو فیشن اور میک اپ وغیرہ سے دلچسپی تھی جبکہ پشمینہ کو ساری چیزوں سے پہلے ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق۔ بلکہ جنون تھا۔ چھوٹے بھائی چھیڑتے۔

''اگر چپس نہ بنا کر دے تو اخبار والے سے کہہ دوں گا اس مہینے سے ہمارے گھر ڈائجسٹ دینے بند کر دے۔''

وہ دانت کچکچاتی چپس کی پلیٹ لا کر اس کے سامنے رکھ دیتی۔ کبھی چاکلیٹس کی قربانی تو کبھی پسندیدہ ڈرامے کے دوران اسی قسم کی دھمکیوں سے ڈر کر ریموٹ ان کے ہاتھ میں دے کر بورنگ کرکٹ دیکھنی پڑتی۔ سارے گھر والوں کو اس کی دکھتی رگ معلوم تھی ڈائجسٹ کے لیے اس سے سارے کام کروائے جاتے۔

''شام کو گلونہ اور ازرک لوگ آ رہے ہیں بی بی گل نے فون کیا تھا کہہ رہی تھیں کہ لالہ اور وہ بھی آئیں گے۔ لالہ تو کہیں آتے جاتے نہیں اپنی خراب صحت کی وجہ سے۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔'' پشمینہ کی مورجانہ نے شام کی چائے پر بتایا۔ وہ لوگ کھانا چائے وغیرہ سب ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر اکٹھے کھاتے پیتے تھے۔

''کچھ بنانا ہے تو ابھی سے بتا دیں چاچی! ہم فری ہو کر گلونہ سے گپ شپ کریں گے۔ مہمانوں کے سامنے کچن میں۔ گھسے رہنا اچھا نہیں لگتا۔'' پشمینہ کے کہنے پر سب مسکرا دیے۔

''تم کون سا گلونہ سے صدیوں بعد ملو گی ایک ہی کالج اور ایک ہی کلاس میں ہو تم دونوں۔ لیکن شاید تمہیں یہ بات یاد نہیں رہی ہے نا؟''

''ہاں ہم تو کالج پڑھنے کے لیے نہیں گپ شپ کے لیے ہی تو جاتے ہیں نا؟''

''جتنے تم نمبر لیتی ہو ہر ٹیسٹ میں، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ گپ شپ کے بعد ازراہ مذاق تھوڑی بہت پڑھائی بھی ہو ہی جاتی ہوگی۔''

وہ پیچھے مڑی اور ماں کی طرف یوں شکایتی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''تم بھی بروٹس؟'' ذہن و دل میں ایک ہی خیال بار بار آ رہا تھا۔

''سو فیصد میرا ہاتھ مانگنے ہی آ رہے ہیں وہ لوگ، اب مورجانہ سے کیسے کہوں کہ نخرے نہ دکھائیں۔ بیٹی تو دل و جان سے پہلے ہی ان کے بیٹے کی ہو چکی ہے۔''

وہ سوچتے ہوئے دھیمی مسکراہٹ لبوں سے ہٹا ہی نہیں پا رہی تھی۔

اسے پچھلے ہفتے کی وہ شام اچھی طرح یاد تھی جب وہ داخلی دروازے کے قریب ہی ایلوویرا کے پودے کو پانی دے رہی تھی۔ ہاتھ میں پانی کا پائپ پکڑے پکڑے اس نے دروازہ کھولا۔ باہر گاڑی کھڑی کر کے وہ اندر داخل ہوا۔

''کون ہیں آپ؟''

اس نے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ازرک خان ہوں آپ کی رشتے کی خالہ کا بیٹا اور گلونہ کا بھائی۔'' وہ بڑی متانت سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

بے شمار کہانیوں اور ناولز پڑھے، وہ سارے سین یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کی دہلیز پر آ کر بیٹھتے جا رہے تھے۔

''کتنا خوب صورت ہو گیا ہے یہ۔ اس نے بچپن میں دیکھا تھا ازرک خان کو لیکن کسی کی ایسی بھی کایا پلٹ سکتی ہے، اسے یقین کرنا دشوار لگ رہا تھا۔

ارے آپ وہی ازرک ہیں نا جسے چوسنی جیسے منہ اور بڑے بڑے ڈیلوں کی وجہ سے سب ڈڈو بھائی کہتے تھے؟''

اس کے پر اشتیاق مگر بے وقوفانہ سوال پر جو جوابی منہ بنا تو

اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے۔

''اور آپ وہی چٹکی ہیں نا جو سارے خاندان میں مشہور تھی۔ چٹکیاں کاٹنے کی وجہ سے؟'' اس نے بھی ادھار نہیں چھوڑا تھا۔

مور جانہ اسے بتاتی تھیں کہ وہ بچپن میں بہت شرارتی تھی لیکن کبھی یہ نہ بتایا کہ وہ اس قدر بدتمیز بھی کہ لوگوں کو چٹکیاں بھی کاٹا کرتی تھی۔ یہ تو انکشاف ہی نیا ہو گیا تھا۔

''ڈڈو بھاء ی ی..... اوہ سوری ازرک صاحب! آپ بہت بدل گئے ہیں، اس لیے پہچان نہ پائی۔'' وہ اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے مہذب انداز سے بولی۔

''کاش میں بھی جواباً آپ کو یہ کہہ سکتا۔''

وہ خوش دلی سے مسکرا کر چوٹ کر گیا۔

ہاتھ میں پکڑے پائپ کو دیکھ کر وہ اس کی پشت پر نظریں جما چکی تھی۔ اونچا لمبا افسانوں کے ہیروز جیسا گھنی براؤن مونچھوں تلے مسکراتے گلابی لبوں اور گمبھیر لب و لہجے والا شخص اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ سوچوں میں گم تھی۔

''سین پورا نہ ہوا نا۔ وہ پوچھتا کیسے کرتی ہیں آپ اتنا مشکل کام؟''

میں معصوم لہجے میں کہتی۔

''کون سا کام؟''

وہ پائپ کی طرف اشارہ کرتا۔

''کیسے دیتی ہیں اتنے ڈھیروں پودوں کو پانی؟''

میں بل کھاتے ہوئے پائپ اس کی طرف پکڑ کر پانی کی دھار اس پر چھوڑتی اور پہلے سے بھی زیادہ بھول پن سے اس کے سونے کے کف لنکس سے مزین سفید کاٹن کے کلف لگے کرتے کی اکڑ نکالتی پانی کی دھار کو دیکھ کر کہتی ''ایسے۔''

وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے پانی کے پائپ پر نظریں گاڑے سوچ رہی تھی۔ سر جھٹک کر خیالات سے چھٹکارا پاتے ہی پائپ والا کام پھر کسی وقت پر مؤخر کرتے ہوئے اپنا حلیہ ٹھیک کر کے وہ چند منٹوں بعد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سب ہی چائے پی رہے تھے، اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے وہ بڑوں کے ساتھ بھی بہت مؤدب انداز میں بات کر رہا تھا۔

ایک پل کے لیے اس سے نظریں ملیں تو پشمینہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں۔

وہ ایک طرف صوفے پر بیٹھی دزدیدہ نظروں سے چائے کے تھرموس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی ''یہاں تو پرفیکٹ رومینٹک اور افسانوں والا سین بنتا تھا لیکن شاید میں کچھ لیٹ ہو گئی یا چائے کچھ زیادہ ہی جلدی آ گئی ہے۔''

''پشمینہ بیٹا! بھائی کو گرم چائے ڈال دو۔''

مور جانہ کے کہنے پر وہ چیل کی طرح چائے کے تھرموس پر جھپٹی لیکن اس سے پہلے کہ اسے کپ پکڑاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں پشمینہ کے ہاتھوں سے مس ہوتیں اور وہ اس لطیف احساس کو اپنے رگ و پے میں دوڑتا ہوا محسوس کرتی جو آج تک رومینٹک سینز میں پڑھا ہی تھا وہ بول اٹھا۔

''نہیں بی بی جان! میں پورے دن میں ایک کپ چائے ہی پیتا ہوں۔'' اس کے سارے رومینس والے سین پر مٹی ڈال دینے سے وہ مایوس سی ودانہ کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔

''ہیرو تو چائے پر چائے پی لیتے ہیں اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک ڈالتے ہیں۔ ہر سین میں دو ہیرو ہیروئن کے علاوہ تیسری چائے لازمی ہوتی ہے۔''

ودانہ بڑی سی اوڑھنی سر پر سلیقے سے لیے خاموش بیٹھی تھی۔

''ظالم ایسا میک اپ کرتی ہو کہ جب تک کوئی آدھے گز کے فاصلے سے نہ دیکھے شبہ ہی رہتا ہے کہ میک اپ ہے یا قدرتی رنگ و روپ؟''

وہ سنجیدہ سی بیٹھی ودانہ کی بغل میں گھس کر کھسر پھسر کرنے لگی۔

''میری دعا ہے تیرے ہونے والے میاں کی نظر کمزور ہو اور جب جب تو میک اپ کرے تجھے

اس کی عینک چھپائی پڑے جیسے مور جانہ میرے داجی کی نسوار چھپا لیتی ہیں۔'' ودانہ کی گھوریاں اسے کہاں چپ کرا سکتی تھیں۔

ڈائجسٹ کی ہیروئن جتنی بھی بونگیاں مارتی ماہی منڈا بنتی۔ ہیرو اسے ہی پسند کرتا ہے۔ سلجھی ہوئی سنجیدہ اور پروقار لڑکیوں کے مقابلے میں۔ اس کا تو اسے پورا یقین تھا کہ اس کی شرارت بھری کھسر پھسر پر بھی وہ گھنی مونچھوں تلے غیر محسوس سی مسکان ضرور اس کے لبوں پر پھیلی ہوگی جو ہر ہیرو کے لبوں پر ہیروئن کی بونگیوں سے پھیل جاتی ہے۔

''ڈگری تو بہت بڑی ہے اور تم نے محنت بھی بہت کی۔ اتنے برس انگلینڈ میں رہنا پردیس میں اپنوں سے دوری کی تکلیف سہنا یہ آسان کام نہیں ہے بیٹا۔'' وہ بڑے داجی کی بات سن کر بڑی مشکل سے زبان کو دانتوں تلے دبا کر خود پر کنٹرول رکھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ ان سے پوچھے۔

''بڑے داجی! آپ نے کب انگلینڈ کی سرزمین دیکھی۔ وہاں گوری گوری لمبی ٹانگوں والی پیاری پیاری میموں کے ہوتے ہوئے کوئی بدذوق ہی بور ہو سکتا ہے اور یہ ہیرو نظر آنے والا بندہ بدذوق تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہا'' وہ ودانہ سے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

''شہزادے شہزادیاں جن کی ہم کہانیاں پڑھتے اور سنتے رہے ہیں وہیں رہتے ہیں۔ پھر وہ ملکہ الزبتھ۔ ہائے ہم نے تو ملکائیں فقط تاش کے پتوں پر یا کہانیوں میں دیکھی اور پڑھی ہیں۔ شہزادہ چارلس تو بڈھا ہو گیا ہے لیکن لیڈی ڈیانا کے ہینڈسم شہزادے بیٹے ہائے۔ ایسے پریوں اور شہزادوں کے دیس میں بھلا کون تکلیف سہہ کر رہتا ہوگا وہاں تو راحت ہی راحت ہوگی۔'' ودانہ اس کی کمنٹری پر بڑی مشکل سے چہرے پر سنجیدگی قائم رکھ پائی۔

''پشمینے بیٹا!''

مور جانہ نے اسے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے حواسوں میں واپس آنے کا سگنل دیا تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

اسے احساس ہوا کہ چپ ہو کر بھی اس نے بونگیوں کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ سوچوں کی وادی میں گھومتے پھرتے وہ حقیقی دنیا میں سامنے رکھی پلیٹ سے بے خیالی میں کچھ دیر میں پانچواں سموسہ اٹھانے لگی تھی، جب کہ چار سموسے پورے اس کے منہ میں غائب ہو چکے تھے۔

''شرم کرو۔ کیا کہیں گے یہ کہ کیسی ندیدی بھوکی لڑکی ہے۔''

ودانہ نے بھی اسے کہنی ماری۔

''اب تو چانس بنے ہی بنے۔ میں جانتی ہوں میری بے وقوفیاں ہی اسے بھا جائیں گی۔'' یہ بات اس نے صرف سوچی تھی۔

''اوہ اچھا تو تمہارے ارادے اپنے گاؤں میں رہ کر پریکٹس کرنے کے ہیں۔ یہ تو بہت ہی اچھا فیصلہ ہے۔ ہم سب اس میں جو بھی مدد کر سکیں ضرور کریں گے۔'' وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ میڈیکل پڑھ کر آیا ہے۔ گلونہ اپنے بھائی کی قابلیت اور لیاقت کی اکثر تعریفیں کرتی رہتی تھی۔

''جی کاکا جی! میری کوشش یہ ہوگی کہ اپنے علاقے میں ہی ایک بڑا ہاسپٹل بناؤں اور اپنے لوگوں کو علاج کی سہولیات فراہم کروں۔'' وہ تو پہلے ہی اس کی شاندار شخصیت کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی لیکن باقی سب بھی اس کے خیالات جان کر اس کے متاثرین میں نام لکھوا چکے تھے۔

''ہاسپٹل کے لیے زمین میں دوں گا اور باقی بھی جو مدد چاہیے ہوگی۔ میں ہر وقت حاضر ہوں۔''

اس کے بڑے داجی تو جیسے اس سے بہت ہی زیادہ متاثر ہو چکے تھے

''شاباش ہے بیٹا! بقول تمہارے اتنے اچھے اچھے ہاسپٹلز سے تمہیں کام کرنے کی آفرز مل چکی ہیں لیکن تم پھر بھی اس پسماندہ گاؤں میں ہی کام کرنا چاہتے اس سے بڑی بات کیا ہوگی؟ آج تک کئی نوجوان اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلا

کام ہی یہ کرتے رہے کہ گاؤں سے منہ موڑا اور شہروں کے ہنگاموں میں کھو گئے۔ یہ سب تمہارے والدین کی تربیت کا کمال ہے۔ شاباش ہے ان پر جو ایسا بیٹا جنا۔'' داجی بھی تعریف پر مجبور ہو گئے حالانکہ وہ جانتی تھی اس کے داجی بہت ہی کم کسی کی تعریف کیا کرتے تھے۔

پشمینہ کی بیسی اندر ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''مجھے اب اجازت دیں، داجی کا حکم تھا کہ آپ لوگوں سے مل کر اپنے مقصد سے آگاہ کروں اور یہ بھی بتاؤں کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہر وقت رہے گی کیونکہ یہ کام اکیلا میں نہیں کر پاؤں گا۔ بزرگوں کا ساتھ اس میں برکت ڈالے گا۔''

پشمینہ نے دیکھا، اس کے داجی لفظ بزرگوں پر پہلو بدل گئے تھے۔ انہوں نے اپنی کلر شدہ مونچھوں کو مروڑ کر مزید اوپر کرتے ہوئے شاید خود کو یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ ''بزرگوں'' کہنا ان کے بڑے بھائی اور بھابھی کی طرف اشارہ تھا۔

بڑا سا ڈرائنگ روم جسے مور جانہ بیٹھک کہتی تھیں اس کے اٹھ کر جانے سے پشمینہ کو خالی سا لگنے لگا تھا۔

''ماشاءاللہ بڑا قابل بچہ ہے۔ یہ دونوں نالائق بھی اس بچے سے کچھ سیکھ لیں تو کامیابی ان کے قدم ضرور چومے گی۔''

داجی دونوں بیٹوں کو ازرک خان کے ساتھ دروازے تک جاتا دیکھ کر بولے تو پشمینے نے یوں غرور سے سر اٹھایا جیسے یہ تعریف اس کی ہوئی ہو۔

☆☆☆

آج پھر ان کے ڈرائنگ روم اور مور جانہ کی بیٹھک میں محفل جمی تھی۔

پشمینہ نے گاڑی کی آواز سن کر سن گن لینے کے لیے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو بڑی سی سفید چادر میں ملبوس گلونہ کی ماں اور چھوٹی سی کالی شال اوڑھے ان کے پیچھے گلونہ حجرے سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ مرد حجرے میں ہی بیٹھ گئے تھے۔

شاید ڈرائیور کے ساتھ آئی ہیں کیونکہ ازرک خان سیدھا اندر ہی آتا لڑکے کے نہ آنے سے تو شک یقین میں بدل گیا تھا کہ یہ لوگ رشتے کے لیے آئے ہیں، اس کے دل میں اتھل پتھل ہو رہی تھی شرمیلی سی مسکراہٹ خود بخود ہونٹوں پر جم سی گئی تھی۔ آنے والے وقت کا تصور اسے ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔

''اے کہاں گم ہو شہزادی؟'' گلونہ اسے یوں گم صم اپنی طرف متوجہ نہ دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں گلونہ آپ لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا ہوا ہے۔ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

ہونے والی نند ہے، ذرا سی ندیدی ہے تو کیا ہوا۔ شادی کے بعد اتنا کھلاؤں پلاؤں گی کہ اس کا ندیدہ پن ختم ہی ہو جائے گا۔

اتنی عزت افزائی پر گلونہ ہونق چہرہ لیے منہ کھولے اسے گھورنے لگی۔

''آپ؟ تم نے مجھے آپ کہا۔ مجھے تو اپنے بے گناہ کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا۔''

وہ شرمیلی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے سلیقے سے اوڑھے دوپٹے میں روزانہ سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

''ودانہ آپی کدھر ہیں؟''

اس کے استفسار پر وہ اسے ودانہ کے کمرے کی طرف لے گئی۔ اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔

مور جانہ کی پکار پر وہ گلونہ کو ودانہ کے کمرے میں چھوڑ کر خود پلٹ آئی۔

''چائے کے بعد کھانا اور پھر قہوہ رکھنا ہے۔'' مور جانہ نوکروں کو ہدایات دے رہی تھیں۔

''تم اندر جا کر ان کے پاس بیٹھو۔ بی بی گل تمہارے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔''

وہ دل ہی دل میں اترائی۔

''ہاں اب تو ضرور پوچھیں گی۔ بیٹے کے دل کی ملکہ جو بن گئی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میرے ساتھ اچھا سلوک ہی بیٹے کو ان سے جوڑے رکھے گا۔ پہلے تو کبھی سیدھے منہ بات ہی نہیں کی انہوں نے میرے ساتھ۔ ہمیشہ ناک منہ چڑھائے ملتی تھیں۔'' وہ معصوم سی لڑکی سوچوں کے پرندے کو

آرزوؤں کے آسمان پر لمبی اڑان کے لیے چھوڑ چکی تھی۔

''بس لالہ! اب میری جھولی میں یہ قیمتی ہیرا ڈال دیں۔ میں جانتی ہوں، نازوں پلی اولاد کسی اور کے دامن میں ڈال دینا بہت مشکل فیصلہ ہے لیکن یہ تو زمانے کی ریت کے ساتھ ساتھ اللہ کا حکم بھی ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت بھی۔ میں آپ کا احسان آخری دم تک یاد رکھوں گی۔''

وہ بی بی گل کی آواز سن کر وہیں کھڑی ہوگئی۔ وہ بہت ہی عاجزی سے داجی سے اس کا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔

''اصل میں میری بہن نے بھی اپنے بیٹے کے لیے ودانہ کا رشتہ مانگا ہوا ہے لیکن میں نے اس سے کچھ وقت مانگا ہے سوچنے کے لیے، آپ سے بھی ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگنا چاہیے تھا کیونکہ یہ فیصلے جلد بازی میں کرنے سے ہمیشہ نقصان کا خدشہ ہوتا ہے لیکن تمہارا بیٹا اتنا قابل اور سعادت مند ہے کہ اس کے رشتے پر اگر میں سوچنے کے لیے وقت مانگوں تو یہ سراسر اس بچے کے ساتھ زیادتی ہوگی۔''

''لیکن خان جی! شاہ گل کو کیا جواب دیں گے؟''

بیوی نے یاد دلایا تو وہ چند لمحے پرسوچ انداز میں کسی غیر مرئی چیز کو گھورتے رہے پھر اطمینان سے بولے۔ ''میں بہن کو خوش کرنے کے لیے اپنی بیٹی اور گاؤں کے باسیوں کے مستقبل سے نہیں کھیل سکتا، فی الحال اسے خبر نہیں ہونے دیں گے۔ وہ ایبٹ آباد سے آئے گی تب روبرو ساری صورت حال بتادوں گا وہ اپنی بیٹی سمجھ کر سوچے گی تو میرا فیصلہ صحیح لگے گا اسے بھی۔''

وہ دھڑکنوں کے شور پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں لگی ہوئی تھی کچھ نہ سمجھ پائی کہ بات کیا ہے۔ ''شاہ گل نے تو اس کا رشتہ نہیں مانگا تھا، شاید بھتیجی کی اہمیت بڑھانے کے لیے بڑے داجی یونہی کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔

''ہم چاروں کا مشترکہ فیصلہ ازرک خان بیٹے کے حق میں ہے۔ پشمینے بچے کو بلاؤ کہ سب کا منہ میٹھا کرے۔''

بڑے داجی کی آخری بات پر وہ چونک سی گئی۔

''اب بڑے داجی کو دیکھو، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی عقل گھٹتی جارہی ہے۔ کوئی شرم حیا بھی ہوتی ہے۔ مانا کہ میں بچی سی ہوں اور اس رشتے پر خوش بھی بہت ہوں لیکن اتنی بھی پاگل نہیں کہ اپنی ہی بات پکی ہونے کا میٹھا سب کو کھلانے پہنچ جاؤں۔''

سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے مبارکبادیں دے رہے تھے۔ وہ جلدی سے وہاں سے بھاگ گئی۔

''پشمینے بچے! ودانہ کو بھی اندر بھیجو اور تم خود بھی آجاؤ۔''

''ودانہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ تو سر باندھے لیٹی ہوئی تھی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا اور نظریں جھکائے ہوئے باہر نکل آئی۔

گلونہ ودانہ کو ہاتھ سے پکڑے اندر سے باہر لا رہی تھی۔

بیٹھک میں سبھی بیٹھے تھے۔

ودانہ بھی سر جھکائے آکر بیٹھ گئی اور وہ ودانہ کے بالکل ساتھ بیٹھی تھی۔

''میری بچی! طبیعت کیسی ہے؟''

''الحمدللہ اب ٹھیک ہوں۔ معمولی سر درد تھا، گلونہ کی میٹھی باتوں نے درد کو بھگا دیا ہے۔''

پشمینہ نے حیرانی سے ودانہ کے چہرے کی طرف دیکھا کہ کہیں طنز تو نہیں کر رہی۔ کیونکہ اسے گلونہ بالکل پسند نہیں تھی۔ کبھی اسے پھینی ناک والی کہتی۔ کبھی کہتی، کھا کھا کر تیری سہیلی ایک دن قحط لے آئے گی پاکستان میں۔ لیکن اس وقت اس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکان اور آنکھوں میں میز پر رکھی مٹھائی کی پلیٹ کو گھورتی گلونہ کے لیے پیار کا سمندر موجزن تھا۔

''میرے خیال میں بسم اللہ کرتے ہیں۔''

گلونہ کی ماں کے اس طرح کہنے پر پشمینے سمجھ گئی کہ ابھی چھوٹی سی سیلیبریشن کریں گے اور منگنی شاید بعد میں۔ اس کی نظریں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ اسے داجی اور سبھی بڑوں سے شرم آرہی تھی۔

''بیٹا گلونہ! انگوٹھی لاؤ''

انہیں شاید پوری امید تھی کہ آج ہاں ہو جائے گی۔ اسی لیے تو پوری تیاری سے آئے تھے ہنستی مسکراتی گلونہ پرس سے انگوٹھی کی ڈبیہ کال کر لائی اور اس کے قریب بیٹھی ماں کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''بسم اللہ کرتے ہیں۔ اجازت ہے لالہ جی؟''

انہوں نے بڑے داجی کے اثبات میں ہلتے سر کی طرف دیکھ کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ پشمینہ نے شرماتے ہوئے سیدھا ہاتھ ابھی گود سے اٹھایا ہی تھا کہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ودانہ کی کلائی پکڑی اور پیار سے اس کا ماتھا چوم کر اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

ایسے موقعوں پر کہانیوں میں سر چکراتے ہیں چھت سر پر گرتی محسوس ہوتی ہے یا آس پاس دھماکے ہونے لگتے ہیں لیکن وجود کے پرخچے پل بھر میں کیسے اڑتے ہیں اسے ابھی خبر ہوئی تھی۔ وہ بمشکل اپنے ٹکڑے سمیٹ رہی تھی کیونکہ مبارک سلامت کی ملی جلی آوازوں میں اسے اپنا نام بھی بار بار سنائی دے رہا تھا۔

''پشمینے! مٹھائی کھلاؤ سب کو''

''پشمینے! بہن کو اندر لے جاؤ۔''

''پشمینے! سنو تو.....''

پشمینے ..... پشمینے .....''

وہ افسانوں میں بھی ایسی صورتحال پر آنسو بہانے والی نازک سی پشمینہ کیسے اتنا بڑا دھچکا برداشت کرتی؟ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے دیکھا کہ ودانہ روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔ باقی سب بھی اس پر جھکے ہوئے بار بار پریشانی سے پوچھ رہے تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟

☆☆☆

''مجھے تو اب معلوم ہوا ہے کہ میری چھوٹی بہن مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے۔''

آنکھیں کھولنے پر ودانہ نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

''یار! ابھی تو صرف منگنی ہوئی ہے شادی میں بہت وقت ہے اور تم ہو کہ ابھی سے بے ہوش ہو رہی ہو ایسا نہ ہو شادی کے وقت لوگ ڈھونڈنے لگیں اور تم میرے جانے کے غم میں بالکل ہی مہین ہو کر غائب ہو جاؤ۔''

پشمینہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اطمینان بھرے انداز میں ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سوچا۔

'شکر ہے کہ خوشی تو ہاتھ سے نکل گئی مگر میری عزت بچ گئی ورنہ سب لوگ کیا سوچتے میرے بارے میں کس قدر شرمندہ ہوتی میں ان سب کے سامنے۔

☆☆☆

مور جانہ اس کے سرہانے بیٹھی ہاتھ میں تسبیح پکڑے کچھ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ ان کی تسبیح کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔

''میں جانتی ہوں، پورے گھر میں تم دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی ساتھی بہنیں بھی ہو اور سہیلیاں بھی۔ باقی دونوں لڑکے تو باہر کے ہیں۔ اس لیے صدمہ تو لازمی ہوگا۔ پہلے سے کوئی اطلاع بھی نہیں تھی کہ ذہنی طور پر تیار ہوتے۔ سب اچانک ہوا تو تمہیں ودانہ سے دوری کے اندیشے پریشان کر گئے گلونہ از رک کی بہن ہے لیکن تمہاری بچپن کی سہیلی بھی تو ہے۔ اس نے تمہیں بھنک بھی نہ پڑنے دی اس بات کی۔ اگر پہلے سے کچھ آئیڈیا ہوتا تو میری بیٹی یوں اچانک بہن سے بچھڑنے کا سوچ کر ٹینشن نہ لیتی۔''

مور جانہ اس کے چہرے پر پھونک مار کر بولیں تو پشمینہ کے دل سے اک ہوک سی اٹھی۔

''کیسے افسانوں میں ہیروئن کی ماں بنا کہے اس کے دل کی ساری باتیں سمجھ جاتی ہے اور بڑی بڑی فلسفیانہ باتیں کرتی ہے۔ اپنی عمر کے حاصل شدہ تجربات سے اسے آگاہ کرتے ہوئے یہ احساس دلاتی ہے کہ دنیا میں کوئی ہے جو اس کے درد سے واقف ہے۔''

''اب یہ بیماروں والی شکل نہ بناؤ۔ اٹھو اور مٹھائی بانٹو۔ بہن کی خوشی کو خوشی کی طرح مناؤ دیکھو اس بے چاری کا اترا ہوا چہرہ رونے والی شکل ہو رہی ہے۔''

''ہائے ماں کی پہنچ بھی بیٹی کے دل تک نہ ہو تو دوسروں سے گلہ کیسا؟''

''ودانہ میری بہن بہت مبارک ہو تمہیں یہ نیا رشتہ اور ازرک خان کا نام۔'' ودانہ کا چہرہ واقعی اترا ہوا تھا اور آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ وہ دل پر جبر کرتے ہوئے اٹھی اور اسے گلے لگا کر بولی تو ودانہ کے ساتھ مورجانہ بھی مسکرا دیں۔ لیکن کوئی آنکھ نہ دیکھ پائی کہ ان کی آنکھوں کے کونے نم ہو گئے تھے۔ یہ نمی انہوں نے چپکے سے اپنی اوڑھنی کے کونے میں جذب کر لی تھی۔ جو بس میں تھا وہ ہی کر سکتا ہے انسان۔

☆☆☆

دو دن وہ کالج نہ جا سکی۔ اس دوران کئی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ڈائجسٹ میں لکھے افسانوں والی سچویشن اس کے ساتھ بھی ہو گئی ہے۔ کسی ناول کی کہانی میں اگر ٹوئسٹ نہ ہوتا تو اسے مزہ ہی نہ آتا تھا۔ وہ ایسی بورنگ کہانی اکثر درمیان میں چھوڑ کر کوئی اور تحریر پڑھنا شروع کر دیتی تھی لیکن اب یہ سوچ رہی تھی کرداروں پر کیا گزرتی ہو گی ایسی صورت حال میں؟ کسی دوسرے کی زندگی کی کہانی کے جو موڑ پڑھنے والے کو مزہ دیتے ہیں۔ وہ کرداروں کا دل چیر کر کہانی میں ڈھلتے ہوں گے۔ اس نے خود کو یہ کہہ کر بار بار تسلی دی کہ یقیناً اب اچانک کسی دن ازرک خان سر راہ ملے گا اور اپنی محبت کا اظہار کر کے کہے گا کہ میں نے گھر والوں کے سامنے پشمینہ کہا تھا مگر وہ ودانہ سمجھے بس ذرا سی غلطی نے مجرم سے مجرم بنا دیا۔ وہ ٹوٹ کر بکھرے گا اور مجھ سے میری رضامندی مانگے گا۔ میں محبت کا اظہار نہیں کروں گی اور اسے سمجھاتے ہوئے اعلا ظرفی کا مظاہرہ کروں گی اور دل پر پتھر رکھ کر کہوں گی میرے خاندان کی عزت اور ودانہ کی خوشیاں مجھ سے قربانی مانگ رہی ہیں۔ وہ چونک کر پوچھے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟ میں آنکھوں میں آنسو بھر کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فقط اتنا ہی کہوں گی مجھے بھول جاؤ اور ودانہ سے شادی کر لو۔ اس میں بہت سارے لوگوں کی بہتری ہے۔

وہ سارے ڈائیلاگ اسے یاد تھے جو ایسے موقعوں پر ہیروئینز بولتی ہیں لیکن ایسا موقع تو آتا نا۔ اب اک نیا انتظار شروع ہو گیا تھا اس نے خود کو سوچوں کے پنجرے سے آزاد کراتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر پڑے کچھ نئے اور کچھ پرانے ڈائجسٹ اٹھا کر دیکھنے کے بعد اپنا پسندیدہ ناول کھولا اور تیسری بار پڑھنے لگی۔

☆☆☆

''ارے تمہیں کیا ہو گیا تھا اس رات؟ ایک دم بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں اور سارے گھر کو پریشان کر دیا تھا اور مجھے تو ڈبل ٹینشن تھی۔ ایک تو ہنی کٹی سہیلی یوں بے ہوش ہو کر گر گئی اور دوسرا اس مٹھائی کا افسوس ہو رہا ہے جو پلیٹ سے میرے پیٹ تک نہ پہنچ پائی۔''

وہ دو دن بعد کالج آئی تو پہلا سوال ہی اس ندیدی میسنی نے یہ کیا۔ گلونہ کی شکل اسے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی اسے ہی کم از کم گھر والوں کے سامنے میرا نام لے دینا چاہیے تھا۔ دوستی کے نام پر دھبہ ہوتی ہیں ہیروز کی ایسی بہنیں۔''

''مبارک ہو بھائی کی منگنی کی۔ بہت خوش ہوں میں اس رشتے پر۔'' وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ خود کو یقین دلا رہی ہے یا اسے۔ اس سے نظریں چرا کر ہاتھ میں پکڑی کتاب کھول لی تھی۔

''اوہ تو یہ خوشی والا بے ہوش ہونا تھا؟'' گلونہ نے انگریزی کی بک سیدھی کر کے اس کے سامنے رکھ دی جو بے خیالی میں اس کے سامنے الٹی پڑی تھی

''یہ تو مجھے پتا ہے کہ تمہاری انگریزی کمزور ہے لیکن اتنی کمزور ہے یہ ابھی انکشاف ہوا ہے۔''

''ہاں تو اس میں دکھ کی تو کوئی بات نہیں تھی نا؟'' وہ اس کی انگریزی والی چوٹ نظر انداز کر گئی۔

گلونہ بیگ میں سے سیب نکال کر کھانے لگی۔

''مجھے لالہ نے منع کیا تھا کہ یہ بات تمہیں نہیں بتانی کیونکہ وہ سب کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔''

اف صدیوں کی بھوکی۔ پشمینہ بڑبڑائی وہ کڑچ کڑچ کر کے یوں سیب کاٹ رہی تھی جیسے پہلی بار کھا

رہی ہو یا جیسے چوہا کوئی چیز کتر رہا ہو۔ پشمینہ کا دل چاہا دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لے یا اس کا بھاڑ جیسا منہ۔

''پوری بات بتاؤں تو لالہ نے سیدھا سیدھا ودانہ آپی کا نام لیا۔ بقول ان کے شادی کے لیے پورے خاندان میں ان کے برابر کی لڑکی دوسری کوئی نہیں۔ اصل میں لالہ کو ودانہ آپی پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھیں۔ ہائے ان کی خوب صورتی اور گریس ماشاء اللہ۔'' اس نے جیسے دھماکہ کر دیا تھا کیسی دھماکے کرنے والی فیملی ہے ان کی؟ پہلے ماں نے میرے سر پر بم گرایا اب بہن بھائی مل کر پرخچوں کے بھی پرخچے اڑا رہے ہیں۔

سارے افسانوں والے متوقع اتفاقات کی امید ٹوٹ گئی تھی، آس بھرے خیالات غلط ثابت ہو گئے تھے اب اسے یقین ہو گیا کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے ازرک خان اور ودانہ کا رشتہ نہیں ہوا بلکہ وہی اس کی پسند تھی۔ گلونہ مسلسل ودانہ کی خوب صورتی کی تعریفیں کر رہی تھی اور اسے یہ سب ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

اس کی تعریفیں سن کر وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ اب اسے کیا بتاتی کہ ساری خوب صورتی اس کے ماہرانہ ہاتھوں کے اس کمال کی بدولت ہے جس سے وہ ہیئر ڈریسنگ فیشل اور میک اپ کرتی ہے۔ ورنہ تو دن کی روشنی میں بغیر میک اپ کے اس کی ہلکی ہلکی نکلتی سبز مونچھیں جسے وہ رواں کہتی تھی۔ کھلے مساموں سے جھانکتے بلیک ہیڈز اور آنکھوں تلے پڑے کالے حلقے دیکھ کر تمہارا بھائی ضرور اسے ودان خان سمجھ لیتا۔ اور گریس کا پوچھنا ہے تو مجھ سے پوچھو اندر کی بات۔ جاہلوں کی طرح شڑپ شڑپ کرتے ہوئے چائے پینے والی لڑکی مہمانوں کے سامنے کیسے خود کو بدل لیتی ہے۔ کوئی گھر میں ہو تو نمکو کا ایک ایک دانہ چہرے پر ایسے تاثرات لا کر نزاکت سے اٹھاتی ہے کہ جیسے نمکو نہ ہو بھاری پتھر ہو اور دیکھنے والا اسے سموسہ کھانے کا یہ سوچ کر نہیں کہتا کہ اب اس سموسے کو پلیٹ سے اٹھانے کے لیے کہیں کرین منگوانے کی فرمائش نہ کر دے نازک حسینہ۔ اسے ان دنوں ودانہ میں بہت سی خرابیاں نظر آنے لگی تھیں۔

''ہاں یہ تو ہے۔ اس خوب صورتی اور گریس کے ساتھ ودانہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی بھی ہے اور بڑے واجی کے ساتھ وہ اپنی ماں کی ساری جائیداد کی اکیلی وارث بھی تو ہے۔'' اسے جانے کیسے یہ خیال آیا اور طنز بھرے انداز میں خیال کا اظہار بھی کر دیا۔

گلونہ ان سنی کر گئی۔

''ازرک لالہ کہتے ہیں۔ شادی کے بعد میں ودانہ کو ہنی مون کے لیے انگلینڈ لے کر جاؤں گا۔''

''ہونہہ ننانوے فیصد پاکستانی دلہنوں کی طرح سوات یا مری سے آگے کے تو خواب بھی نہیں دیکھے ہوں گے اس بے چاری نے۔'' وہ جل کر سوچ رہی تھی۔

''توبہ توبہ نئی زندگی کی شروعات انگریزوں کی شکلیں دیکھ کر نہیں کرنا چاہیے۔ میری تو جب شادی ہو گی میں اپنے شوہر کے ساتھ عمرے کے لیے مکہ مدینہ جاؤں گی۔''

کسی طرح تو اسے نیچا دکھا کر اندر کا غصہ نکالنا تھا۔ گلونہ اس کی بات سن کر شرمندہ سی نظر آئی شاید اسے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ خیال پہلے اسے یا اس کے قابل بھائی کو کیوں نہیں آیا؟ وہ جان بوجھ کر گلونہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ساتھی لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''ارے کیا ہوا، کیوں اس طرح نیر بہائے جا رہے ہیں؟'' وہ ڈائجسٹ ہاتھ میں پکڑے اپنے پسندیدہ قسط وار ناول کی ورق گردانی کر رہی تھی جس کی سیکنڈ لاسٹ قسط اس ماہ آئی تھی۔

''نہیں تو ودانہ بی بی! میں رو تو نہیں رہی۔''

حالانکہ وہ ڈائجسٹ اسی لیے لے کر بیٹھی تھی کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ دکھے ہوئے دل کا بوجھ بھی ہلکا کرتی رہے گی۔ رونے کے لیے اسے کوئی بہانا تو چاہیے تھا۔

''ویسے ہی کہانی پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔'' بہانہ بنایا۔

''تم خوش تو ہو نا؟'' وہ چونکی۔

''کس بات پر؟''

اس نے لال گال چھپانے کے لیے چہرہ نیچے کرلیا۔

''ازرک خان سے میری منگنی پر؟''

وہ ڈائجسٹ رکھ کر سیدھی ہوگئی۔

''بہت خوش ہوں، اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ تم بہت خوش نصیب ہو ودانہ عسکر خان..... کیونکہ وہ خوبصورت بھی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ رشتے دار ہیں۔'' لہجہ عجیب سا تھا۔

ودانہ مسکرانے لگی۔

''رشتے دار تو شہباز خان بھی ہے ازرک تو دور پار کی رشتے کی خالہ کا بیٹا ہے لیکن شہباز لالہ۔ وہ تو سگی پھوپھی کا بیٹا ہے؟''

اس کا جی چاہا، پوچھ لے کہ وہ تو تمہیں پسند بھی تھا لیکن وہ بات بدل رہی تھی۔

''اسے دفع کرو یار! پرانی غلطیاں بھول جانا چاہئیں وہ بھی ایک غلطی ہی تھا میری کچی عمر کی۔''

''اچھا۔ ایک ہفتے میں تم ماشاء اللہ سے کیا کھا کر سمجھ دار ہوئی ہو مجھے بھی بتا دو۔ پچھلے ہفتے کی کچی عمر اچانک پکی عمر میں کیسے بدل گئی؟''

''اچھا چھوڑو یار اس موضوع کو۔'' وہ لاجواب ہوئی تو بیزار سا منہ بنائے بولی۔

''سنو! اک راز کی بات بتاتی ہوں۔''

اس کے رازدارنہ انداز پر پشمینہ چونکی۔

''انہوں نے میسج کیا تھا کہ مجھ سے بات کرنی ہے۔ میں تمہارے کمرے میں تمہیں پڑھانے کا بہانا کر کے آیا کروں گی اور چند منٹ ان سے بات ہو جایا کرے گی کیونکہ گھر میں تو ہر وقت موربی بی اور دا جی دونوں میرے آس پاس ہی موجود رہتے ہیں۔''

پشمینہ کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔

تو اب مجھے یہ سب بھی سہنا پڑے گا ہائے

شیریں بانو کے پچھلے دنوں پڑھے ناول کے وہ سین اسے یاد آگئے جن میں وہ اپنے محبوب کی منگنی پر اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہتی ہے آپ بہت لکی ہیں کہ میری دوست جیسی لڑکی آپ کو مل گئی ہے۔

اور جواب میں وہ منحوس اس سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ میرے فون پر بات نہیں کرتی کہ گھر سے اجازت نہیں ہے۔ آپ اپنے فون پر میری بات کرا دیں پھر وہ دو گھنٹے تک بے بس سی ان کی گفتگو سننے پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ اپنا چالیس ہزار کا موبائل فون اس سابقہ محبوب کے ہاتھ میں چھوڑ کر تو وہاں سے نہیں نکل سکتی تھی۔

''کیا سوچنے لگیں؟''

وہ ڈائجسٹ کی دنیا سے واپس لوٹی۔

''ٹھیک ہے یار! جب جی چاہے میرے کمرے میں بات کر سکتی ہو۔ لیکن گفتگو اخلاق کے دائرے میں رہ کر ہو تو بہتر ہوگا۔ مجھے یہ آئی لو یو اور جوابی لو یو ٹو بہت ہی چیپ لگتے ہیں۔ او کے؟''

ودانہ کھل سی گئی۔

''ابھی کہہ رہے ہیں کہ بات کرو۔''

پشمینہ نے کندھے اچکاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ڈائجسٹ میں سے ناول کا صفحہ موڑ کر چھوڑا اور اقوال زریں کا صفحہ کھول کر خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی کیونکہ کان اسی طرف تھے۔ ناول مکمل توجہ مانگ رہا تھا جو وہ اس وقت تو بالکل نہیں دے سکتی تھی۔ کچھ ساعتوں میں ہی ساعتوں کو پگھلا ہوا لاوا جلانے لگا۔

''جی جی۔ بہت خوش ہوں۔ اس رشتے پر۔ ارے نہیں..... میں اتنی خوب صورت کہاں؟ یہ تو آپ کا حسن نظر ہے۔'' دوسری طرف سے تعریفی کلمات سننے کو مل رہے تھے یقیناً عقل کا اندھا ہے۔''

وہ پھر سے جل بھن گئی۔ ''سچ بولو نا کہ طرح طرح کی کریموں لوشنز اور تھریڈنگ کے ثمرات ہیں''

تیس منٹ ان کی بات ہوئی اور وہ ایک ہی سنہری قول پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ آنکھوں کے آگے دائرے سے ناچنے لگے تھے لیکن وہ توجہ ادھر

ادھر نہ کر پائی۔

''کیا کہہ رہے تھے؟''

دبی دبی سی مسکان ودانہ کے ہونٹوں کے پیالے سے چھلکنے کے لیے تیار تھی۔

''وہی تعریفیں اور مستقبل کے منصوبے، اپنے خوابوں کی راہ گزر پر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔''

وہ مغرور سی گردن اٹھائے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے شہزادی کنیز کو دیکھتی ہے

''شہباز خان کا کیا ہوگا؟''

پشمینہ نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا تو وہ بھڑک اٹھی۔

''پھر سے شہباز خان؟ اگر بہت ہمدردی ہے تو تم کر لینا اس سے شادی۔'' ودانہ کے بگڑنے پر وہ اداس لہجے میں بولی۔

''مگر وہ تو تم سے محبت کرتے ہیں اور رشتہ بھی بھیج رکھا ہے تمہارے لیے۔ ہم تو ہمیشہ سے بہن بھائی والے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔''

اس سوال پر وہ تمسخر اڑانے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''کہاں وہ سمپل بی اے پاس شہباز خان اور کہاں یہ باہر سے پڑھ کر آنے والے ڈاکٹر ازرک خان! تم خود سوچو، وہ میرے قابل ہے؟''

''مگر کل تک تو تم شہباز خان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھیں۔ یاد ہے کیا کہا تھا۔ ہینڈسم ہے، خاندانی ہے، زمین جائداد بھی ہے بس ایک کمی ہے کہ پروفیشنل ڈگری نہیں ہے اس کے پاس۔''

''آج کیوں یاد آ رہا ہے وہ؟'' وہ ناگواری سے بولی پشمینے نے فون اسے پکڑا دیا۔

''خود ہی دیکھ لو، شاہ گل کا میسج وہ کل شام تک پہنچ جائیں گی اور جب انہیں یہ خبر ملے گی کہ ان کے بیٹے کی پسند اور بڑے ماموں کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جس کے رشتے کے لیے وہ پچھلی بار بھائی کے سامنے دامن پھیلا چکی ہیں اور بھائی نے سوچنے کی مہلت مانگی ہوئی تھی، اس کی بات کہیں اور پکی ہو چکی ہے تو ان پر کیا گزرے گی۔ وہ تو سوچنے والی بات پر بھی بگڑ گئی تھیں کہ بڑے داجی نے کیوں یہ غیروں والی بات کی ہے؟''

ودانہ کی رنگت میسج پڑھتے ہی متغیر ہو چکی تھی۔

''ڈراؤ تو نہیں نا یار!''

وہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''شاہ گل کو جواب دینے کے لیے میرے داجی موجود ہیں۔ یہ ان کا فیصلہ تھا جو میں نے صرف اس لیے دل و جاں سے قبول کیا کہ میرے بڑے میرے لیے کوئی غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔''

''اور اگر یہ ہی بڑے کسی کم پڑھے لکھے، بدصورت لڑکے سے رشتہ کراتے تب بھی دل و جاں سے قبول کرتیں؟''

وہ گڑبڑا سی گئی کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔

پشمینہ دل ہی دل میں اس سچویشن پر خوش تھی۔ اسے شاہ گل پر بھی غصہ تھا کہ ہمیشہ ودانہ سے پیار کرتیں، اسے خاص توجہ اور تحفے تحائف بھی دیتیں اور اس سے نارمل انداز میں ملتی تھیں۔ ودانہ بھی تو جب شاہ گل آتیں ان کی بغل میں ہی گھسی گھسر پھسر کرتی رہتی تھی۔ اسے یہ ڈرامے بازیاں نہیں آتی تھیں۔ اس کی تو بس ایک اپنی دنیا تھی کتابیں، کہانیاں اور خواب نگر کو اپنی راجدھانی سمجھ کر روزانہ اس کی سیر کو نکل جانا۔

''اچھا ہے اب شاہ گل کو خبر ملے گی تو احساس ہوگا کہ وہ غلط بندی کو اتنی اہمیت دیتی رہی تھیں ودانہ جو کبھی انہیں اپنی دوست اور پھوپو کے علاوہ اپنا آئیڈیل بھی کہا کرتی تھی حالانکہ اس کی معلومات کے مطابق شاہ گل نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جو قابل فخر یا قابل ستائش ہوتا۔ پیدا ہوئیں جیسے سب پیدا ہوتے ہیں۔ میٹرک تک پڑھا جیسے ان کی ساری ہم عمر لڑکیوں نے سیکنڈ تھرڈ ڈویژن میں میٹرک کیا پھر شادی ہوئی۔ وہ بھی سب شادیوں جیسی عام شادی تھی، بچے ہوئے اور یوں کہانی ختم۔ اب کوئی بھی شاہ گل سمیت ودانہ سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ ان میں آئیڈیل والی بات کیا ہے؟ کیا میٹرک میں بورڈ

ٹاپ کیا تھا؟ بچے زمین پر نہیں مریخ پر جا کر پیدا کیے تھے یا شادی پرستان میں ہوئی تھی۔"

"ہونہہ! اب ڈاکٹر ازرک خان کی ماں اس کی آئیڈیل بن گئی ہے کیونکہ اس نے ایسا بیٹا پیدا کیا ہے جو پہلی نظر میں ہی اس پر فریفتہ ہو چکا ہے۔"

وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے خود کو اپنے ہی سامنے پرسکون اور لاپروا ظاہر کرنے لگی۔

☆☆☆

"پشمینے!" وہ کمرے میں اکیلی لیٹی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ ٹی وی پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا لیکن اس کی توجہ ادھر نہیں تھی۔ ہر چیز سے اس کا دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ مور جانہ اسے کہنے آئی تھیں کہ کیوں اکیلی پڑی ہو، باہر نکلو، روزانہ کی طرح ہنسو بولو، بھائیوں کے ساتھ لڑو جھگڑو۔ احساس تو ہو کہ گھر میں زندگی کے سارے رنگ ہیں لیکن اس کے زرد چہرے، متورم آنکھوں اور بے ترتیب بالوں نے انہیں دکھی کر دیا۔

"جی مور جانہ!" وہ انہیں دیکھ کر بھی نہ اٹھی بلکہ بیزار سی نظر ان پر ڈال کر کروٹ کے بل لیٹ گئی۔

"تم سے اک بات کرنی ہے چند منٹ ماں کے لیے ہیں تیرے پاس؟"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ تو مور جانہ اس کے قریب آ کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"میری بیٹی! عورت کی زندگی میں کئی ایسے دور آتے ہیں جب اسے زمانے سے ہی نہیں خود سے بھی لڑنا پڑتا ہے اور لڑائی بھی کیسی؟ بندھے ہوئے ہاتھوں، منہ پر خاموشی کی مہر اور حدود کے ایک دائرے میں بھی رہ کر اور مقابلے میں اس سے کئی گنا طاقت ور لوگ ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر لڑنے آ جاتے ہیں۔"

وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھ چکی تھی۔

"پھر تو عورت کو ہارنا ہی پڑتا ہے نا مور جانہ؟"

"ہاں، یہ ایک تلخ حقیقت ہے عورت کا منہ روایات کے نام پر بند ہوتا ہے۔ رسم و رواج اور بے اعتباری سے اس کے ہاتھ باندھے جاتے ہیں اور ناقص العقل کہہ کر اس کے گرد ایک دائرہ بنا دیا جاتا ہے۔ جس میں خود کو ہمیشہ محدود رکھنے کی پابند کر دی جاتی ہے۔ پھر اس کمزور کے خلاف ہر طرح کا ہتھیار استعمال ہوتا ہے۔ جسمانی تشدد، ذہنی ٹارچر۔ اک جیتی جاگتی انسان نہیں فقط ایک کمزور مخلوق سمجھ کر اسے لوٹا جاتا ہے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں خواب سجا کر کبھی اسے عزت کے نام پر اور کبھی محبت کے نام پر خوب ذلیل کیا جاتا ہے۔"

مور جانہ کی آواز آنسوؤں میں بھیگی تھی۔ چودہ سال کی عمر میں تیس سالہ رنڈوے سے ان کی شادی ہوئی تھی، مور جانہ کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ دادی کی پہلی شادی مور جانہ کی بڑی بہن سے ہوئی تھی۔ چھ سال تک بچہ نہ ہوا تو ان کی دوسری شادی کی دھمکی سے گھبرا کر ان کی بیوی نے دائی کے کہنے پر جڑی بوٹیوں سے ایک دوا بنا کر لی تھی، جس کے بعد ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی اور جسم نیلا ہو گیا۔ شہر پہنچاتے ہوئے وہ راستے میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔

"مور جانہ! اٹھتی ہوں ابھی۔ ایسی شکل تو نہ بنائیں نا۔" وہ ماں کی آنکھوں میں درد کے ڈورے دیکھ کر منمنائی۔

"میں بہت چھوٹی تھی اس وقت چھٹی کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ گڑیوں کی شادی اور سہیلیوں کے علاوہ کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔

اچانک خبر آئی کہ شیرین گل آپا مر گئیں۔ گھر میں قیامت تھی۔ ماں باپ تڑپ رہے تھے۔ کچھ دن یونہی گزرے اور ایک دن گڑیا کی شادی سے کھینچ کر مجھے ڈولی میں بٹھایا اور پھر ایک کمرے میں سرخ پایوں والی چارپائی پر دلہن کے کپڑے پہنا کر بٹھا دیا گیا۔ میں تو گوٹے والے کپڑے پہن کر خوش ہو رہی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ اچانک اطلس خان کمرے میں آیا۔ مجھے شیرین گل کی زندگی میں بھی ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی مونچھوں اور نسوار کی ڈبیا سے میں چڑتی تھی۔ کبھی شیرین گل گھر آتی تو میں کمرے میں چھپ جاتی تھی۔ بچپن

میں وہ مجھے پیار کرتے تو ان کے منہ سے نسوار کی بدبو آتی تھی۔ میں ان سے ملتی تو سانس روک لیتی تھی بلکہ کئی بار شیرین گل سے کہا بھی تھا کہ اکیلی آیا کریں۔ ان کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟"

وہ چپ ہو گئیں۔ سانس پھولنے کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہیں۔

"پھر؟ پھر کیا ہوا مور جانہ؟" وہ ان کا ٹھنڈا یخ ہاتھ پکڑ کر پوچھ رہی تھی۔

"میں انہیں دیکھ کر ڈر کے مارے چیخنے لگی اور انہوں نے مجھے غصے سے گھورتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس دن سے میں چپ ہو گئی بالکل چپ۔ اکیلی عورت ہاتھ منہ بندھے دائرے میں کئی بار جاتی ہے لیکن جیتے ہوؤں جیسی اداکاری تمام عمر کرتی رہتی ہے۔ عورت کا ایک ہنر ایسا ہے جو کسی مرد کے پاس نہیں۔ وہ ہے اداکاری۔ بڑی بڑی ایکٹریس ہوتی ہے عورت۔ ہاری ہوئی ہوتی ہے لیکن جیتی ہوئی لگنے کی کوشش میں کامیاب رہتی ہے جیسے تیری مور جانہ۔ تیرے دادی نے اتنے برسوں میں میرے لیے ایک نسوار نہیں چھوڑی جب کہ میرا سب کچھ بدل گیا ہے۔"

وہ ان کے سینے سے لگ گئی آنکھیں برسنے لگیں دونوں ماں بیٹی کی۔

"مت پڑھا کر یہ کتابیں" وہ اس کے بھیگے سے جھانکتے ڈائجسٹ کو دیکھ کر بولیں۔

"ان میں ہوتی ہیں کیا ایسی حقیقتیں؟" انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں مور جانہ۔ عورتیں لکھتی ہیں اور عورتوں کی زندگی لکھتی ہیں۔ لازماً دکھ سکھ سب لکھیں گی۔ بقول آپ کے ہاری ہوئی عورتیں جو جیتی ہوئی لگتی ہیں۔"

"پشمینے! کیا ان کتابوں میں لکھا ہے کہ کوئی بہت ہی لاڈلا خواب پرایا ہو کر کسی اور کے نصیب کی حقیقت بن جائے تو اسے کیسے لے پالک سمجھ کر بھلا دینا چاہیے اور کیا یہ بھی لکھا ہے کہ کسی خواب کو لاڈ پیار سے پالنے اور پھر کسی اور کا ہوتے دیکھنے سے کہیں بہتر یہ ہوتا ہے کہ خود کسی کی آنکھوں کا لاڈلا خواب بن جاؤ؟"

"مور جانہ! کاش ہم دوسروں کی کہانیوں سے سبق حاصل کرنے کے لیے یہ کتابیں پڑھا کرتے۔" وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی۔

"کیا یہ ہمارے بس میں ہوتا ہے مور جانہ! کہ ہم کسی کی آنکھوں کا لاڈلا خواب بن سکیں؟"

اس کے لہجے کی حسرت مور جانہ کا دل چیر گئی۔

"خواب بننے سے پہلے ٹوٹنے کا حوصلہ جمع کرنا پڑتا ہے میری بیٹی! وہ مل جائے تو سب آسان ہو جاتا ہے۔"

"ٹوٹنے کا حوصلہ؟"

"ہاں یہ حوصلہ ہو تو ٹوٹ کر خود کو با آسانی جوڑا جا سکتا ہے۔" ان کی عمر کا تجربہ بول رہا تھا۔ کئی بار ٹوٹ کر خود کو جوڑ چکی تھیں وہ۔

"مور جانہ خود کو جوڑنا آسان کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے بے بسی سے پوچھا۔

"خود کو مکمل سمجھ کر اور مکمل نظر آ کر۔"

وہ تڑپ اٹھی۔

"مور جانہ کیسے؟ ریزہ ریزہ ہو کر خود کو کیسے مکمل سمجھا جا سکتا ہے؟ یہ تو ناممکن سی بات ہے۔"

وہ بے چارگی سے بولی تو مور جانہ مسکرا دیں۔

"ناممکن کو ممکن بنانا ہی تو مکمل کرتا ہے عورت کو۔" وہ پہلی بار ماں کو اندر سے دیکھ پائی تھی۔ ورنہ تو ہمیشہ وہ ایک خوش باش خاتون نظر آئی تھیں اسے۔ ان کے دونوں ہاتھ باری باری چوم کر وہ ان سے پھر لپٹ گئی۔ ماں کے سینے سے لپٹی وہ ان کو اک ننھی سی بچی لگ رہی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا اس بچی کا پسندیدہ کھلونا ٹوٹ گیا ہے اور وہ اسے تسلی دے رہی ہیں۔ یہ کہہ کر کہ اور کھلونے لا دوں گی مت روؤ۔

"چلو اٹھو دادی بار بار پوچھ رہے ہیں کہ پشمینے کیوں کمرے میں گھسی ہوئی ہے؟"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بال سمیٹتے

ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تکیے کپڑوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور باہر نکل گئی

ماں خاموشی سے اسے باہر جاتا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے اچھا نہیں کیا لالہ! میری بھتیجی ودانہ پر پہلا حق میرا تھا۔ میری حق تلفی کی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے اب سسرال میں طعنے سننے پڑیں گے۔ کتنی اچھی اچھی لڑکیوں کو چھوڑ کر میں نے اپنی بھتیجی کا ہاتھ مانگا تھا آپ کو کیا خبر؟''

کمرے سے شاہ گل کی تیز آواز آ رہی تھی۔ ودانہ نے پشمینہ کے ہاتھ چائے اندر بھجوا دی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اپنی آئیڈیل پھوپھی کا سامنا کرنے کی۔

''دیکھو میری بہن! حوصلے سے سوچو۔ میں نے یہ اتنا بڑا فیصلہ اپنے نہیں گاؤں کے مفاد میں کیا ہے ایک قابل ترین ڈاکٹر جو باہر سے پڑھ کر آیا ہے۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے لیے علاج کی بہترین سہولیات کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ اب کوئی عورت دردزہ میں شہر لے جاتے ہوئے راستے میں دم نہیں توڑے گی کیونکہ گاؤں میں سہولیات سے بھرپور اسپتال موجود ہوگا۔ آدھی رات کو کسی بیمار کو گاڑی کے لیے لوگوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹانے پڑیں گے۔

میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ تم تو ایک بڑے شہر کی باسی ہو تم نہیں جانتیں کہ گاؤں والے کیسے شہر تک پہنچتے ہیں۔ اک لمحے کے لیے دوسروں کی جگہ خود کو رکھ کر سوچو تو یہ فیصلہ ٹھیک لگے گا۔''

وہ ہاتھوں میں ٹرے پکڑے وہیں کھڑی تھی ابھی قدم آگے بڑھا ہی رہی تھی کہ پاؤں زمین نے پکڑ لیے۔

''مگر میں کیا کروں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں؟''

''تم ایسا کرو کہ پشمینہ کا رشتہ مانگ لو شہباز خان کے لیے اطلس خان سے۔''

''مگر آپ جانتے بھی ہیں کہ اسے میں.....''

بڑے داجی کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو پل بھر میں اسے ذلت کے احساس نے پسینے پسینے کر دیا۔ وہ شاہ گل کا پورا جواب سننے سے پہلے ہی چائے لے کر اندر آ گئی۔

شاہ گل نے مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

وہ چائے دے کر تیز قدموں سے باہر آ گئی۔

گھر کے درمیان بڑا سا لان تھا۔ جس کے دونوں طرف آمنے سامنے دونوں بھائیوں کے پورشن تھے۔

وہ لان میں آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں طرف کے برآمدوں سے روشنی آ رہی تھی۔ وہ یہاں بیٹھ کر سکون سے کچھ سوچنا چاہ رہی تھی۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ اب رزلٹ کا انتظار تھا اور جیسا کہ عموماً قبیلے کی روایت تھی کہ کالج ختم ہوتے ہی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی تھی بلکہ زیادہ تر کا تو میٹرک کے بعد ہی یہ فیصلہ ہو جاتا تھا اور کالج تک جانے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ یہ تو گاؤں کے قریب کالج بننے کے بعد ہی لڑکیوں کو سہولت ہوئی تھی کہ میٹرک سے آگے پڑھ سکیں۔

کتنی حسین دنیا ہوتی ہے ان کہانیوں اور افسانوں کی، ایک ہیروئن کے کئی چاہنے والے پھر وہ کسی ایک کو منتخب کرتی ہے اور اختتام پر دونوں راضی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں..... میری کہانی میں بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کہانی کی ہیروئن میں نہیں بلکہ ودانہ عسکر خان ہے۔

''کیا ہو رہا ہے چھوٹی؟'' مردانہ آواز سن کر وہ کھڑی ہو گئی۔

شہباز خان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''کچھ نہیں لالہ! بس تازہ ہوا لینے کے لیے باہر آئی ہوں۔''

''بیٹھو۔'' اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی بیٹھ

گیا۔

''اچھا نہیں کیا میرے ساتھ تم لوگوں نے۔''

وہ افسردہ تھا۔

''سب نصیب کے فیصلے ہیں لالہ! ہوسکتا ہے آپ کے نصیب میں اس سے بہت اچھی لڑکی لکھی ہو۔'' اسے تسلی دینی آتی تو وہ خود کو ہی سمجھا لیتی۔

''مجھے اس سے کم یا زیادہ نہیں بس وہ ہی چاہیے۔''

''پھر اللہ سے دعا مانگیں خوب رو رو کر کیونکہ تقدیریں بدلنے کی طاقت دعاؤں کو ہی نصیب ہوئی ہے۔''

''تم جانتی ہو کہ میری ہر دعا میں وہ رہتی ہے بلکہ مجھے تو دعائیں مانگنے کا طریقہ ہی اس کی محبت نے سکھایا ہے۔''

''میرے لیے سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ وہ اس رشتے پر خوش ہے، جس کی خبر نے ہی میری آدھی جان نکال دی تھی اور اب باقی کی آدھی اس کی خوشی اور اطمینان نے نکال دی ہے۔''

''لالہ! میں نے تو پڑھ رکھا ہے کہ محبت میں محبوب کی خوشی اپنی خوشی سے زیادہ اہم لگتی ہے۔''

''نہیں، کتابوں میں جو لکھا ہوتا ہے وہ سب سچ نہیں ہوتا۔ محبت میں جدائی اور بے وفائی دو قاتل ہیں۔ دونوں آدمی کو مار دیتے ہیں۔''

ان کے لہجے میں ٹوٹے دل کی کرچیوں کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔

''مگر آپ تو پھر بھی زندہ نظر آرہے ہیں۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو وہ درد دبا کر بولا۔

''ضروری نہیں کہ جو زندہ نظر آرہے ہوں، وہ زندہ ہوں بھی۔''

وہ اٹھنے لگی۔ اسے اس سے زیادہ غمگین ڈائیلاگ ہضم نہیں ہوتے تھے بلکہ کہانی میں جہاں ایسے اداس سین آتے وہ دو چار صفحے پلٹ کر سیدھی ہنستے مسکراتے منظر پر چلی جاتی تھی۔

''مجھے مرے ہوئے لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے لالہ اور ابھی ابھی آپ نے خود اعتراف کیا کہ آپ زندہ نہیں ہیں۔'' وہ ماحول کی سنجیدگی کم کرنا چاہ رہی تھی

وہ اس کے خوف زدہ ہونے کی اداکاری پر مسکرا دیا۔

''سنو! وہ تو سامنے ہی نہیں آرہی اسے کہنا محبت میں نے کی تھی، اس لیے درد بھی مجھے سہنا ہے۔ تم کیوں منہ چھپائے پھر رہی ہو، اگر دل میں کوئی احساس ندامت ہے بھی تو یہ بوجھ اتار دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایک تکلیف دہ لمحہ بھی اس کی زندگی میں آئے۔''

''جی لالہ! میں کہہ دوں گی وقتی..... اور فطری بات ہے سب کو علم تھا کہ آپ کا رشتہ آیا ہوا تھا اور سب سے پہلا حق آپ کا بنتا تھا۔ اب یہ لوگ خود کو گلٹی ضرور محسوس کریں گے۔''

وہ روایتی اور افسانوی ولن نہیں بننا چاہتی تھی ورنہ ایسے موقعوں پر تو چوٹ کھائی ہوئی سہیلی سازش کر کے سارے معاملات خراب کرتی ہے۔ لیکن وہ ڈائجسٹس کی دیوانی اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اس طرح نفرت اور انتقام کی راہ اپنانے والوں کو وقتی کامیابیاں تو ملتی ہیں لیکن اختتام میں وہ ولن بن کر ناکام ہی رہتے ہیں، کبھی پاگل خانے اور کبھی جیل کے علاوہ بھی ایسے منفی سوچ والے جھوٹے لوگوں کا انجام برا ہی دکھایا جاتا ہے اور وہ اچھا انجام چاہتی تھی اپنی زندگی کا..... ولن والا نہیں، ہیروئن والا انجام۔ وہ اندر جا چکے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے پھیلائے اور دل ہی دل میں وہ مانگنے لگی جو سب کے سکون کا سبب بن جائے۔

☆☆☆

شاہ گل کا مزاج قدرے بہتر ہو گیا تھا۔ داجی اور مورجانہ کے علاوہ بڑے داجی، ان کی بیوی اور ودانہ بھی مطمئن لگ رہے تھے، شاید گاؤں والوں کے مفاد نے انہیں خاموش کرا دیا تھا۔

بس بے چین تھی تو وہ۔ اسے بڑے دادی کے وہ الفاظ بہت تکلیف دے رہے تھے جنہیں سن کر آئی تھی۔ شہباز خان اسے بڑے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ اچھی شکل وصورت کا مالک ایک سلجھا ہوا انسان تھا۔ شاہ گل کے دو ہی بیٹے تھے۔ ایک چھوٹا شاہ میر خان تھا جو ہمیشہ پڑھائی میں ہی لگا رہتا۔ جب بھی شاہ گل آتیں۔ وہ باپ کے ساتھ گھر میں رہتا تھا شہباز خان بچپن سے ماموؤں کے گھر میں خوش ہوتا تھا۔

جبکہ یہ لوگ جب وہاں جاتے تب بھی وہ ایک طرف کتاب کھولے بیٹھا ہوتا۔ اس کی دوستی کسی کے ساتھ نہیں تھی نہ ہی دشمنی تھی کسی سے، بس وہ وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ شہباز خان اور شاہ میر خان میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ شہباز بڑا تھا لیکن بہت ہی گھلنے ملنے والی شخصیت تھی اس کی۔ اسی لیے وہ سارے خاندان میں مقبول تھا جبکہ شاہ میر کو سب ہی مغرور، گھمنڈی اور جانے کیا کیا کہتے تھے۔

اسے یاد تھا ایک بار وہ عید پر ایبٹ آباد گئے تھے۔ وہاں سے سب نے نتھیا گلی جانے کا پروگرام بنایا مگر شاہ میر صاحب اڑ گئے کہ عید کی چھٹیوں کے فوری بعد ٹیسٹ ہیں اس لیے وہ نہیں جائیں گے۔

''ودانہ یہ شاہ میر لالہ کا دماغی توازن کچھ ٹھیک نہیں لگتا نا؟ اب دیکھو کوئی گلیات کی سیر پر جانے سے بھی انکار کر سکتا ہے صرف اور صرف پڑھائی کی وجہ سے..... میرے تو اگر سالانہ امتحان بھی ہو رہے ہوں تو میں درمیان میں چھوڑ کر چپکے سے نکل جاؤں۔''

وہ اپنی ہی رو میں تیز تیز بول رہی تھی جیسے ہی پیچھے مڑی وہ کتاب سمیت دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھے بالکل قریب ہی کھڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں لکھا تھا۔ شرم کرو لڑکی میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو میری غیبت کر رہی ہو؟

''شاہ میر لالہ! میں نے آپ کو پاگل تو نہیں کہا یا گل آپ جیسے تو نہیں ہوتے۔ ان کے تو بال بکھرے ہوتے ہیں کپڑے شکنوں بھرے اور آنکھوں میں وحشت ت.....ت.....''

وہ جھینپ مٹاتے ہوئے اول فول بول گئی۔ اس کے بکھرے بالوں اور شکنوں بھرے کپڑوں کے ساتھ آنکھوں سے غصہ وحشت بن کر ٹپک رہا تھا۔

''نہیں نہیں شاہ میر لالہ! پاگل تو اپنے بال بھی دونوں ہاتھوں سے نوچتے ہیں۔''

پشمینہ نے ودانہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ بھاگ جائے گی اور اسے اکیلے ہی شاہ میر کے غصے کو بھگتنا پڑے گا۔

جانے کیوں شاہ میر خان کو شرارت سوجھی اور اس نے کتاب قریب رکھی میز پر رکھتے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے قدرے لمبے اور سلکی بال پکڑ لیے۔

یہ منظر دیکھتے ہی وہ ساتھ میں ودانہ کو گھسیٹتے ہوئے تیزی سے بھاگ گئی۔ جب تک وہ لوگ شاہ گل کے گھر رہے۔ وہ ڈر کے مارے نظریں اٹھا کر اسے نہیں دیکھتی تھی۔

وہ ماضی کے جھروکوں سے کمرے کی نیم تاریک فضا میں واپس آ چکی تھی۔ ودانہ بجتا ہوا فون ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئی اور اشارے سے بتایا کہ ازرک خان کا فون ہے۔ اشارہ اس نے بڑے ہی لوفرانہ طریقے سے دل پر ہاتھ رکھ کر کیا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیا ہے اس لڑکی میں جو مجھ میں نہیں ہے، افسانوں اور کہانیوں میں تو سانولی سلونی اور عام سی شکل صورت والی ہیروئن کو بھی رائیٹرز امریکہ پلٹ خوب صورت ہیرو کے دل کی رانی بنا دیتی ہیں لیکن یہاں تو کسی کو میری خوبصورتی یا میری اچھی نیچر سے کوئی سروکار ہی نہیں۔

بچپن سے جس نے بھی ہم دونوں کو دیکھا، یہ ہی کہا ودانہ خوب صورت ہے لیکن پشمینہ میں جو کشش ہے، وہ کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے میری شاہ گل کی خوب خاطر مدارت کیجیے گا اور سنیں شہباز لالہ کو ہر طرح سے متاثر

کرنے کی کوشش کرنا۔ اوکے؟''

جب سے رشتے کی بات شروع ہوئی تھی وہ شہباز کو لالہ نہیں کہتی تھی لیکن اب اس بے چارے کو پھر سے لالہ بنا دیا تھا دانہ نے۔

''کل شام کو سب کی دعوت ہے میری سسرال میں..... تم بھی ذرا تیار شیار ہو کر جانا۔ آخر کو میری عزت کا سوال ہے۔ دانہ عسکر خان کی ایک ہی بہن ہو تم۔'' وہ اتراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہاں تم تیار کر دینا ویسا ہی جیسا خود ہوتی ہو خوب لیپا پوتی کے باوجود یوں لگتا ہے سب نیچرل ہے۔''

''میرے جیسا لگنے کے لیے میرے جیسا حسن بھی تو چاہیے نا میری بہنا۔'' وہ آئینے کے سامنے مغرور انداز میں کھڑی ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔

''حسن محض چند روزہ ہے۔ یہ جوانی کے پاس بڑھاپے کی امانت ہوتا ہے۔ بڑھاپا اسے لینے یوں چپکے سے آتا ہے کہ بندے کو اس کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی۔ حسن کو وقت کے ہاتھوں پامال ہونا ہی ہوتا ہے'' بڑی بڑی لکھاریوں کی گہری گہری باتیں پڑھ رکھی تھیں اس نے..... کوئی مذاق تو نہیں تھا۔

وہ اسے دیکھنے لگی۔

''چلو یار مان لی تمہاری فلسفیانہ بات۔ ایک تو اس شہباز خان نے ذہنی طور پر تھکا دیا ہے اوپر سے تم بھی مشکل باتیں کر رہی ہو۔''

''ٹھیک ہے، میں کپڑے نکالتی ہوں۔ آخر پہلی بار تیری سسرال جا رہی ہوں۔ اب سے پہلے تو رشتے داری اور پھر گلونہ کا گھر سمجھ کر جاتی تھی۔ اب اپنی بہن کی سلطنت سمجھ کر جاؤں گی۔'' وہ کھل سی گئی تھی اس بات پر۔ پشمینہ نے الماری کھول کر لباس منتخب کیا اور پھر الماری کے نچلے خانے میں لکڑی کی ڈنڈی پر نفاست سے سجی ہینگنگ چوڑیاں نکالنے لگی۔

☆☆☆

''کیسی ہیں آپ؟'' وہ حال پوچھ رہا تھا۔

پشمینہ نے بہت دعا مانگی تھی کہ اس سے سامنا ہی نہ ہو۔ کسے اچھا لگتا ہے، بار بار زخم چھلتا رہے اور وہ درد سہتا رہے۔

''ٹھیک ہوں۔ خوش باش۔ فٹ فاٹ۔'' وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے نظریں چرا گئی۔ اس کی مردانہ وجاہت، نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشن آنکھیں اور لباس سے اٹھتی پرفیوم کی خوشبو۔ ''ایک تو ہمیشہ ہیرو ایسا پرفیوم استعمال کرتا ہے جو سانسوں میں اترتے ہی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔'' وہ لمبی سی سانس لے کر سوچتی رہ گئی۔

وہ شہباز لالہ کی طرف دیکھ رہی تھی جو تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

شاہ گل کی آنکھوں میں پسندیدگی کے ساتھ ساتھ حسرت بھی تھی شاید وہ شہباز لالہ کی اعلا تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کو ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا کر مارنے کا جرم تقدیر کے ذمے نہیں بلکہ اپنے ذمے لگا رہی تھیں۔ ورنہ ان کے دونوں بیٹے قابلیت میں کسی سے کم نہیں تھے۔ وہ سب کھانے کے بعد گپ شپ کر رہے تھے کہ گلونہ اس کے کان میں منمنائی۔

''چلو، میرے کمرے میں چلتے ہیں بزرگوں کی بورنگ محفل سے نکلو یار!''

وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئی۔

''تم بیٹھو میں قہوہ اور گڑ لے کر آتی ہوں پھر گپ شپ کرتے ہیں۔'' وہ اسے کمرے میں۔ چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

وہ یونہی گلونہ کے کمرے میں لگی بک شیلف پر کتابیں دیکھنے لگی۔ کچھ خواتین رائیٹرز کے ناول تھے جو اس نے گلونہ کو کہہ کر پڑھنے کی تحریک دی تھی ورنہ وہ سستی کی ماری پڑھنے پر سونے کو ترجیح دیتی تھی۔

''ارے یہ کیا؟ یہ تو وہی ناول ہے جو پچھلے ایک

سال سے گلونہ کو پڑھنے کے لیے دے رکھا ہے مگر اس نے اسی وقت دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولتے ہوئے کہا تھا۔

''ظالم یہ تو تیرا ہم وزن ہے اسے ختم کرتے ہوئے میرے تو بال بھی سفید ہو جائیں گے اور شاید دانت بھی ٹوٹ کر گر جائیں۔''

وہ ناول میں سے گرے کاغذ کو زمین سے اٹھا کر دیکھنے لگی کہ شاید یہاں تک پڑھ لیا ہے اس ست لڑکی نے اور یہ کاغذ بطور نشانی درمیان میں رکھا ہوا ہے۔

''یہ تو میری رائٹنگ ہے؟ اف خدایا اس کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی، اکثر ناولز میں پڑھ رکھا تھا کہ ہیروئنیں دل کی ساری کیفیات ڈائری میں لکھتی ہیں یا ہیرو کے نام خط لکھ لکھ کر ڈائری میں چھپائے رکھتی ہیں اور ہیرو جوان کی محبت سے بے خبر ہوتے ہیں، اتفاق سے وہ ڈائری ان کے ہاتھ لگ جاتی ہے جس کے بعد وہ تن من دھن سے ڈائری لکھنے والی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ودانہ کی منگنی کے بعد جب وہ کالج پہنچی تھی اور اسے گلونہ کی زبانی یہ پتا چلا تھا کہ رات کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی بلکہ ازرک خان نے ودانہ کو ہی پسند کیا تھا تب کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو کر اس نے رجسٹر سے کاغذ پھاڑا اور اس سنگدل انسان کے نام خط لکھنا شروع کر دیا تھا۔

جس میں اس نے اپنی دلی کیفیات اور پھر ان سوچوں اور خوابوں کا اس قدر غیر متوقع انجام لکھ کر قسمت سے شکوہ کیا تھا اور اختتام پر ایک پھڑکتا ہوا شعر بھی لکھ دیا تھا پھر جب جی کچھ ہلکا ہو گیا تو اس کاغذ کو تہہ کر کے رجسٹر میں رکھ دیا اسے کسی قسم کا خوف نہیں تھا کہ یہ کاغذ کوئی دوسرا پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کے بیگ کو کوئی بھی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

دو تین دن کے بعد جب اس نے کسی کام کے لیے رجسٹر کھولا تو اس میں سے وہ کاغذ غائب تھا وہ پھر بھی پریشان نہ ہوئی کیونکہ اس نے کاغذ کے نیچے اپنا یا کسی اور کا نام نہیں لکھا تھا، بس مخاطب کو آپ لکھا تھا اور نیچے اک نامراد لڑکی لکھ دیا تھا۔

''اگر کوئی پڑھے گا بھی تو اسے کیا خبر کہ یہ سب پشمینہ اطلس خان نے لکھا ہے۔'' یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

اور آج وہ کاغذ گلونہ کے کمرے سے ملا تو اس کا حال عجیب سا ہو گیا تھا۔

''کیا سوچتی ہو گی گلونہ؟ میں کس قدر گئی گزری لڑکی ہوں کہ اس کے بھائی کے عشق میں گرفتار ہو کر بھی آزاد نظر آنے کی اداکاری کر رہی ہوں؟ کتنی گہری ہے وہ کہ سب جان کر بھی انجان بنی پھر رہی ہے، وہ کسی کے کھنکھارنے کی آواز سن کر تیزی سے مڑی۔

''تو آپ نے اپنا اعتراف نامہ یا محبت نامہ دیکھ ہی لیا؟''

ازرک خان کی آواز سن کر وہ حیرت سے اچھل پڑی۔

''یقین کریں، مجھے جب گلونہ نے آ کر یہ بتایا کہ اس نے آپ کو کالج میں بہت سنجیدگی سے کچھ لکھتے ہوئے دیکھ کر آپ کے بیگ کی تلاشی لی اور اس میں سے یہ کاغذ نکال لیا تو۔ یقین کریں میں حیران رہ گیا جب اس کاغذ پر لکھی آپ کے دل کی سچی پکار میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گئی تب سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔''

وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار، قابل ترین مرد اس کے روبرو بالکل قریب ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواباً کیا کہے۔ بس وہ منہ کھولے کچھ شرمندہ، کچھ حیران و پریشان سی اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

''تم نے لکھا کہ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے اپنے دل کے سارے دروازے اس کے لیے کھول دیے بنا یہ سوچے کہ وہ دستک دے گا یا نہیں۔''

پشمینہ کی نظریں زمین پر گڑی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کاش زمین میں غائب ہو جاؤں۔

فروری 2020
خواتین ڈائجسٹ
Part 2
www.pklibrary.com

''اف میرے خدایا گلونہ کو بھی سب پتا چل گیا ہے اور اسے بھی جواب ودانہ کے منگیتر کی حیثیت سے میرا ہونے والا بہنوئی بننے والا ہے۔''

''آپ کو شرمندہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ فطری جذبوں کے سامنے ہم بند کسی صورت بھی نہیں باندھ سکتے۔ میں آج آپ کے دل کے دروازے پر دستک دیتا ہوں اور یہ درخواست بھی کرتا ہوں کہ پلیز ایک بار یہ در کھول کر مجھے اندر آنے دیں..... میں جانتا ہوں، آپ دل ہی دل میں یہ کہہ رہی ہوں گی کہ آپ تو پہلے سے ہی اندر رہتے ہیں۔''

وہ اس کے اتنے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ اس کے سانسوں کی گرمی پشمینہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی پشمینہ کی مٹھی میں وہ کاغذ تھا جس پر وہ حال دل لکھنے کی غلطی کر چکی تھی۔ اس نے مٹھی پوری قوت سے بھینچ لی۔ پھر ایک غیر متوقع سا سین ہوا۔

ایک دم سے ازرک خان نے پشمینہ کا ہاتھ پکڑ لیا اسے لگا جیسے جلتے ہوئے انگارے سے اس کا ہاتھ چھو گیا ہو۔ دوسرے ہاتھ میں موبائل فون تھا جبکہ کاغذ اس کے ہاتھ پکڑنے سے نیچے گر گیا تھا۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ۔ پلیز چھوڑ دیں۔'' اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے تقریباً رندھی ہوئی آواز میں کہا تو ہر افسانے، کہانی، فلم یا ڈرامے والا ڈائیلاگ اس کے منہ سے نکلا۔

''یہ ہاتھ میں نے چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا پشمینہ اطلس خان!''

پشمینہ کا پورا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ لیکن اسے ہمت کرنی تھی کیونکہ یہ سب جو چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔ یہ بہت ہی گھٹیا لگ رہا تھا اسے۔

''ازرک صاحب! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں ایک عزت دار باپ کی بیٹی ہوں۔ اس طرح اگر آپ کے ساتھ اکیلا مجھے کمرے میں کسی نے دیکھ لیا تو میرے خاندان کی بہت بدنامی ہو جائے گی۔ اس لیے برائے مہربانی آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں..... ورنہ میں کمرے سے باہر نکل جاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ گلونہ بھی اس سارے معاملے میں شریک ہے ورنہ وہ مجھے یوں کمرے میں اکیلا چھوڑ کر خود غائب نہ ہو جاتی۔'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''نہیں۔ گلونہ کو اس معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے کہ میں تم سے یہ باتیں کرنے یا تنہائی کا فائدہ اٹھانے آیا ہوں اسے میں چاکلیٹس اور آئس کریم دے کر آیا ہوں وہ آدھے گھنٹے میں ختم کر کے ہی واپس کمرے میں آئے گی۔''

وہ ڈھٹائی سے وہیں کھڑا رہا۔ بہن کے ندیدے پن کی خبر تھی اسے بھی۔

''مجھے آپ جیسے تعلیم یافتہ انسان سے اس سب کی توقع نہیں تھی۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ آپ نے اتنا عرصہ باہر رہ کر بھی کچھ نہیں سیکھا۔ رشتے اور ان کا احترام، معاشرتی اقدار، مذہبی اقدار، اتنی تعلیم اگر علم کی روشنی بن کر آپ کو اندر سے منور نہ کر سکی تو کیا فائدہ اس تعلیم کا؟''

وہ صاف بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی کیونکہ پل بھر میں وہ معصوم سی لڑکی عقل کی کئی سیڑھیاں طے کر چکی تھی۔ گناہ کے رشتوں کے بھیانک انجام اسے یاد آئے۔ تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی کئی کہانیوں کے عنوان اسے بمعہ متن کے یاد آ رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر اسمارٹ اور ذہین لڑکی بننا پڑتا تھا اور وہ بے وقوفانہ سوچوں سے چھٹکارا حاصل کر چکی تھی، اب باعزت انجام بھی مل جائے اس عجیب سی کہانی کو۔

''باہر رہ کر میں نے یہی سیکھا ہے کہ بغیر شادی کے بھی ریلیشن میں رہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے یہ آفر دے رہا ہوں۔ کہ شادی تو میں آپ کی کزن ودانہ سے کروں گا لیکن ہم دونوں زمانے سے چھپ کر ایک دوسرے سے ریلیشن میں رہیں گے، میں جانتا ہوں آپ کو اس پر

کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ دم بخود کھڑی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں آپ کے سامنے آج ایک اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس لڑکی ودانہ میں کوئی دلچسپی نہیں، ایسی میک اپ کی دوکانیں تو میرے اردگرد ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ جانے کیوں مجھے وہ لڑکی نقلی لگتی ہے ـــ اگر مجھ سے میری پسند پوچھی جاتی تو میں تمہارا نام لیتا لیکن ـــ"

وہ چپ ہوگیا گلونہ نے تو اسے سب بتایا ہوا تھا یہ بھی کہ لالہ نے خود ودانہ کا انتخاب کیا ہے اسی لیے تو وہ محبت نام کے دانے پر بھوکی چڑیا بن کر نہیں جھپٹی۔

وہ نظم اسے یاد آگئی تھی ـــ

بات کچی ہے
بات کڑوی ہے
بات بھاری ہے
عورت بھوکی چڑیا
محبت دانہ گندم کا
اور مرد ماہر شکاری ہے۔

وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ودانہ کو اپنا نام دے کر عزت بنانا اور اسے محبت کے نام پر بے عزت کرنا۔

"ودانہ ہر لحاظ سے آئیڈیل لڑکی ہے، مخلص بچی اور حسین ترین ـــ آپ کو اپنی قسمت پر رشک کرنا چاہیے بلکہ اللہ کا شکر ادا کریں۔" وہ سر اٹھا کر بات کر رہی تھی سامنے والا اسے بالکل بونا لگ رہا تھا۔

"اس میں وہ سب نہیں ہے جو تم میں ہے ـــ لیکن میں مجبور ہوں اور اپنی مجبوری تمہیں بتاتا ہوں اس شرط پر کہ کسی کو اس راز میں شریک نہ کرنا اگر کسی سے کہو گی بھی تو سب یہی سمجھیں گے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ صرف اس لیے کہ چچا زاد کزن سے جیلس ہو رہی ہو۔ اس کا اتنے قابل ڈاکٹر سے رشتہ جو طے ہوگیا ہے۔ سو صرف اس لیے تمہیں اس راز میں شریک کر رہا ہوں کہ تم میری مجبوری سمجھ سکو۔ میرے والد نے وہ قیمتی زمین حاصل کرنی ہے جو تمہارے بڑے داجی کی اور ان کی بیگم کی ملکیت ہے، اس کروڑوں کی زمین کی وارث ودانہ خان ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسپتال کے نام پر وہ زمین جلد ہی مجھے ملنے والی ہے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں تمہاری کزن میں۔"

وہ ساکت سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کی قربت اور جسم سے اٹھتی بو سے پشمینہ کا سانس رکنے لگا تھا۔ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"تو ہاسپٹل والے سارے عزائم محض باتیں ہیں؟" اس نے پوچھا تو وہ عجیب ولن والے اسٹائل کا قہقہہ لگا کر بولا۔

"پشمینہ اطلس خان! تم بھی بھولی ہو اور تمہارا سارا خاندان بھی۔ میں بھلا اس چھوٹے سے گاؤں میں کام کر کے اپنا مستقبل برباد کروں گا؟ میرا دماغ اتنا بھی خراب نہیں۔ ہاں شادی اور جائداد ملنے کے بعد ودانہ کو والدین کی خدمت کے لیے یہیں چھوڑ کر میں باہر واپس چلا جاؤں گا۔ ہاں تم اگر میرے ساتھ چلنا چاہو تو میں بخوشی سارے معاملات دیکھ لوں گا۔ اسٹوڈنٹس ویزا بآسانی لگتا ہے۔ بس پیسے لگتے ہیں پھر ہم دونوں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں کسی کے ہاتھ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔"

وہ یوں بول رہا تھا جیسے دنیا اس کے قدموں تلے ہو اور ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا طے ہو۔

وہ مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور گلونہ اندر آگئی اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ اور ٹرے میں آئس کریم کا باؤل نظر آرہا تھا۔

ازرک خان نے برا سا منہ بنا کر گلونہ کی طرف دیکھا تو وہ جھٹ سے بول پڑی۔

"لالہ! آپ کو شہباز لالہ بلا رہے ہیں حجرے میں۔"

وہ پشمینہ پر ایک الوداعی نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ پشمینہ قریب رکھی کرسی پر جیسے ڈھے سی گئی۔ گلونہ

نے دزدیدہ نظروں سے زمین پر پڑے کاغذ کی طرف دیکھا، اس کے ماتھے پر بھی پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

''ایسی ہوتی ہیں سہیلیاں؟'' اس نے جھک کر کاغذ اٹھایا اور اس کے سامنے لہرا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس کی نظریں جھک گئیں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں پشمینے۔ یہ سب غلطی سے ہوگیا۔ میری سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ میں نے یہ کاغذ لالہ کو دکھا دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ تمہاری عزت نفس کو ٹھیس لگے گی۔ لیکن بخدا میرا مقصد بڑا نیک اور معصوم سا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تمہاری محبت کے بارے میں جان کر لالہ تمہیں اپنا لیں۔ میں یہ سب تمہاری محبت میں کر گئی لیکن بعد میں احساس ہوا کہ اس سب کا وقت گزر گیا ہے۔ لالہ کے مقاصد بہت اونچے ہیں۔ عشق اور محبت ان کے سامنے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ غریبوں کو علاج کے لیے بہترین سہولیات مہیا کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ وہ غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پکڑے کاغذ کا گولہ بنا رہی تھی جو رستے میں کہیں پھینک کر اپنے خلاف ثبوت مٹانا چاہتی تھی۔

وہ باہر نکلنے لگی تو گلونہ نے اس کے دوپٹے کا پلو پیچھے سے پکڑ لیا۔

''پہلے مجھے معاف کرو گی تب باہر جانے دوں گی۔''

اس نے آہستگی سے دوپٹے کا پلو چھڑا کر کھلے ریشمی بالوں کو اک ادا سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''جا تجھے معاف کیا۔'' اور اسے ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

☆☆☆

''کیسے لگ رہے تھے ازرک خان؟''

ودانہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

وہ ان کی واپسی کی راہ بڑی بے قراری سے دیکھ رہی تھی۔

''ظاہر ہے جیسے ہیں ویسے ہی تو لگ رہے ہوں گے۔'' جی تو چاہ رہا تھا، اس گھٹیا انسان کی ہر بات اسے بتا دے لیکن ودانہ سمیت کوئی اس کی بات کا یقین بغیر ثبوت کے نہ کرتا۔ اس لیے وہ کچھ اور سوچ رہی تھی اور اس سوچ پر عمل کرنے کے لیے اسے شہباز خان کے فون کا انتظار تھا جو ازرک خان کے گھر سے آتے ہی کہیں نکل گیا تھا۔

''مطلب کہ حسین۔ ہینڈسم اور گریس فل؟''

وہ تکیہ گود میں رکھے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ودانہ کی بات سن کر شرارت سے تکیہ اسے مارتے ہوئے بولی۔

''ہاں جیسا تمہیں لگے ضروری تو نہیں کہ سب کو وہ ویسا ہی نظر آئے۔''

وہ تکیہ کیچ کر کے سینے سے بھینچتے ہوئے مخمور آنکھیں اس پر جمائے گانے لگی۔

وے سب تو سوہنڑیا
ہائے وے من موہنڑیا
میں تیری ہوگئی
پیار وچ کھو گئی۔''

فون بجا تو پشمینہ باہر نکل آئی

''جی لالہ! کچھ پتا چلا؟'' وہ سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔

دوسری طرف سے آتی آواز کو سنتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کوئی یہ سب سن نہ رہا ہو۔

☆☆☆

وہ بڑے سے ہال نما کمرے میں چائے کی ٹرے سمیت اندر داخل ہوئی تو بڑے داجی دونوں بہن بھائی کے ساتھ سامنے کچھ کاغذات رکھے بیٹھے تھے۔

''میرا مشورہ مانیں لالہ! تو ابھی اسے پاور آف اٹارنی نہ دیں۔ شادی کے بعد سب کچھ تو ویسے بھی ودانہ بیٹی کا ہو جائے گا۔ اس لیے شادی ہونے

دیں۔"

وہ چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے تشویش بھری نظروں سے میز پر رکھے کاغذات کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں چاہتا ہوں، جلد سے جلد کام شروع کر دیا جائے۔ کچھ زمین وہ بیچے گا اور وہی پیسے اسپتال کی تعمیر پر لگائیں گے۔ ایک آفر آئی ہے تمہاری بھابھی کے حصے کی نہری زمین کے چودہ کروڑ دے رہے ہیں وہ لوگ لیکن زمین اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ شام کو ازرک بیٹے کو اس کے والدین سمیت بلا لیتے ہیں۔ کھانا بھی اکٹھے کھالیں گے اور اس موضوع پر بات بھی کرلیں گے۔"

وہ چائے کی پیالی ان کے ہاتھ میں پکڑا کر پریشانی سے سوچ رہی تھی کہ جیسے وہ چاہ رہا ہے سب ویسا ہی ہونے والا ہے۔ آج کی لڑکی ہوں۔ میں مضبوط اور ہوشیار۔ مجھے ہرانا آسان نہیں ہوگا ازرک خان؟"

وہ ڈائجسٹ ریڈر تھی۔ ڈائجسٹ جس میں عورت کو ہر طرح سے خود کو منواتے دکھایا جاتا ہے۔ وہی عورت تو اس کی آئیڈیل تھی۔ وہ خوابوں کی راہ گزر پر چلتی ہوئی حقیقت کی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی اس کے چہرے پر ایک عزم تھا۔

☆☆☆

"جی داجی! میرے ایک جاننے والے ہیں جو ابوظہبی سے آئے ہیں اور وہ یہاں زمین لینے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے اٹھارہ کروڑ کی آفر کی ہے میرے خیال میں اس سے اچھے پیسے نہیں مل سکیں گے۔"

ازرک خان بڑی سنجیدگی سے اندرونی خوشی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تو داجی نے سر ہلاتے ہوئے فائل بیوی کے سامنے رکھ دی۔ قریبی صوفے پر ازرک خان کے والدین بھی بیٹھے تھے جن کے کھلے کھلے چہرے اس بات کے گواہ تھے کہ وہ بیٹے کی عزت افزائی پر بہت شاداں ہیں..... شاہ گل کے چہرے پر ہلکے سے ملال کا رنگ نمایاں تھا جسے وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ آج کی محفل جائیداد ازرک خان کے حوالے کرنے کے لیے سجائی گئی تھی۔

"یہاں دستخط کردو بیگم! اس زمین کی ساری رقم ازرک بیٹے کے حوالے کردیں گے تاکہ یہ کام شروع کرادے۔"

اس سے پہلے کہ وہ دستخط کرتیں شہباز خان نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے ایک ماڈرن سی بظاہر انگریز نظر آنے والی خاتون کو لے کر اندر داخل ہوا۔

"شہباز بیٹا! یہ کون ہے؟" دبلی پتلی خوب صورت لڑکی نے چوڑی دار پاجامہ اور لمبا سا فراک پہنا ہوا تھا اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

"ارے ارے آپ اٹھ کر کہاں جا رہے ہیں بیٹھیں ابھی تو کروڑوں روپیہ کی جائداد آپ کو ملنی ہے ابھی سے نکلنے کی کوشش نہ کرو جناب ازرک خان صاحب۔"

کمرے میں موجود سب ہی لوگ حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ازرک خان کی متغیر رنگت اور کانپتے ہاتھوں کی لرزش شہباز خان کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"شہباز خانہ بچے! یہ لڑکی کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟ تم سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟" شاہ گل نے تیز لہجے میں پوچھا تو وہ اس لڑکی کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"یہ لڑکی میری بہن جیسی ہے لیکن اس کا ایک رشتہ ازرک صاحب سے بھی ہے۔ جو وہ خود بتائیں گے۔ کیوں ازرک خان! یہ کیا لگتی ہے تمہاری؟"

وہ چبا چبا کر پوچھ رہا تھا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس سے تمہارا رشتہ بہت گہرا ہے اور اس رشتے کا کوئی ثبوت نہ چھوڑ کر بھی تم ایک ثبوت چھوڑ آئے ہو اور وہی زندہ ثبوت تمہیں اس رشتے کا اعتراف سب کے سامنے کرنے

پر مجبور کرے گا۔'' وہ سخت گھبرایا ہوا تھا لیکن بڑی تیزی سے اس نے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

''یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔ میں نے اس سے نکاح نہیں کیا نہ ہی یہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ یہ سب سازش ہے میرے خلاف جو شہباز خان اور اس لڑکی جویریہ صدیقی نے مل کر کی ہے۔''

پشمینہ چند پل پہلے شہباز خان کی میسڈ کال دیکھ کر ودانہ کا ہاتھ پکڑے کمرے میں آ چکی تھی وہ چاہتی تھی سب کچھ ودانہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تاکہ کسی فیصلے پر پہنچ سکے۔

''میں نے کب کہا کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے یا تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے؟ اور ہاں سب لوگ گواہ ہیں کہ میں نے تو ابھی اپنی اس بہن کا نام بھی نہیں بتایا پھر تم کیسے جان گئے ہو کہ یہ جویریہ صدیقی ہے؟''

وہ گڑبڑایا ہوا تھا منزل بالکل سامنے میز پر پڑی تھی صرف ایک دستخط کی بات تھی۔ پین ابھی بھی ودانہ کی ماں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی ان کے ہاتھ کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی سامنے کھڑی جویریہ صدیقی کے نفرت بھرے چہرے کی طرف۔

''شہباز خان! یہ قصہ کیا ہے، جلدی سے بتاؤ ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔'' بڑے داجی نے قریب بیٹھے چھوٹے بھائی اطلس خان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جو دوسرے ہاتھ سے ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے بھائی کو خاموش تسلی دے رہے تھے۔

''ماما جی! یہ لڑکی آپ کو ساری صورتحال سے آگاہ کرے گی۔ بولیں جویریہ بہن یہی موقع ہے آپ کے بولنے کا۔''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولنے لگی۔

''ازرک خان سے میری ملاقات دو سال پہلے ہوئی جب اسے ایک جرم میں ملوث ہونے پر انگلینڈ سے نکالا جانے والا تھا۔ اسے اپنے مستقبل کی خرابی کا ڈر تھا سو اس نے میرے سامنے اپنی مجبوریوں اور مسائل کا رونا کچھ اس طرح رویا کہ میں باوجود والدین کی مخالفت کے اس سے شادی کرنے پر راضی ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر خود کو تو بچا لیا لیکن میری زندگی برباد کر دی۔ نشے اور دیگر بری عادتوں کی وجہ سے یہ پڑھائی مکمل نہ کر سکا اور وہاں کے سارے اخراجات میں کام کر کے پورے کرتی۔ جب کچھ عرصہ پہلے پاکستان جانے کا ارادہ کیا تو میں نے ساتھ جانے کی ضد کی لیکن مجھے بہانوں سے ٹالتا رہا۔ میں پریگننٹ ہوں میری خواہش تھی کہ ایسی حالت میں مجھے کام نہ کرنا پڑے میں کچھ آرام کرنا چاہتی تھی اور بقول اس کے پاکستان میں ان کا خاندان بہت امیر کبیر ہے تو میں نے سوچا اس کے گھر والے بحیثیت ایک بہو اور اپنی آئندہ نسل کی ماں کی حیثیت سے عزت دیں گے اور وہ آرام بھی جو مجھے چاہیے تھا لیکن یہ مجھے دھوکا دے کر پاکستان نکل گیا اور مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ یہاں کا نمبر بھی میرے پاس نہیں تھا مجھے احساس ہوا کہ یقیناً کوئی گڑبڑ ہے جو اس نے یوں سارے رابطے ختم کر رکھے ہیں۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کا سگنل دے رہی تھی۔ میں ٹکٹ کرا کے پاکستان آ گئی جو ایڈریس اس نے بتایا تھا اس پر گئی تو انکشاف ہوا کہ ایڈریس غلط تھا۔ اب میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا اس تک پہنچنے کا۔ ایسے میں میری ایک پاکستانی دوست نے مدد کی۔ ازرک کے بارے میں معلومات بھی کرواتی رہی اور اپنے گھر میں بھی رکھا۔ اس کے شوہر ایک این جی او میں کام کرتے ہیں اور شہباز بھائی اس این جی او کے ڈونرز میں سے ہیں۔ انہیں کل میری سہیلی کے میاں نے ازرک کی تصویر بھیجی کہ آپ بھی پٹھان ہیں شاید ان صاحب کے بارے میں کوئی معلومات رکھتے ہوں۔''

سب لوگ دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ودانہ نے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور پشمینہ نے اسے تھاما ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔

''باقی کی کہانی آپ کو میں سناتا ہوں۔ میں نے جب اظہر صاحب کی بھیجی ہوئی تصویر دیکھی تو حیران رہ گیا کیونکہ وہ تصویر ازرک کی تھی اور اس کے ساتھ جو کہانی انہوں نے سنائی، وہ ناقابل یقین تھی میرے لیے۔ میں نے فوری طور پر جویریہ بہن سے فون پر بات کی اور ان سے ساری تفصیل معلوم کر کے جلد سے جلد یہاں آنے کی درخواست کی کیونکہ مجھے اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ دیر ہوگئی تو ہمارے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ زمین اور اسپتال کے نام پر اتنی بڑی رقم انہیں مل گئی تو واپس لینا ناممکن ہوگا اسی لیے ہم نے جلدی جلدی سب کچھ سامنے لانے کا فیصلہ کر لیا۔''

''یہ سب جھوٹ ہے اور صرف شہباز خان کی نہیں اس لڑکی جویریہ کی بھی سازش ہے۔ یہ دونوں مل کر یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے۔ ہاں میں اس لڑکی سے واقف ہوں، میرے دوست کی گرل فرینڈ تھی اور وہیں مجھے دیکھ کر یہ لڑکی میرے پیچھے لگی ہوئی ہے لیکن میں نے کبھی اسے لفٹ نہیں کرائی۔ اس لیے یہ انتقامی کارروائی پر تل گئی ہے، اسی طرح آپ سب جانتے ہیں کہ شہباز خان بھی ودانہ کے ساتھ رشتے کا خواہش مند تھا تو یہ دو ناکام لوگوں کی ملی بھگت سے رچایا گیا ڈرامہ ہے۔ اس لڑکی سے پوچھیں کہ اس کے پاس ہمارے نکاح کا کوئی ثبوت ہے؟''

وہ پراعتماد انداز میں داجی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تو سب ہی لوگ سوالیہ انداز میں جویریہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''اس وقت کوئی ثبوت نہیں ہے کیونکہ یہ شاطر آدمی سارے ثبوت ختم کر کے آیا ہے لیکن میں دو تین دن میں سارے کاغذات آپ کے سامنے پیش کر دوں گی۔''

''شادی کی کوئی تصویر تو ہوگی، کم سے کم موبائل میں تو ہونی چاہیے؟''

یہ سوال اطلس خان نے کیا تھا۔

''میں نے آپ کو بتایا نا یہ سارے ثبوت ختم کر کے پاکستان آیا ہے، یہاں تک کہ میرے موبائل فون کی ساری پکچرز بھی ڈیلیٹ کی ہوئی ہیں اس نے۔'' وہ بے بسی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

''جب تک تم کوئی ثبوت پیش نہیں کرو گی، ہم صرف تمہاری زبان پر کیسے بھروسا کر سکتے ہیں وہ بھی اتنے بڑے معاملے میں؟'' یہ شاہ گل تھیں۔

''کیا آپ نہیں جانتیں کہ آپ کا بیٹا کبھی جھوٹ نہیں بولتا؟''

شہباز خان نے افسوس بھرے انداز میں ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ چپ ہوگئیں ماں تھیں۔ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ بیٹا جو کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ سو فیصد سچ ہے لیکن بغیر ثبوت کے اس کی بات کا بھروسا صرف ماں ہی کر سکتی تھی اور کوئی نہ کرتا۔

معاملہ مشکوک ہوتا جا رہا تھا اور سب ہی کے چہروں پر شش و پنج کی عجیب سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔

''ہمارے بیٹے کی اچھائی کی گواہی دینے والے بہت سے لوگ ہیں، ہمیں فخر ہے کہ ہم ایسے بیٹے کے والدین ہیں، جس کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔ یہ دونوں سراسر جھوٹ بول رہے ہیں نہ میں نے اور نہ ہی آپ دونوں بھائیوں نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں آپ بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں اور مجھے بھی یہ معلوم ہے کہ انتقامی کارروائی میں لوگ ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔''

ازرک کے باپ کی بات پر بڑے داجی نے اثبات میں سر ہلایا۔

پشمینہ بی بی ساری سچویشن کو دیکھ کر کوئی ایسا ناول یا افسانہ یاد کر رہی تھیں جس میں ایسا کوئی سین ہوا ہو لیکن شدید پریشانی میں اسے کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا لیکن.....

اپنے بڑوں کے چہروں پر پھیلی نرمی نے اسے ایک فیصلے پر پہنچا دیا اور وہ جب کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اسے اس سے ہٹانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔

''تو ازرک خان صاحب! پہلے تو آپ سے مخاطب ہوں یہ بتائیں۔ مجھے تو آپ کے ساتھ کوئی بیر نہیں ہے نہ ہی میں آپ کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرنا چاہوں گی۔ تو آپ سب لوگ جو میرے اپنے ہیں داجی۔ بڑے داجی آپ میری بات کا بھروسا تو کریں گے نا؟''

وہ سب کے سامنے یوں کھڑی تھی جیسے آج اپنی بات منوا کر ہی رہے گی۔

''پشمینے! یہ کیا بکواس ہے، تم بیچ میں کیوں بول رہی ہو؟'' مور جانہ نے اسے تنبیہی انداز میں گھورا تو وہ نظر انداز کرتی ہوئی سیدھی ازرک خان کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا سب لوگ اسے گھور رہے تھے۔

''یہ کیا ڈراما ہے عسکر خان! آپ نے ہمیں یہاں بے عزت کرنے کے لیے بلایا ہے؟'' ازرک کا باپ اسے گھورنے لگا۔

''بیٹھ جاؤ پشمینے! منہ بند رکھو''

مور جانہ کی آنکھوں میں لکھی تحریر وہ پڑھ کر بھی انجان بن گئی۔

''آخر کب تک ہاتھ باندھ کر منہ بند کر کے دائرے میں رہ کر اپنے سے بڑے بڑے دشمنوں سے لڑتی رہے گی عورت؟ نہیں میں ہاری ہوئی عورت کو جیتنے کی اداکاری کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے جیتنا ہے روایتوں سے، رسموں سے اور ظلم سے۔'' اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا ایسا عزم جس نے داجی سمیت سب کو چپ کرا دیا۔

اس نے موبائل فون کی وائس ریکارڈنگ سنانی شروع کی۔

کمرے میں پھیلی گہری خاموشی میں ان دونوں کی آواز با آسانی سنی جا سکتی تھی۔

''ازرک صاحب! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں ایک عزت دار باپ کی بیٹی ہوں۔ اس طرح اگر آپ کے ساتھ اکیلا مجھے کمرے میں کسی نے دیکھ لیا تو میرے خاندان کی بہت بدنامی ہوگی اس لیے برائے مہربانی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ میں کمرے سے باہر نکل جاتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ گلونہ بھی اس سارے معاملے میں ملوث ہے ورنہ وہ مجھے یوں کمرے میں اکیلا چھوڑ کر خود غائب نہ ہو جاتی''

''نہیں گلونہ کو اس معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے اسے میں ایک کمرے میں چاکلیٹس اور آئس کریم دے کر اندر آ گیا ہوں، وہ آدھے گھنٹے سے پہلے یہ سب ختم کیے بغیر نہیں آئے گی۔''

''مجھے آپ جیسے تعلیم یافتہ انسان سے اس سب کی توقع نہیں تھی۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ آپ نے اتنا عرصہ باہر رہ کر بھی کچھ نہیں سیکھا جو تعلیم انسان کے اندر علم کی روشنی نہ پھیلا سکے اس کا فائدہ کیا ہوا۔''

''باہر رہ کر میں نے یہی سیکھا ہے کہ بغیر شادی کے بھی ریلیشن میں رہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے یہ آفر دے رہا ہوں۔ کہ شادی تو میں آپ کی کزن ودانہ سے کروں گا لیکن ہم دونوں زمانے سے چھپ کر ایک دوسرے سے ریلیشن میں رہیں گے میں جانتا ہوں آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

میں آپ کے سامنے آج ایک اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مجھے اس لڑکی ودانہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ایسی میک اپ کی دکانیں تو میرے ارد گرد ہر وقت موجود رہتی ہیں جانے کیوں مجھے وہ لڑکی نقلی لگتی ہے۔ اگر مجھ سے میری پسند پوچھی جاتی تو میں تمہارا نام لیتا لیکن.....''

کمرے میں اتنی خاموشی تھی کہ اگر سوئی گرتی تو بھی آواز سنائی دیتی۔ سب ساکت بیٹھے یہ گفتگو سن رہے تھے۔

گلونہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس کے دل میں عقیدت کا ایک بت ٹوٹ کر گرا تھا لیکن دھڑام سے گرنے کی آواز کوئی نہ سن سکا۔ کمرے میں پشمینہ کی پراعتماد آواز گونج رہی تھی

''ودانہ ہر لحاظ سے آئیڈیل لڑکی ہے۔ مخلص، سچی اور حسین ترین۔ آپ کو اپنی قسمت پر رشک کرنا چاہیے بلکہ شکر ادا کرنا چاہیے۔''

''اس میں وہ سب نہیں ہے جو تم میں ہے..... لیکن میں اسے اپنانے کے لیے مجبور ہوں اور اپنی مجبوری تمہیں بتاتا ہوں، اس شرط پر کہ کسی کو اس راز میں شریک نہ کرنا اگر کسی سے کہو گی بھی تو سب یہ ہی سمجھیں گے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو، صرف اس لیے کہ چچازاد بہن سے جیلس ہو رہی ہو۔ اس کا اتنے قابل ڈاکٹر سے رشتہ جو طے ہو گیا ہے۔ سو صرف اس لیے تمہیں اس راز میں شریک کر رہا ہوں کہ تم میری مجبوری سمجھ سکو۔ میرے والد نے وہ قیمتی زمین حاصل کرنی ہے جو تمہارے بڑے داجی کی اور ان کی بیگم کی ملکیت ہے۔ اس کروڑوں کی زمین کی وارث ودانہ خان ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسپتال کے نام پر وہ زمین جلد ہی مجھے ملنے والی ہے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں تمہاری کزن میں۔''

''تو ہاسپٹل والے سارے عزائم محض باتیں ہیں؟''

''پشمینہ اطلس خان! تم بھی بہت بھولی ہو اور تمہارا سارا خاندان بھی بڑا معصوم ہے۔ میں بھلا اس چھوٹے سے گاؤں میں کام کر کے اپنا مستقبل برباد کروں گا؟ میرا دماغ اتنا بھی خراب نہیں۔ ہاں شادی اور جائیداد ملنے کے بعد ودانہ کو والدین کی خدمت کے لیے یہیں چھوڑ کر میں باہر واپس چلا جاؤں گا۔ ہاں تم اگر میرے ساتھ چلنا چاہو تو میں بخوشی سارے معاملات دیکھ لوں گا۔ اسٹوڈنٹس ویزا با آسانی لگتا ہے، بس پیسے لگتے ہیں پھر ہم دونوں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں کسی کے ہاتھ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔''

ساری باتیں ریکارڈ تھیں۔ اب کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کمرے میں عجیب قسم کا سناٹا پھیلا ہوا تھا سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ داجی کے چہرے کے تاثرات اس نے ڈرتے ڈرتے دیکھے، ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ بڑے داجی کا سر جھکا ہوا تھا جبکہ ازرک کے والدین کے چہرے بھی فق تھے۔ موبائل بند کرتے ہوئے پشمینہ نے ودانہ کی طرف دیکھنے کی ہمت اپنے اندر نہ پا کر وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

''مجھے اس شخص کے تیور دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اور اسے بڑی چالاکی سے ان معصوم لوگوں کے سامنے اصلی چہرے سمیت لانا ہے جو اس پر اندھا اعتبار بلکہ غرور کر رہے ہیں۔''

آخری بات سن کر ودانہ ضرور تڑپی ہو گی لیکن وہ ودانہ سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی۔ جس لڑکی کے غرور کے پرخچے سب کے سامنے اڑ چکے تھے وہ اپنے پاؤں پر جانے کیسے کھڑی ہے؟'' پشمینہ کو اس کے ہوش میں رہنے پر حیرانی تھی۔

ازرک اٹھ کر اپنی بہن گلونہ کی طرف بڑھا۔

''تم گواہ ہو گلونہ کہ اس لڑکی نے میرے لیے خط لکھا تھا جس میں میرے لیے اپنی محبت کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہ وہ ودانہ سے جلن محسوس کر رہی ہے۔ میں اس خط کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ تم بولو گلونہ! بتاؤ سب کو کہ یہ عمل کا ردعمل تھا۔ مجھے ٹریپ کیا گیا ہے۔'' وہ اندر ہی اندر ڈر رہی تھی۔ ایک بے وقوفی تو وہ کر چکی تھی اگر اس کا کوئی ثبوت تھا تو وہ گلونہ کی گواہی تھی۔ اس کے ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطرے اس کی اندرونی کیفیات کا پتا دے رہے تھے گلونہ نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر بولنے لگی۔

''نہیں لالہ! پشمینہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ اسے میں اچھی طرح سے جانتی ہوں یہ ایسا کوئی کام کر ہی نہیں سکتی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اپنی چچا زاد بہن اور سہیلی کے منگیتر کو اگر یہ خط لکھتی تو جب وہ لڑکا اس کے سامنے اظہار کر رہا ہے اپنے جذبات کا تب تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا نہ کہ آپ کو ملامت کرتی۔ لالہ بہنوں کی سہیلیاں بھی بالکل بہنوں جیسی ہوتی ہیں۔ آپ نے پشمینے سے یہ سب کہہ کر میری

نظریں جھکا دی ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ آپ میرے لالہ ہیں۔"

وہ رو رہی تھی۔ اس کے لیے ایک ہیرو کو زیرو بنتے دیکھنا بہت مشکل عمل تھا۔ ڈاکٹر ازرک خان ششدر سا ناقابل یقین نظروں سے بہن کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے والدین بھی نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ سب کچھ اتنا جلدی اور واضح ہوا کہ کوئی اسے غلط کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

ودانہ نے آنکھوں کے سامنے چھائے اندھیرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ سب کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

"کاش یہ سب جھوٹ ہو۔ کاش اے کاش۔"

گلونہ کی باتوں نے پشمینہ کو بھی رلا دیا۔ اس لڑکی نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

"گلونہ! تم اس لڑکی کی طرف دار بن رہی ہو جس کا کردار....." ازرک خان کچھ برا کہنا چاہ رہا تھا کہ شہباز خان کی برداشت ختم ہوگئی۔ وہ اس پر جھپٹ پڑا۔

"تم میری بہن کے کردار پر انگلی اٹھاؤ گے کمینے؟" اس نے ازرک کو گریبان سے پکڑ کر اس کا منہ تھپڑوں سے لال کر دیا۔ ازرک کے والد بیچ بچاؤ کرا رہے تھے کہ اچانک اخلس خان نے قریب پڑی کلاشنکوف اٹھالی اور اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا۔ وہ کلاشنکوف نیچے گرے ہوئے ازرک کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ان کی انگلی دبنے ہی والی تھی کہ دو عورتیں تڑپ اٹھیں۔ ایک ازرک کی ماں تھی اور دوسری اس کی بیوی جویریہ صدیقی۔ یہ منظر دیکھ کر سب دم بخود سے انہیں دیکھنے لگے۔ شاہ گل نے دل پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ گلونہ شدت خوف سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے نیچے گرے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی اور پشمینہ کا سانس گلے میں اٹک گیا تھا۔

وہ دونوں عورتیں رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں کہ دھڑام سے کچھ گرنے کی آواز سنائی دی تو سب ادھر متوجہ ہوگئے۔ ودانہ نیچے کارپٹ پر بے ہوش پڑی تھی اور روتی ہوئی ماں اس پر جھکی ہوئی تھی۔

☆☆☆

داجی اور بڑے داجی کا غصہ شہباز خان نے کیسے ٹھنڈا کیا؟ مورجانہ اور تائی جان کو کیسے شاہ گل نے سنبھالے رکھا؟

ودانہ کو پشمینہ نے کیسے ایک برا خواب سمجھ کر سب کچھ بھولنے پر آمادہ کیا؟

اور جویریہ صدیقی کو کیسے ساس سسر نے قبول کیا اور ازرک سے منگنی ٹوٹنے کی وجہ پہلی شادی کو قرار دے کر کیسے اسے برادری سے نکالا گیا۔

اس معاشرے میں ان ہی باتوں پر قتل ہوتے تھے لیکن اس معاملے میں قتل اور دشمنی کیسے ہوتے ہوتے رہ گئی اور..... یہ سب کیسے ہوا یہ ایک طویل کہانی ہے۔

ودانہ اور سب گھر والے اس کے احسان مند تھے، جس نے اس قدر سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی زمین، جائیداد، دولت اور عزت کے ساتھ ساتھ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کی زندگی بھی برباد ہونے سے بچالی تھی۔

اس دن شہباز خان اور ودانہ کے نکاح کی تقریب تھی۔ ان کے بڑے سے لان میں خوب صورت رنگ برنگی روشنیوں سے چمکتے چہرے پر خوشیوں کے رنگ لیے دونوں اسٹیج پر بیٹھے بہت حسین لگ رہے تھے۔ ودانہ بہت خوش تھی۔ اسے اب جا کر احساس ہوا تھا کہ شرافت اور اچھائی دنیا کی نایاب ترین خوبیاں ہیں اور محبت اللہ کا خاص انعام ہے۔ ازرک نام کے ایک ڈریکولا نے اس کے احساسات کا خون پی کر اسے مارنا چاہا تھا لیکن اپنوں کی مسیحائی نے اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اب یہ زندگی ان ہی اپنوں کی تھی۔ جس میں اس کے والدین کے علاوہ شہباز خان اور پشمینہ بھی شامل تھے۔

"تم خوش تو ہو نا؟" وہ سنہری شیروانی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر صاف لکھا

تھا میں تمہارا ہوں صرف تمہارا۔

''میں بہت خوش ہوں بلکہ خوش قسمت بھی ہوں کہ آپ جیسا جیون ساتھی ملا ہے جو سچا اور مخلص ہے۔'' وہ شرمیلے لہجے میں بولی۔

''میں نے اتنی شدت سے اپنے رب سے تمہیں مانگا تھا کہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ تم کسی اور کی ہو جاتیں۔''

''شاید آپ کی دعاؤں نے ہی مجھے اس شخص سے بچالیا ورنہ تو میرے والدین جن کی ہر خوشی میری خوشی سے جڑی ہوئی ہے، جیتے جی مر جاتے۔''

اسے وہ بھیانک مناظر یاد آئے تو جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''اتنے حسین لمحات میں بے توقیر لوگوں کا ذکر نہ کرو دانہ شہباز خان۔''

وہ اسے اپنا نام دے چکا تھا اور اب لطف لے رہا تھا اپنے نام سے اس کے نام کو جوڑ کر۔

''کسی کی اتنی ہمت نہیں کہ شہباز خان اور پشینہ اطلس خان کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی دکھ دے سکے۔'' پشینہ نے پیچھے سے جھک کر کہا تو دونوں ہنس پڑے۔

''ذرا شرم کرو تم لوگ، ساری بڑی بوڑھی خواتین باتیں بنا رہی ہیں کہ ان کے دیدوں کا پانی مر گیا ہے یا خوشی برداشت نہیں ہو رہی جو کھی کھی کیے جا رہے ہیں۔ ایک بزرگ آنٹی تو فرما رہی ہیں کہ شاید ان دونوں نے بھنگ پی لی ہے۔''

اس کے کہنے پر دونوں نے سنجیدہ شکلیں بنانے کی ناکام کوشش کی مگر مسکراہٹ تھی کہ لبوں پر پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ دل کی دنیا میں بھی تو جشن کا سماں تھا۔ اندر کی خوشی چہرے پر پھیلتی ضرور ہے۔ غم انسان چھپا بھی لیتا ہے کہیں چھپ کر، آنسو بہا کر لیکن خوشی تو چھپائے نہیں چھپتی۔ مسکراہٹ تو کسی کونے میں چھپا بھی نہیں سکتا انسان۔ پشینہ دونوں کو خوش دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ کسی کے اپنی طرف متوجہ ہونے کا احساس ہوا۔

اس نے محفل میں ادھر ادھر نظر گھمائی۔ سارا خاندان موجود تھا۔ خوش گپیوں میں مگن خواتین۔ بناؤ سنگھار کیے اترائی پھرتی لڑکیاں۔ ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے بچے اور ایک شاہ میر خان بھی تو تھا جو ہاتھ میں کیمرہ تھامے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یوں کیوں گھورے جا رہے ہیں پہلے کبھی حسین لڑکی نہیں دیکھی؟'' وہ بہت پراعتماد ہو گئی تھی۔

وہ گڑبڑا گیا۔

''یہ لڑکیاں بھی نا۔ جتنی ہوشیار ہو جائیں لیکن خوش فہم ضرور ہوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

تو وہ مسکرا دی۔

''کتنی خوب صورت جوڑی ہے ماشاءاللہ۔''

''ہاں دونوں کو ایک کرنے میں آپ کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے۔''

وہ فرضی کالر جھاڑتے ہوئے مسکرائی۔

''اگر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے تو کیا میرے کام آئیں گی؟'' وہ اس سوال پر ہنس دی۔

''دیکھ لیں گے اگر ممکن ہوا تو کچھ مدد کر ہی دیں گے۔ آپ بھی کیا یاد رکھیں گے؟''

''ارے سنا ہے آپ نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ ایک بہادر لڑکی کے طور پر پہچان مل گئی ہے آپ کو۔ ورنہ تو سب ہی آپ کے بارے میں یہ کہتے تھے ڈائجسٹ پڑھنے والی لڑکی ہے خوابوں خیالوں میں کھوئی رہتی ہے دبو اور شرمیلی سی۔ ان ڈائجسٹس میں اور ہوتا ہی کیا ہے عشق و محبت اور خوابوں کی سوداگری کے علاوہ۔ یہ تو خود فریبی کی ایک ایسی عینک ہے جسے پہن کر ہم سب اچھا اچھا دیکھ سکتے ہیں، حقیقی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے ان میں الفاظ کے کچے پکے رنگوں سے پینٹ کی گئی دنیا۔''

وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''مسٹر شاہ میر خان! آپ کو بڑی معلومات ہے میرے بارے میں؟ میں نے ڈائجسٹ کو برا کہنے والوں سے لڑنا چھوڑ دیا ہے۔ سب کی اپنی مرضی ہے۔ میں نے جو سیکھا، ان ہی کہانیوں

افسانوں سے سیکھا ہے، ان میں لکھا ہوتا ہے کہ لڑکیاں تر نوالہ نہیں ہوتیں جو مرد انہیں کھا کر ہضم کر جائیں بلکہ لڑکیاں اپنی حفاظت پتھر بن کر کریں جو اکٹھے ہوں تو پہاڑ بن جاتے ہیں اور الگ ہوں تب بھی کسی کا سر تو پھاڑ ہی سکتے ہیں۔"

"اوہ! پھر تو مجھے آپ سے دور بیٹھنا چاہیے۔" وہ ذرا دور ہوتے ہوئے بولا تو پشمینہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"مطلب یہ کہ آپ اعتراف کر رہے ہیں کہ آپ بھی ان ہی مردوں میں سے ایک ہیں جو خواتین کو تر نوالہ سمجھ کر کھا جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں؟"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ میں کیا ہوں۔"

"مجھے اب اس بات میں دلچسپی ہی نہیں کہ کون کیا ہے؟ مجھے اس بات میں۔ دلچسپی ہے کہ میں کیا ہوں؟"

"مطلب یہ ہوا کہ تم اب خواب نہیں دیکھتیں؟"

وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔

"یہ میوزک کی آواز بہت تیز ہے۔" وہ اس کا سوال ان سنا کر گئی۔

"میں نے پوچھا تم خواب نہیں دیکھتی ہو؟"

وہ سجی سجائی خواتین کو دیکھ کر چند لمحے سوچنے لگی۔

"دیکھتی ہوں خواب بھی لیکن حقیقت پسند بھی ہوں کیونکہ کچھ حقیقتیں خوابوں سے بھی زیادہ حسین ہوتی ہیں ان کے ٹوٹنے کا ڈر بھی نہیں ہوتا۔"

"ہاں بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن میں خواب دیکھتا ہوں اور بہت دیکھتا ہوں۔"

"تو آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" شاہ میر کی نیلی آنکھوں سے عجیب سی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ خود سے ڈر سی گئی۔ پہلے ہی ایک ڈراؤنے خواب نے اسے پچھتاوے کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ یہ تو مور جانہ کی ذات تھی جنہوں نے اسے اس دلدل سے واپس نکال کر شکر کی نصیحت کی تھی۔ شکر

اس لمحے کا جب اس نے اس شخص کے منصوبوں کو موبائل کے ایک چپ سے ریکارڈ کر لیا تھا اور شکر اس لمحے کا جب وہ وہاں سے نکلتے ہوئے اپنے ہاتھ کا لکھا کاغذ ساتھ لے آئی تھی ورنہ گھر کے مردوں کے سامنے اس کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے۔ اس کا غیرت مند باپ اسے گولی مار کر غیرت کے نام پر قتل ہی کر دیتا۔

اس نے وہ لمحہ دیکھا تھا۔ جب شدید غصے میں شہباز خان ازرک کو مار رہا تھا اور وہ لمحہ بھی جب داجی نے کلاشنکوف کی نالی ازرک کی کنپٹی پر رکھ کر کہا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی سے یہ سب کہنے کی۔" تب ازرک کی ماں اور بیوی نے ان کے قدموں میں اپنی اوڑھنی رکھ کر اللہ اور رسول کے واسطے دیتے ہوئے التجا کی تھی کہ جیسا بھی ہے وہ ان کا اکلوتا سہارا ہے اسے اللہ کے لیے معاف کر دیں وہ گاؤں چھوڑ کر باہر چلا جائے گا اور کبھی ان کے سامنے نہیں آئے گا۔

اور جب جویریہ نے یہ کہا کہ میرے ہونے والے بچے کو یتیم نہ کریں پلیز تب ان کے ہاتھ کانپے تھے اور مور جانہ نے جب سامنے آ کر یہ کہا کہ میں اور میری بیٹی آپ سے ملنے جیل میں نہیں رل پائیں گے تب بڑے داجی کے کہنے پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ازرک لوگ گاؤں سے نکل جائیں گے اور کبھی واپس نہیں آئیں گے.....

اس نے شکر ادا کیا تھا کہ اس دن ازرک کا قتل نہیں ہوا ورنہ کئی زندگیاں برباد ہو جاتیں، جس میں اس کے سب ہی پیارے شامل تھے مار دینا تو آسان تھا لیکن پھر سنبھالنا بہت مشکل ہوتا۔ اسے گلونہ کے چلے جانے کا دکھ تھا لیکن اس سے ملنا تو ویسے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ گاؤں میں رہ کر بھی۔ وہ اس کی آواز سے چونکی

"یاد ہے، کچھ سال پہلے تم نے مجھے دیوانہ کہا تھا؟"

اس نے دو پیاری پیاری بچیوں کو کیمرے میں

فوکس کرتے ہوئے تصویر بنائی اور وہ لہنگے لہراتی بھاگ گئیں۔

''دیوانہ فرزانوں سے بہت بہتر ہوتا ہے جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ اسے اپنے سود و زیاں کی فکر سے آزادی ملی ہوتی ہے۔ جو غرض کے رستے پر چلتے ہوئے دوسروں کی راہ میں کانٹے بچھانا جائز سمجھے وہی فرزانہ ہے۔''

''کہاں سے سیکھی ہیں یہ فلسفیانہ باتیں؟''

''زندگی سے۔'' وہ جھٹ بول پڑی۔

''کیا ڈائجسٹ میں، کتابوں اور کہانیوں میں زندگی ہوتی ہے؟'' وہ ادھر ادھر سے تصاویر بھی لے رہا تھا اور اس سے سوال بھی کر رہا تھا۔

''ہاں اس طرح انسان صرف اپنی ہی نہیں بہت سے لوگوں کی زندگیوں سے سبق لیتا ہے۔ میں نے بھی ہر کہانی سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ بنا سبق کے بنا پیغام کے کوئی کہانی نہیں ہوتی۔ ضروری نہیں کہ آپ اپنی زندگی میں ہر تجربہ کر کے دیکھیں دوسروں کے تجربات سے فائدہ بھی تو اٹھایا جا سکتا ہے۔''

شاہ گل اور مور جانہ اسٹیج پر بیٹھی شاہ میر خان کو اشارے سے بلا رہی تھیں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''پشمینہ میری زندگی کی کہانی سے بھی بہت سارے سبق ملیں گے تمہیں، کبھی کوشش کرو تو قصے کہانیوں جیسے لوگ بھی آس پاس مل جاتے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عام سے لوگ کتنے گہرے ہیں۔ سمندر جیسے گہرے جس میں اتر کر ہی اندر چھپی حیرتوں سے سامنا ہوتا ہے انسان کا؟ میں تمہیں ایسے ہی ایک انسان کی کہانی سناؤں گا۔''

وہ حیرانی سے اسے جاتا دیکھتی رہی جو اسٹیج پر سب کی پکچرز بنا رہا تھا۔

''انہوں نے تو کبھی سیدھے منہ میرے ساتھ بات ہی نہیں کی تھی۔ آج پہلی بار اتنی باتیں کی ہیں نہ جانے کیوں؟'' وہ الجھی ہوئی تھی۔

نکاح تو ہو گیا تھا لیکن رخصتی دو مہینے بعد رکھی گئی تھی۔ بہت سی تیاریاں کرنی تھیں۔ آخر کلوتی بیٹی تھی بڑے داجی کی۔ اسے خوش دیکھ کر سب خوش تھے۔ نکاح کی تقریب کے بعد مہمانوں کو رخصت کیا گیا۔ شاہ گل اور باقی بزرگ سونے کے لیے چلے گئے جبکہ پچھلے لان میں شاہ میر خان بھائی بھاوج کی فوٹو گرافی کر رہا تھا۔ وہ بھی سب کے اصرار پر وہیں بیٹھی انجوائے کر رہی تھی۔

''یار اب بس کرو بہت تھک گئے ہیں ہم دونوں۔''

شہباز کے کہنے پر اس نے اپنا کیمرہ رکھ دیا۔

''اگر چند لمحوں کے لیے آپ ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ دیں تو بہت مہربانی ہوگی ہمارے ہونے والے بال بچے بھی آپ کے شکر گزار رہیں گے۔'' شہباز خان نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑے تو وہ ہنس دیا

''لالہ آج ہی نکاح ہوا اور آج ہی بال بچوں کی باتیں شروع؟'' انداز میں شرارت تھی

ودانہ شرما گئی۔

پشمینہ وہیں گھاس پر پالتی مارے بیٹھی مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی

''چلو یار مسز ودانہ شہباز! ٹیرس پر چل کر چاندنی میں نہاتے ہیں یہ تو اکیلا چھوڑنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ یہ ہی کچھ لمحے ہیں ہمارے اپنے کیونکہ تھوڑی دیر میں ہی ہمارے والدین تہجد کے لیے نکل آئیں گے'' شہباز خان نے پورے استحقاق کے ساتھ ودانہ کا ہاتھ تھاما اور وہ گلابی رنگ کا بھاری لہنگا سنبھالتی اس کے ساتھ چل پڑی۔

شاہ میر خان بھی وہیں پشمینہ کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔

وہ کپڑے بدل کر ایک ہلکا سا سبز رنگ کا شلوار قمیص اور سفید دوپٹہ پہن کر میک اپ صاف کر کے آئی تھی لیکن پھر بھی ہلکی سی میک اپ کی تہہ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر نظر آ رہی تھی۔

''تو کہانی سنو گی؟''

وہ اٹھنے لگی۔

''نہیں، کہانی دن میں کسی وقت سن لوں گی اس وقت مناسب نہیں لگ رہا۔''

اسے وہی افسانوی ماحول اپنے سحر میں جکڑ رہا تھا جو وہ پڑھتی تھی اور کبھی کبھی تصور میں بھی دیکھتی تھی چاندنی رات کی ٹھنڈی کرنوں سے جگمگاتا چہرہ لیے شوخ و چنچل ہیروئن۔ آنکھوں میں محبت کا پیغام لیے خوبرو نوجوان ہیرو، بادصبا کے مہکتے جھونکوں سے اڑتی ہیروئن کی ریشمی زلفوں کی شوخ لٹیں۔ اس نے اپنے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے شاہ میر خان کی طرف دیکھا تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو نہیں پتا کہ دن کو کہانیاں سننے اور سنانے سے مسافر رستہ بھول جاتے ہیں؟''

''ویسے میرا کوئی بھی مسافر نہیں ہے۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

وہ بولا۔ ''ہم سب اس فانی دنیا میں مسافر ہی تو ہیں۔''

''ٹھیک ہے سنا دیں کہانی۔'' وہ قدرے سمٹ کر اس سے ذرا دور بیٹھی تھی۔

''کہانی شروع ہوتی ہے، اس وقت سے جب ایک لڑکا جس کی عمر سات سال تھی۔ وہ اپنے رشتے داروں کے گھر آیا۔ اس گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی تھی اسے بچے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن اس دن ماں نے اس کی گود میں وہ بچی لا کر ڈال دی۔ بچے نے برا سا منہ بنایا لیکن وہ چند دن کی بچی اسے دیکھ کر مسکرانے لگی اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان کا رنگ گہرا سبز تھا سرخ و سفید اور مسکراتی ہوئی وہ معصوم سی گڑیا اسے اتنی اچھی لگی کہ اس نے بے اختیار اس کا ماتھا چوم لیا کمرے میں موجود سب لوگ مسکرانے لگے۔

''شاہ میر خان کو گڑیا اچھی لگی ہے، اب یہ اس کی ہو گئی ٹھیک ہے نا بھابھی جان؟''

سب ہنسنے لگے تو بچے نے اس گڑیا کا نام پوچھا تو اس وقت تک اس کا نام نہیں رکھا گیا تھا اسے کہا گیا اس کا نام تم بتاؤ اس نے کہا میں تو اسے گڑیا کہا کروں گا۔''

وہ غور سے سن رہی تھی گاہے بگاہے اس کی نظر بھٹک کر سامنے گیلری میں چلی جاتی جہاں ہاتھ تھامے دو دیوانے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رات بتا رہے تھے۔

''پھر کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے وہ بچی یوں تو اس کے گھر آتی یا وہ ان کے گھر جاتا تو وہ اسے گود میں لیے لیے پھرتا تھا لیکن اب وہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح اسے گود میں اٹھا کر پیار نہیں کر سکتا تھا۔

اس دن وہ ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوش تھا اس کے امتحان ہونے والے تھے اور ماں کے اصرار کے باوجود وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نے سب کچھ سنبھالا تھا اس لیے وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر زمین جائیداد اور کاروبار سنبھال رہا تھا لیکن دونوں ماں بیٹے کی خواہش تھی کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کرے۔

وہ اپنی کزن کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی لڑکے کو یاد تھا کہ اس دن وہ کالے کپڑوں میں ملبوس تھی اور اس کے سنہری ریشم کے لچھوں جیسے بال کمر پر کھلے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ اس نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔

''میں شادی کروں گی تو کسی بہت پڑھے لکھے بڑے آفیسر سے جیسے فری آپا کے شوہر ہیں۔ سی ایس ایس کر کے بڑے آفیسر بنے ہوئے ہیں اور وہ بھی اسلام آباد میں رہتی ہیں تو کبھی مری یا ایبٹ آباد میں۔ کتنا مزہ ہے نا بڑے آفیسر کی بیوی بننے کا، جہاں جاؤ پروٹوکول اور سرکاری گھر، گاڑیاں ملازم۔ ہائے کاش کہ ہمارے خاندان میں بھی کوئی اتنا پڑھا کو ہو کہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے آئے اور دادی سے میرا ہاتھ مانگ لے۔'' اس کی بات سن کر کزن ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑانے لگی۔

''ہاں جیسے سی ایس ایس کا امتحان تو مذاق ہے نا۔ ارے اس کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور

ہمارے خاندان میں کوئی اتنے دم والا نہیں جو آفیسر بن کر تجھے بیاہنے آئے گا۔"

"میرے خوابوں کا شہزادہ بہت پڑھا لکھا، اعلا تعلیم یافتہ اور بڑا آفیسر ہے۔ وہ ملے تو ٹھیک ورنہ میں شادی ہی نہیں کروں گی۔"

وہ لڑکا سن رہا تھا اور اسے وہ گڑیا اتنی اچھی لگتی تھی کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے زندگی بدلنے کا عہد کرلیا۔ وہ ساری مصروفیات سارے شوق اور دلچسپیاں چھوڑ کر صرف پڑھائی پر توجہ دینے لگا۔ سب حیران تھے کہ اسے کیا ہوگیا ہے لیکن اس نے بڑا آفیسر بن کر اپنی اس گڑیا کو اپنا بنانا تھا۔ اس کی ایک خواہش اس لڑکے کی زندگی کا مقصد بن گئی تھی

وہ جب ایک بار عید پر ان کے گھر آیا تو وہ اسے دیکھ کر اپنی کزن سے سرگوشی میں بولی۔

"یہ اگر کالا رنگ پہنیں تو کتنے پیارے لگیں نا؟ میرا بس چلے تو ان کے ہر رنگ پہننے پر پابندی لگا کر صرف کالا رنگ پہننے کی اجازت دوں۔"

وہ سرگوشی اس لڑکے کی سماعتوں تک پہنچنے کی دیر تھی اس نے اپنے اوپر ہر رنگ جیسے حرام ہی کرلیا۔ سارے رنگ برنگے کپڑے نوکروں اور دوستوں میں بانٹ دیے اور خود کالا رنگ پہننے لگا مگر اس لڑکی نے کبھی یہ بات نوٹ ہی نہیں کی۔

ایک بار وہ سب کزنز اکٹھے تھے۔ لڑکا ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ گھر کے برآمدے میں بیٹھا کتاب کے ساتھ ساتھ اسے بھی چپکے چپکے پڑھ رہا تھا باقی سارے لان کی چیئرز پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ باہر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے اچانک بال آکر اس لڑکی کے ماتھے پر لگا۔ ہارڈ بال کی چوٹ سے وہ وہیں تڑپنے لگی۔ اس کا ماتھے پر رکھا ہاتھ خون سے لال ہوگیا تھا سب چیخ چلا رہے تھے کسی نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ وہ رو رہی تھی لڑکا باہر نکلا اور کرکٹ کھیلنے والے لڑکوں کے بتانے پر اس لڑکے کی دھنائی شروع کردی جس کے شاٹ پر گیند اندر آیا تھا جب تک لوگ اسے بچاتے اس نے لڑکے کے ماتھے کو وہیں سے زخمی کردیا تھا جہاں سے اس کی گڑیا کا خون نکلا تھا۔"

پشمینہ کا ہاتھ بے اختیار اپنے ماتھے کے زخم پر گیا جہاں دو ٹانکوں کا نشان اس کے بالوں نے چھپا رکھا تھا۔

"کون ہے وہ لڑکی اور کون ہے وہ لڑکا؟"

اس کا سارا وجود سوال بن گیا تھا۔

"کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے؟"

اس کی آنکھوں نے حیرانی سے سوال کے بدلے سوال کیا۔

"ہاں اب بھی واضح الفاظ میں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کون ہیں وہ دونوں۔ جانتے ہیں کیوں؟ ہمارے ہاں کہانیاں، افسانے اور ناولز پڑھنے والی لڑکیوں پر ویسے ہی الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ خوش فہم ہوتی ہیں جو نظر ان پر پڑتی ہے وہ اس سے کئی معنی اپنی مرضی کے نکال کر آنکھوں کی دہلیز پر خوابوں کے محل تعمیر کرلیتی ہیں اور جب حقیقت کی آندھی چلتی ہے تو وہی محل ریت کے گھروندے بن کر بکھر جاتے ہیں تب آنکھوں میں ریت چبھتی ہے۔ بہت چبھتی ہے" وہ اسے دیکھنے لگا

"مطلب یہ بات سچ ہے نا تب ہی تو لوگ ایسا سمجھتے ہیں؟"

وہ چند لمحے پرسوچ انداز میں خلا میں دیکھتی رہی پھر بولی

"یہ جو کچی عمر کی لڑکیاں ہوتی ہیں نا انہیں نہ ماحول نہ کتابیں اور نہ ہی کوئی اور چیز خوابوں میں رہنے اور حقیقت کو اپنی مرضی کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا سکھاتے ہیں۔ یہ تو ان کی فطری مجبوری ہوتی ہے وہ محبت کی جانب یوں کھنچتی ہیں جیسے لوہا مقناطیس کی طرف۔ چاہے جانے کی خواہش ہر لڑکی میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے ہی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ خواہش جنگلی پھول کی طرح اچانک کہیں سے اگتی ہے۔ نہ اس کے لیے دل کی زمین نرم کرنی پڑتی ہے

عفت سحر طاہر

رنگ دے چنریا

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آ ؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آ ؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

زمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

زمین کی سہیلی بجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

زمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت

دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
نرمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ تھیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ سجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں سجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے نرمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں نرمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ کھنچی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں سجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ نرمین بے یقین ہوتی ہے۔
وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کے ولیمے کی صبح اس کا چیک اپ کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔
سجل نرمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آ جاتی ہے نرمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ نرمین کو برا لگتا ہے۔
نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ نرمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
نرمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ نرمین، سجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔
عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر نرمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ نرمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔
نرمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے نرمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر سجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے وہ اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔
نرمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، نرمین اسے سچ بتا دیتی ہے۔
عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو نرمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔
مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔
حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔
نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
حریم عباد سیکھی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ نرمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔
مارک، ڈینیل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ نرمین گھر میں نہیں ہوتی۔
حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔
عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد نرمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد نرمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔

چھٹی قسط

نرمین کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔
''دماغ ٹھیک ہے تمہارا عباد! یہ کیا بکواس ہے؟''
''کیا ہوا؟'' عباد نے تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔
''اگر یہ مذاق ہے تو بہت بھونڈا ہے۔ ختم کرو اسے۔'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔
''مذاق.....؟'' لفظ کو قدرے لمبا کھینچ کر وہ استعجاب سے اسے دیکھنے لگا۔ ''ہم ایک ریلیشن شپ میں ہیں نرمین مصطفیٰ! اور تم مجھ سے اکیلی میرے فلیٹ پہ ملنے آئی ہو۔'' لفظوں کو چبا کر کہا۔
''ملنے آئی ہوں..... تم پر بھروسا کر کے۔'' نرمین برافروختہ تھی۔
''تو میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ سب وہی ہے جو ایسے ریلیشنز میں عام سی بات ہے۔'' وہ اس قدر آرام سے بولا کہ نرمین بھک سے اڑی۔
''یہ فلیٹ..... یہ لگژریز پیس..... سب ملے گا، پریشان کیوں ہوتی ہو... مجھے خوش کرو گی تو تمہاری سوچ سے بڑھ کر نچھاور کروں گا۔'' اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے نرمین کا ہاتھ تھاما تو اس نے عباد کا ہاتھ جھٹک دیا۔
''ڈونٹ..... ڈونٹ ٹچ می۔'' وہ شدید صدمے کی زد میں تھی۔ اس کے لمس کو محسوس کر کے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔
''اگر یہ مذاق ہے تو بہت نفرت انگیز ہے عباد! کیا بکواس کر رہے ہو تم۔'' نرمین کی وحشت زدہ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کس قدر گھٹیا سوچ سنائی تھی اس نے اپنی۔ چند لمحوں تک وہ اسے گھورتا رہا پھر ہنس دیا..... بڑی محظوظ سی ہنسی تھی۔
''اب میں تمہاری اس بات سے متاثر ہو کر تالی بجاؤں یا ہنسوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایک مرد سے تنہائی میں ملنے آئی ہو، وہ تم سے حکایتیں تو نہیں سنے گا بیٹھ کر..... خواہ مخواہ کا ایٹی ٹیوڈ (اکڑ) دکھا رہی ہو۔''
''میرے خیال میں میں نے تم پر اعتبار کر کے، یہاں آ کر غلطی کر دی ہے۔'' نرمین کا تو ذہن ہی جیسے کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ اس نے آج پہلی بار عباد سے شرم کھا کر اپنا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا اور صوفے پر پڑا شولڈر بیگ اٹھا لیا۔
''اچھی طرح سوچ لو نرمین! قربت کے چند حسین پل دے کر تم یہ سب حاصل کر سکتی ہو۔ شادی تو کرنی ہی ہے..... مگر اس پیریڈ کو انجوائے کرنے کا الگ ہی مزہ ہے۔''
لگژری فلیٹ کی طرف ہاتھ پھیلا کر اشارہ کرتے ہوئے شیطان نے ایک اور کاری وار کیا تھا۔ نرمین کے کمزور نفس پر..... نرمین ساکت سی اسے دیکھنے لگی۔ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ کر عباد فاتحانہ مسکراتے ہوئے اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔

☆☆☆

''حریم!'' اماں اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ ابھی یونیورسٹی کے لیے کپڑے استری کر کے فارغ ہوئی تھی۔
''جی۔'' وہ چونکی۔ اماں بہت کم ان کے کمرے میں آیا کرتی تھیں۔ کوئی کام ہوتا تو جہاں ہوتیں، وہیں سے آواز لگا لیا کرتیں۔ وہ آ کر اس کے پاس بیڈ کے کنارے بیٹھ گئیں۔
''تم سے ایک بات کرنا تھی۔''
''جی اماں! کہیے..... مجھے آواز دے لیتیں، میں آ جاتی آپ کے پاس۔'' حریم تھوڑا سنبھلی۔ پھپھو کی آمد پر نرمین کے تاثرات کسی سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ اماں یقیناً اسی کا خلاصہ کرنے آئی تھیں۔
''نرمین کے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟''
''کیا مطلب.....؟'' حریم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اماں اس سے پوچھ گچھ کرنے سے آ سکتی ہیں ورنہ اپنا ''ہوم ورک'' مکمل رکھتی۔

''میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھے چلانے کی کوشش مت کرو حری!'' اماں نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ تو وہ شرمسار ہوگئی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر دبایا۔

''سوری اماں! پوچھیں۔ کیا پوچھنا ہے آپ نے؟'' ندامت سے کہا۔

''نرمین! کیا چاہتی ہے وہ؟ تم سے کبھی اس نے بات کی ہے شادی کے حوالے سے؟'' اماں کے لیے بھی یہ سب پوچھنا بہت مشکل تھا۔ سب کے لیے ایسے سوال پوچھنا مشکل ہی ہوا کرتا ہے جن کے جواب اپنی مرضی کے خلاف ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ حریم پر اس سوال نے کڑی ذمہ داری ڈال دی۔ آئندہ کے حالات اس کے جواب پر منحصر تھے۔ آج وہ جھوٹ بولتی تو کل کو ان کے خاندان کی عزت گھر گھر میں اچھلتی کیونکہ نرمین کسی طور زلفی سے شادی نہیں کرنے والی تھی۔

''اماں! وہ کبھی بھی زلفی سے شادی نہیں کرے گی۔'' حریم نے مناسب لفظوں کا چناؤ کیا۔ اماں کے چہرے پر اضطراب سا پھیلا۔

''ابا نے اسے بہت لاڈ پیار اور اعتماد دیا ہے اماں! اڑنے کو پر دے ہیں مگر اڑان بھرنے کو پورا آسمان نہیں دے رہے۔ دنیا زلفی پر ختم نہیں ہوجاتی اماں! اسے اس کے معیار کی زندگی گزارنے کا حق ہے۔''

''زلفی میں کیا خرابی ہے؟ گھر کا بچہ ہے۔ پھپھی کے گھر جائے گی تو ہمارا بھی دل مطمئن رہے گا۔''

''اور اس کے دل کی خوشی کہاں ہے اماں؟'' حریم کو دکھ ہوا۔

''بچوں میں اتنی عقل نہیں ہوتی کہ پوری زندگی کے فیصلے کرسکیں۔'' اماں نے مضطراب انداز میں اپنا ہاتھ اس کی نرم گرفت سے کھینچا۔ ''اس کے ابا نے بھری برادری میں زبان دی ہوئی ہے بہن کو۔''

''پہلے زبان دے دی۔ اب بیٹی دے دیں گے..... پھر اس بیٹی کو پڑھا لکھا کر عقل کیوں دی اماں! کہ وہ اپنے لیے غلط صحیح سوچ سکے؟'' حریم نے احتجاج کیا۔

''پڑھایا لکھایا اس لیے تھا کہ ایک دن اٹھ کر ماں باپ کے سامنے آ کھڑی ہو؟'' اماں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''اماں! اس میں نیا کیا ہے؟ جب بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک اپنی ہر بات منوانے کے لیے بچے والدین کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ ضد کرتے ہیں تو شادی جیسے معاملے میں کیوں نہیں بات کرسکتے؟'' اس کی بات نے اماں کو کئی لمحوں تک چپ کروادیا۔

''زلفی اور نرمین میں بہت فرق ہے اماں! ان کی سوچ بالکل نہیں ملتی۔ اور نہ ہی پھپھو کے گھر کا ماحول ہمارے ماحول جیسا ہے۔''

''لڑکیاں ہمیشہ سے نئے ہی ماحول میں جاتی ہیں اور اسی میں ڈھل جایا کرتی ہیں۔''

''مگر وہ صاف طور پر کہہ رہی ہے کہ اسے ان کا ماحول پسند نہیں بلکہ زلفی کہیں سے بھی اس کے جوڑ کا نہیں اماں! نرمین پڑھی لکھی ہے۔ اتنی اچھی جاب کر رہی ہے۔ خودمختار ہے۔''

''خودمختاری کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ماں باپ کے فیصلوں کو غلط کہے گی؟'' اماں نے تیز لہجے میں کہا تو وہ خائف ہوئی۔

''اماں! اس نے پوری زندگی گزارنی ہے وہاں..... ایک ان چاہے ماحول اور ناپسندیدہ بندے کے ساتھ پوری عمر کیسے گزار سکتی ہے وہ۔''

''کسے پسند کرتی ہے وہ؟''

اماں نے اس قدر اچانک اور سرد مہری سے پوچھا کہ حریم کے حواس ٹھٹھر گئے۔ اماں اسے تیز نظروں سے

دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

صبح ہی سے آسمان سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا دوپہر تک کن من بوندیں گریں اور ساتھ ہی تیز بارش شروع ہوگئی۔ حریم کے دل پہ چھائی پژمردگی اور حبس جیسے ختم ہونے لگا۔ گرمی ہوا سردی۔ بارش کی وہ دیوانی تھی۔ نزہت اپنے کمرے میں بند تھیں، وہ کتنی ہی دیر پردے ہٹائے کھڑکی کے بند شیشے کے اس پار گرتی بارش دیکھتی رہی کمرے میں ہیٹر کی گرمائش تھی جبکہ باہر بارش کے ساتھ بادلوں کی گرج چمک اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ درخت اور پودے دھل کر لان کی سرسبزی میں اضافہ کر رہے تھے۔ صبح کا کیا ہوا ناشتا ہضم ہو چکا تھا۔ بے اختیار ہی حریم کا کچھ کھانے کو دل چاہنے لگا۔

اسے یاد آیا۔ آسمان پر بادل جمع ہوتے دیکھ کر ہی وہ چولہے پر کڑاہی چڑھا لیا کرتی تھی۔ اب بھی موسم کی خوب صورتی دیکھ کر اس کے اندر کی پرانی حریم بیدار ہونے لگی۔ اس نے ایک نظر بیڈ پر کمبل میں پرسکون نیند سوئی میرب کو دیکھا۔ اسے سوئے ابھی آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا اور وہ دو تین گھنٹے سونے والی تھی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے سے نکلی تو سرد ہوا اس کے تپتے رخساروں سے ٹکرائی۔ کمرے کے اندر تو موسم کی ٹھنڈک کا اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اونی مفلر کو اسکارف کی طرح سر اور چہرے کے گرد لپیٹے ہوئے وہ کچن میں چلی آئی، جہاں کل وقتی ملازمائیں ثریا اور نسرین رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مؤدب ہوئیں۔

''چھوٹی بی بی! کچھ چاہیے تھا آپ کو؟''

''ہم..... ہاں..... نہیں۔'' وہ گڑبڑائی۔ عجیب سی جھجک نے اسے گھیر لیا۔ ''کیا پکا رہی ہو؟'' خود کو سنبھالتے ہوئے بات بدلی۔

''رات کے لیے مٹر قیمہ اور ماش کی دال پکے گی۔'' ثریا نے بتایا پھر اسے دھیان آیا۔

''آپ نے تو صبح کا ناشتا کیا ہوا ہے۔ دوپہر کے لیے کوفتے بنے تھے، روٹی ڈال دوں آپ کے لیے۔'' ثریا مستعد ہوئی۔

''نہیں..... تم اپنا کام کرو۔'' وہ اتنی زیادہ فرماں برداری سے گھبرا سی گئی۔

''بھوک لگی ہوگی آپ کو بی بی!'' ثریا نے ہمدردی سے کہا۔

بڑی بی بی تو دوپہر کا کھانا کھا کر اب آرام کر رہی تھیں، انہوں نے حریم کو کھانے پر بلانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ گھر کے ملازمین سے تو ایسی باتیں چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی تھیں۔ چند لمحے وہ یونہی کھڑی انہیں مٹر چھیلتے دیکھتی رہی۔ پھر گہری سانس بھر کر ثریا کو مخاطب کیا۔

''بیسن وغیرہ ہوگا گھر میں؟'' ثریا نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرائی۔

''پکوڑے بنانے ہیں تو میں بنا دیتی ہوں۔''

''نہیں..... تم اپنا کام کرو اور مجھے بس بیسن اور آلو پیاز نکال دو۔'' اب کی بار وہ بھی نرمی سے مسکرائی تھی۔

ثریا نے مزید اصرار کیے بنا بیسن کا پیکٹ نکالا اور پیالے میں اسے بیسن چھان کر دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ باقی میں خود کر لیتی ہوں۔'' اسے آلو پیاز چھیلنے پر آمادہ دیکھ کر حریم نے اسے ٹوک دیا تو وہ متفکر ہوئی۔

''کہیں بڑی بی بی غصہ نہ کریں..... کچن کے سب کام ہمارے ذمہ ہیں۔''

''مگر میں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں ثریا! تم فکر مت کرو۔''

ثریا نے کڑاہی میں تیل ڈال کر برنر جلا دیا اور کچن میں موجود چھوٹی ڈائننگ کی کرسی پر بیٹھ کر نسرین کے

ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوگئی تو حریم نے جلدی سے آلو پیاز چھیل کاٹ کر بیسن میں ڈالے اور پکوڑوں کا آمیزہ بنانے لگی۔ نسرین نے املی کی چٹنی کی بوتل نکال کر رکھی اور پودینے کی فریز کی ہوئی چٹنی کی ٹکڑیاں نکال کر انہیں دہی میں ڈال دیا اس کے پکوڑے تلنے تک چٹنی بھی تیار ہو جانے والی تھی۔ حریم کا دل بے حد ہلکا پھلکا اور مسرور سا تھا۔ ذرا دیر میں کچن تو کیا پورا گھر پکوڑے تلے جانے کی خوشبو سے بھر گیا۔ اس نے پکوڑوں کے بچ جانے والے بیسن میں پیاز گول گول کاٹ کر ان کے رنگز الگ کیے اور بیسن میں ڈبو کر تل لیا۔ پلیٹ پر ٹشو پیپر میں پکوڑے نکال کر اس نے چولہا بند کر دیا تھا۔ ایک پلیٹ میں دونوں ملازماؤں کے لیے پکوڑے نکال کر انہیں دیے تو وہ ممنون ہونے لگیں۔

''واہ..... کیا بات ہے..... کیا ڈرامے ہو رہے ہیں یہاں؟''

نزہت کی طنزیہ آواز اچانک ہی ابھری تھی۔ پکوڑوں والی پلیٹ حریم کے ہاتھ میں لرزی۔ انہوں نے ایک ہی نظر میں کام والیوں کے سامنے اور حریم کے ہاتھوں میں پکوڑوں کی پلیٹ دیکھ کر تمام صورت حال بھانپ لی تھی۔

''وہ..... چھوٹی بی بی کا دل چاہ رہا تھا خود پکوڑے بنانے کو۔'' ثریا شرمندہ ہو کر صفائی پیش کرنے لگی۔ اور حریم تو جیسے مارے شرمندگی کے گڑ سی گئی۔ نزہت مزید کچھ کہے بنا اسے تیز نظروں سے دیکھتی چلی گئیں تو وہ چٹنی کی پیالی اور بوتل اٹھا کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔ نزہت راستے میں لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔

''ادھر آؤ۔'' اسے دیکھتے ہی آواز دے لی تو وہ من من بھر ہوتے قدموں کے ساتھ ان کی طرف آ گئی۔ پکوڑوں والی پلیٹ اس کے ہاتھوں میں وزنی ہو گئی۔

''تم اس گھر کی بہو ہو۔ ان چاہی ہی سہی..... اپنی نہیں تو ہماری ہی عزت کا خیال کر لو۔ نوکروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا تم لوگوں میں ہوتا ہوگا۔ ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔'' وہ اس قدر حقارت سے کہہ رہی تھیں کہ حریم کی رنگت زرد پڑنے لگی۔

''وہ وہاں بیٹھی تھیں..... تو میں نے ان کو بھی..... انہوں نے نہیں کہا مجھ سے۔''

''یہی سمجھا رہی ہوں تمہیں کہ اپنا مقام پہچانو۔ کام والیوں کو کیا پتا ''کس کھاتے'' میں لائی گئی ہو یہاں۔'' وہ چبا کر بولیں۔

''مما۔'' خفا خفا سی قدرے تیز آواز آئی تو وہ دونوں ہی چونکیں۔

''تم..... کب آئے، پتا ہی نہیں چلا۔'' بیٹے کو سامنے دیکھ کر نزہت کا انداز بدلا جبکہ حریم تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ سنجیدہ سا ماں کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا تھا؟''

''تمہاری بیگم کو سمجھا رہی تھی۔ پکوڑے بنانے پہنچ گئیں محترمہ کچن میں اور نا صرف خود بنائے بلکہ کام والیوں کو بھی کھلا رہی تھیں۔'' وہ جلے کٹے انداز میں بولیں تو وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔

''تو کیا ہوا مما! نوکر بھی انسان ہی ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر انہیں کھانے میں سے کچھ دے دیا جائے؟''

''کوئی فرق نہیں پڑتا یقیناً۔ ثریا اور نسرین کو میں خود کھانا نکال کے دیتی ہوں چاہے یہاں کھائیں چاہے گھر لے جائیں... لیکن تمہاری بیوی نے تو حد ہی کر دی۔ خود سے پکا پکا کر کھلا رہی ہیں کام والیوں کو..... کام والیوں کو بگڑتے دیر نہیں لگتی بیٹا! وہ ہماری نوکر ہیں۔ ہم ان کے نوکر نہیں ہیں۔ اپنی بیوی سے کہو خاک سے اٹھ آئے اب۔''

وہ آخر میں بے حد نخوت سے بولیں اور اس کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی اٹھ کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے

میں چلی گئیں۔ وہ گہری سانس بھرتا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔ پرسکون سی گرمائش سے بھرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے طائرانہ نظر ڈالی۔ پکوڑوں والی پلیٹ کاؤچ کے سامنے چھوٹی ٹیبل پر رکھ کر وہ بند کھڑکی کے شیشے کے سامنے کھڑی لان میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ بیگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ایک نظر سکون سے سوئی ہوئی میرب پر ڈالی اور حریم کے پاس آیا۔

''آئم سوری۔'' اس کی معذرت غیر متوقع تھی۔ حریم کے اندر جو سب لاوے کی مانند ابل کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ وہ یک لخت ٹھنڈا پڑ گیا۔

''تم نے جو بھی کیا، بالکل ٹھیک کیا ہے۔ لیکن مما کا اپنا الگ مزاج ہے۔ ایک سیٹ اپ ہے گھر چلانے کا لیکن آہستہ آہستہ وہ تمہاری عادی ہو جائیں گی۔''

وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ حریم کا وہ لاوا تو ٹھنڈا پڑ گیا مگر اسے اب اس بات پر غصہ آنے لگا کہ اس نے آتے ہی معذرت کر کے حریم کو دل کا غبار نکالنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں کسی کو اپنا عادی کرنے کی۔ میں کون سا یہاں ساری عمر رہنے والی ہوں۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''تم یہاں ساری عمر کے لیے ہی آئی ہو حریم! کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔'' اس کا لہجہ ایک دم ہی خشک ہوا تھا۔ ''یہ بچی اس کی پرورش اس کی دیکھ بھال سب تمہاری ذمہ داری ہے۔''

''تم میرے گھر والوں کی میرے متعلق غلط فہمیاں دور کر دو۔ میں ایک دن بھی یہاں نہ رہوں۔'' سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے وہ تلخی سے بولی۔ چند لمحوں تک وہ اسے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے اس کی سرکشی بھانپتا رہا۔ پھر اطمینان سے بولا۔

''ویری گڈ..... بہت اچھا کیا وقت پر دل کی بات بتا کر۔ اب مجھے تمہارے لیے۔'' وہ پلٹا اپنی جیکٹ اتار کر ہینگ کر کے وارڈ روب میں لٹکائی اور کاؤچ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ حریم گردن موڑے اسے دیکھ کر اس کی کہی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پیروں میں سلیپر پہنتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' حریم کے ذہن میں دفعتاً خطرے کی گھنٹی بجی۔

''تم پکوڑے کھاؤ..... موسم انجوائے کرو۔'' سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ فریش ہونے واش روم میں گھس گیا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو وہ مضطرب سی کمرے میں ٹہل رہی تھی، اسے دیکھ کر تھم گئی۔

''تمہاری بات کا کیا مطلب تھا؟'' حریم نے بات وہیں سے شروع کی۔

''دیکھو حریم! ایک بات لکھ کے رکھ لو۔ اس قدر برے حالات میں تم سے شادی کر کے لایا ہوں تو اب ہمیشہ کے لیے تم یہیں رہو گی اور اگر تم سمجھتی ہو کہ جب میں تمہارے پیپرز کے ساتھ تمہارا بیگ اپ (راضی نامہ) کروا دوں گا تو تم مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنے راستے چل دو گی تو یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔'' وہ خطرناک حد تک صاف گو تھا۔ حریم کو اس روز اندازہ ہوا یا پیسے والے سب ہی صاف گو ہوا کرتے ہیں۔

حریم کو اس روز سیٹھی لیدرز کے آفس میں کھڑا شخص یاد آیا۔ کتنے آرام سے اس نے اپنی گراوٹ اور ہر بے شرمی کا اعتراف کر لیا تھا حریم کے سامنے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید آنکھوں دیکھی کو بھی جھوٹ بول کر غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔

حریم نے اسے کاؤچ پر بیٹھ کر چٹنی میں ڈبو کر پکوڑا کھاتے دیکھا۔ اس شخص نے اس کی ساری زندگی تلپٹ کر دی تھی۔ آندھی و طوفان بن کر آیا وہ اس کی زندگی میں اور تلپٹ کر گیا تھا سب کچھ۔

''ہمم..... بہت اچھے بنے ہیں۔ کھا لو۔ کیوں ٹھنڈے کر رہی ہو؟'' وہ کہہ رہا تھا۔ حریم کا دل ہر شے سے

اچاٹ ہونے لگا۔

"میرا دل بھر گیا ہے تم لوگوں کی باتوں سے ہی۔" وہ اس کی بات کی تہہ تک فوراً پہنچا۔

"ہر گھر کے اپنے اصول ہوتے ہیں حریم! یہ گھر مما کا ہے وہی یہاں کی "رولز میکر" ہیں سوان کے رولز ماننا تو پڑے گا۔ تم بے فکر رہو، یہاں جو کچھ پکتا ہے۔ اس میں سے کافی کچھ ملازمین کو بھی جاتا ہے لیکن جس کام سے مما منع کریں۔ وہ مت کرنا۔ اس سے تم بھی پرسکون رہو گی اور وہ بھی۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"میں یہاں کسی کو خوش یا پرسکون کرنے نہیں آئی ہوں، میری زندگی تباہ ہوئی ہے تو میں بھی سب کو برباد کردوں گی۔" حریم چیخی۔ تو وہ بھنوؤں کو استفہامیہ جنبش دیتے ہوئے جیسے اس کی بے وقوفی پر بے ساختہ مسکرا دیا۔

"تم حق پر ہو...... کرسکتی ہو کسی کو بھی برباد۔ لیکن میرو کو ایک سوئی برابر بھی تکلیف پہنچی تو تمہیں مجھ سے کوئی بچا نہیں پائے گا۔" وہ اس قدر آرام سے بولا کہ حریم کا دل دہل گیا۔

"تم مائرہ سے شادی کر لیتے.. وہ پال سکتی تھی میرب کو.... تم نے میری زندگی کیوں برباد کی ... ان فیکٹ (درحقیقت) میری ساری نیکی کی۔"

حریم تھک کر بستر کے کنارے ٹک گئی۔ جب سے اماں اور طوبیٰ سے مل کر آئی تھی۔ ابا کی یاد دل میں زور پکڑنے لگی تھی۔ وہ ماں باپ کی حساس اور خیال کرنے والی بیٹی تھی۔ اس کے لیے یوں ان سے کٹ کر رہنا بلکہ ایک الزام کے ساتھ کٹ کر رہنا اخلاقی موت تھا۔

"میں بہتر سمجھتا ہوں جو میں نے کیا ہے اور میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔" وہ ٹشو پیپر کھینچ کر ہاتھ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ حریم بھی بے اختیار اٹھی تھی۔

"مجھ سے پوچھو۔ تم کتنے غلط اور قابل نفرت ہو۔"

"نفرت کا ہی سہی مگر کوئی رشتہ تو ہے نا ہمارے بیچ.. اتنا ہی کافی ہے... پکوڑے کھاؤ تا کہ تمہاری حس لطیف جاگے۔ میں ثریا کے ہاتھ چائے بھجواتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔ حریم نے پسلیوں پر ہاتھ جما کر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا جیسے کوئی چیز اٹھا کے زمین پہ دے مارنے کا سوچ رہی ہو۔

☆☆☆

رکشے میں بیٹھ کر بھی وہ تمام راستے چادر میں منہ چھپائے روتی رہی اور اپنے گھر جانے کے بجائے تجل کے گھر کے پاس اتری۔ وہ ایسا چہرہ لے کر گھر جانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی جس سے حریم سمجھتی کہ وہ سب کچھ لٹا آئی ہے۔ تجل بھی آفس سے ابھی گھر پہنچی تھی۔ اس کی امی کو سلام کر کے سر جھکائے وہ سیدھی تجل کے کمرے میں آ گئی۔

"خیریت تو ہے نا؟" اس کی خاموشی سے گھبرا کر تجل نے اسے بے اختیار جھنجھوڑ ڈالا۔ نزمین کی چادر ڈھلک کر شانوں پر آ گری۔ رونے سے سوجی آنکھیں اور لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر تجل دنگ رہ گئی۔

"مینو! کیا ہوا؟"

"تجل......" وہ اس کے سامنے بکھر سی گئی۔ تجل کا دل کسی نے مٹھی میں کر لیا۔

"عباد سے ملنے گئی تھیں نا تم؟" اس نے متوحش ہو کر پوچھا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نزمین کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

"رکو مت...... پوری بات کرو نزمین! کیا ہوا ہے؟" تجل کے ذہن میں کئی خدشات دوڑ گئے۔ نزمین کے لب کچھ کہنے کی کوشش میں لرزے مگر وہ پھپھک کر رو دی۔ تجل اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیتے خشک حلق کو تر کر رہی تھی اور تجل متفکر سی اس کے پاس بیٹھی اس

کے سنبھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل اوہام کا شکار تھا۔

نرمین نے روتے ہوئے اسے ساری بات کہہ سنائی تو سجل کو اسے چپ کروانا بھی یاد نہ رہا۔

عباد نے اسے لوٹنے کی خاطر اس کی سب سے بڑی کمزوری کو نشانہ بنایا تھا۔ لیکن چمک دمک پر مرمٹنے والی ہر لڑکی اس وار سے ڈھے نہیں جایا کرتی۔ کچھ نیک ماں کے دودھ کے اثر اور باپ کے اٹھے ہوئے سر کی لاج رکھ بھی لیا کرتی ہیں۔ نرمین کا ان سب آسائشات کے لیے لالچی ہونا الگ بات تھی مگر ''ایسی قیمت'' اس نے خواب میں بھی نہ سوچی تھی۔ وہ عباد سے دوستی کے بعد اس سے شادی کر کے یہ سب آسائشات حاصل کر لینا چاہتی تھی مگر شادی سے پہلے ایسے تعلقات؟ یہاں تو زمین و آسمان ہی الٹ پلٹ گئے تھے۔ عباد اس کے قریب آیا تو بے اختیار اور بلا ارادہ ہی نرمین نے اس کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔

''تھوکتی ہوں میں تمہاری ان لگژریز پر عباد! عزت کے بدلے بادشاہت بھی ملے تو میں نہ لوں۔ تم نے مجھے مس جج (غلط سمجھا) کیا ہے۔''

نرمین کا تو دل ہی مر گیا تھا۔ وہ روتی ہوئی عباد کے فلیٹ سے نکلی۔ اسے خوف تھا کہ وہ اسے زبردستی روکنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ ادپن کچن کے کاونٹر سے ٹیک لگائے خاموشی سے اسے روتے ہوئے جاتا دیکھتا رہا۔ شاید وہ اس طرح کے تعلقات میں ''باہمی رضامندی'' کا قائل تھا یا شاید اس کے پاس ''ویسی'' لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔

''اوہ میرے اللہ! اس قدر گراوٹ؟'' سجل سب سن کر ششدر رہ گئی۔

''میں تو کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ سجل! اس نے آج تک اتنی ساری ملاقاتوں میں کبھی بھی مجھ سے اشارتاً بھی کوئی گھٹیا بات نہیں کی تھی۔'' نرمین کی حالت اس لٹے پٹے شخص کی سی تھی جس کی ساری دولت کے ساتھ اس کی ہر آس اور امید بھی لٹ چکی ہو۔

''میں رانا سے بات کروں گی۔'' سجل نے غصے سے کہا۔

''نن..... نہیں..... کسی سے کچھ مت کہنا، بات پھیل جائے گی۔''

نرمین کے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔ کیا ہی آسمان ٹوٹ پڑا تھا آج اس پر۔ دوپہر تک وہ کتنی خوش تھی۔ آج وہ عباد سے شادی کی بات کر لیتی اور بس..... خوشیاں اس کی دسترس اور ستارے مٹھیوں میں تھے..... مگر اب پتا چلا کہ وہ اس کی دسترس میں کبھی تھا ہی نہیں اور مٹھیوں کے ستارے..... انگارے تھے..... جن کی ایک چنگاری نے ہی آج اسے پور پور جلا ڈالا تھا۔

''اسے بھی تو پتا چلے، اس کا دوست کتنا گھٹیا ہے۔'' سجل کو مزید طیش آیا۔

''اسے پہلے سے پتا ہوگا..... وہ جگری دوست ہے اس کا۔'' نرمین نے دکھ سے کہا۔

(اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ اسے کہو، یہیں سے اپنے قدم واپس موڑ لے۔ عباد سیٹھی تک جانے والا راستہ بہت پرخار ہے۔ اس نے ''کچھ اور'' ہی معیار بنا رکھا ہے اپنا)۔

سجل کو رانا سعید کی تنبیہہ یاد آئی مگر تب اس نے اس کی باتوں کو درخور اعتنا نہ جانا تھا۔ وہ سختی سے لب بھینچ کر رہ گئی۔ یقیناً وہ اپنے دوست کی عادات و خصائل سے واقف تھا۔ نرمین ٹھیک کہہ رہی تھی۔

''اچھا..... اب تم چپ کرو۔ پرسکون کرو اپنے آپ کو۔ ایسی شکل لے کر گھر جاؤ گی تو سب سو سوال پوچھیں گے۔'' سجل نے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے تسلی دی۔

''وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے سجل! میں نے سچ میں اس سے محبت کی ہے۔ اور اس نے میرے لیے اتنا گرا ہوا سوچا۔'' وہ مچلی۔

''شکر کرو زمین کہ اللہ نے بچالیا ہے تمہیں۔ اس میں کوئی بہتری ہوگی تمہارے لیے۔''

''میرے سارے خواب..... آج ٹوٹ گئے بجل!'' وہ کہتے ہوئے بے اختیار اونچی آواز میں رونے لگی تو لب بھینچتے ہوئے بجل نے اسے شانے سے لگالیا۔

قسم ہے زمانے کی..... انسان خسارے میں ہے.....

ایسے ہی نہیں کہا گیا.... پس ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں اللہ کے فیصلوں پر صبر و شکر کرنا نہیں آتا۔ زمین بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے ابھی تک عباد کی اصلیت کھلنے کے دکھ میں تھی..... یہ سمجھے بنا کہ کسی دھوکا دہی کے مرتکب شخص کی اصلیت آپ پر کھلنا اللہ کے مہربان ہونے کی نشانی ہے۔

مگر کوئی ہے جو سوچے سمجھے؟

☆☆☆

اماں اپنا سوال پوچھ کر اس کے جواب کی منتظر تھیں اور حریم کی تو جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اسی وقت ڈور بیل بجی تو حریم کے وجود میں بجلی سی دوڑ اٹھی۔

''زمین آگئی ہے اماں! آپ کے باقی ہر سوال کا جواب وہ خود دے گی۔'' بعجلت کہہ کر وہ جوتی میں پاؤں اڑستی کمرے سے نکل گئی تھی۔ اماں ساکت بیٹھی رہ گئیں..... یعنی بات واقعی کچھ تھی..... یا اللہ خیر..... ان کا دل لرزا۔

زمین بہت سست سی اندر داخل ہوئی مگر اندر اماں نے جو موضوع چھیڑ رکھا تھا اس کے زیر اثر آئی حریم نے اس کے روئے روئے چہرے پر اتنا غور نہیں کیا تھا اس کے سلام کا جواب دیتی اسے کھینچ کر صحن کے ایک کونے تک لے گئی۔

''اماں نے اندر بات چھیڑ رکھی ہے تمہارے اور زلفی کے رشتے کو لے کر۔ موقع اچھا ہے، دل کی بات بتادو زمین! میں نے تو اپنی پوری کوشش کی ہے اماں کی سوچ بدلنے کی۔ آگے کی منزل اب تمہیں خود طے کرنی ہوگی۔''

حریم نے کم ترین الفاظ میں اسے ممکنہ صورت حال سے آگاہ کیا تھا وہ کوئی جواب دیے بنا خاموشی سے اندر چلی گئی۔ حریم اس کی خامشی پر پہلی بار ٹھٹکی۔ پھر تیز قدموں سے اس کے پیچھے چلتی کمرے میں آئی۔ وہ اماں کو سلام کر کے چادر اتار کر تہ کر رہی تھی۔ تب حریم نے اس کا غیر معمولی سرخ چہرہ اور آنکھیں دیکھیں۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ چہرہ اور آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔'' اماں نے بھی بغور اسے دیکھا تو وہ خود کو سنبھالتے ہوئے کھنکھاری۔

''صبح سے سر میں درد تھا... اب تھوڑا بخار بھی محسوس ہو رہا ہے۔''

''کھانا کھالو پھر چائے کے ساتھ دوا لے لینا۔'' حریم متفکر ہوئی۔

''کھانے کا بالکل بھی موڈ نہیں۔ چائے پی لوں گی ٹھہر کر۔''

''خالی پیٹ تو دوا نہیں کھا سکتیں ناں۔ رسک یا بسکٹ لے لینا چائے کے ساتھ۔'' اماں نے ٹوکا تو وہ خاموش رہی۔

''اماں تمہاری رضامندی پوچھ رہی ہیں زلفی کے رشتے کے متعلق۔ میں نے کہا کہ زمین خود بہتر طریقے سے جواب دے سکتی ہے اس سوال کا۔'' حریم نے ان دونوں کو خاموش دیکھ کر بات پھر سے آئندہ پر ٹلتے دیکھی تو جان بوجھ کر وہیں سے سلسلہ جوڑا جہاں پر زمین کی آمد کے ساتھ ٹوٹا تھا۔ اماں نے گھور کر اسے دیکھا مگر وہ ڈھٹائی کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے نظریں ملائے بنا اب منتظر نظروں سے زمین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو کھرچ رہی تھی۔

"تمہارے باپ نے تمہیں اس دن کے لیے نہیں پڑھایا لکھایا کہ تم اس کے فیصلوں کے آگے اعتراض بن کر کھڑی ہو جاؤ۔ جو بڑے اپنے تجربوں کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں، چھوٹوں کو وہ ظاہری بینائی سے دکھائی نہیں دیتا۔"

اماں کو اندر سے اچھی خاصی تاب چڑھ رہی تھی مگر وہ جانتی تھیں کہ یہ معاملہ بڑی احتیاط سے ہینڈل کرنے والا ہے خصوصاً جب اس کا براہ راست تعلق زرمین کی ذات سے تھا۔

"اماں! یعنی کہ تعلیم ہمیں ذہن کھولنے کی اجازت تو دیتی ہے لیکن زبان کھولنے کی نہیں؟" حریم کی ناراضی میں زبان پھسل گئی۔

"تم بیچ میں بکواس مت کرو۔" اماں نے اسے جھڑکا تو وہ ان کے شانوں کے گرد بازو لپیٹتی ان سے چمٹ گئی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اماں!" کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے زرمین نے کہا تو حریم گویا حیرت سے مرجانے کے قریب ہوگئی۔

"کک...... کیا...... کس پر اعتراض نہیں ہے تمہیں؟ پہلے بات تو سن لو اماں کی۔"

وہ ہکلائی۔ ابھی تو باہر اس بے وقوف کو سارا معاملہ سمجھایا تھا اور اندر آکر بنا سوچے سمجھے بولے چلی جارہی تھی۔

"زلفی اور تمہارے رشتے کی بات کررہی ہوں میں۔ دو ماہ بعد کی تاریخ دے رہی ہوں میں نصرت کو۔"

اماں کا چہرہ کھل اٹھا زرمین کی اتنی سی بات سے۔ جبکہ حریم بے تابی سے زرمین کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ابھی پھٹی کہ پھٹی۔ لیکن اس طرف تو رویا رویا خس انداز تھا جیسے پرواہ ہی نہ ہو کہ اس کی زندگی کا کیا ہونے جارہا ہے۔

"جو آپ کی مرضی ہو کریں۔" زرمین کی آواز رندھ گئی تو اماں نے بے اختیار خوشی اور مسرت میں گھرتے گھرے مان کے ساتھ آگے بڑھ کر زرمین کو خود سے لپٹا لیا۔

"میری شہزادی دھی! اللہ نصیب بلند کرے۔ مجھے پتا تھا، اپنے باپ کا سر نیچا نہیں ہونے دے گی۔" زرمین کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ کر اماں کی چادر میں جذب ہونے لگے۔ حریم ساکت و جامد تھی۔ اس کا وجدان اسے کسی انہونی کے ہوجانے کی خبر دے رہا تھا، تب ہی اس کا دل گہری کھائی میں ڈوبتا جارہا تھا۔

اتنے ہارے ہوئے تو محبت میں "لٹ پٹ جانے والے" ہوا کرتے ہیں۔ (تو کیا وہ بھی سب کچھ ہار کر، لٹا کر آرہی تھی؟) حریم پر اس لمحے اندر ہی اندر قیامت ٹوٹنے لگی۔ وہ ایک ٹک زرمین کو اماں کے شانے سے لگے آنسو بہاتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ڈینئل کی منگنی کی تقریب میں کیتھی نے بھی اپنے قریبی دوستوں میں سے زیڈ کو بطور خاص انوائٹ کیا جسے دیکھ کر مارک کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ ساری تقریب میں وہ زیڈ اور کیتھی کو خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہا تھا۔

"اتنی پرائیویٹ تقریب میں اس کا کیا کام تھا؟" تقریب ختم ہونے کے بعد جب مہمان چلے گئے اور صرف گھر والے ہی رہ گئے۔ مارک موقع پا کر کچن میں چلا آیا جب کیتھی سب کے لیے مزید ڈرنکس لینے کچن میں آئی تھی۔

"اس وقت میرے ساتھ بکواس مت کرنا مارک! میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔" کیتھی نے اونچی آواز میں کہتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔

''اوہو..... تو گویا یہ اشارہ ہے کہ مجھے بھی اچھے موڈ میں آجانا چاہیے؟'' دفعتاً لب ولہجہ بدلتے ہوئے وہ مسکرایا اور کیتھی کے انتہائی قریب چلا آیا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' کیتھی بھڑکی مگر اسی اثنا میں مارک اس کی کمر میں بازو حمائل کر چکا تھا۔

''بی ہیو یو.....'' کیتھی نے بدک کر اسے دھکیلا مگر وہ ڈھیٹ بنا اس کی طرف جھکا۔ اسی وقت کسی نے اس کی شرٹ کا کالر پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا۔

''جب کوئی لڑکی کہے نہیں۔'' تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ''نہیں۔''

زیڈ نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ تو مارک جو پہلے ہی اس کی وہاں موجودگی پر تلملا رہا تھا۔ اس نے زیڈ کے منہ پر مکا دے مارا جسے وہ پھرتی سے ایک طرف ہو کر ناکام بنا گیا لیکن جواباً مارک اس کی ناک پر پڑنے والے گھونسے سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ شور وغل سن کر سب کچن کی طرف بھاگے۔

''او گاڈ۔'' ڈینیل اور پال نے مارک کی ناک سے خون کے ٹپکتے قطرے دیکھے تو دونوں اس کی طرف لپکے۔ کیتھی نے گھبرا کر زیڈ کا ہاتھ تھام کر اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' پال نے غصے سے کیتھی کی طرف دیکھا۔

''یہ سب اس سور کی کارستانی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' مارک زیڈ پر لپک رہا تھا۔ ڈینیل اور پال بے یقینی سے کیتھی اور زیڈ کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ میرے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا۔'' کیتھی نے جلدی سے زیڈ کی طرف داری کرتے ہوئے مارک کو کینہ توز نظروں سے دیکھا۔

''میرے خیال میں یہ ہمارا فیملی میٹر ہے، تمہیں اب جانا چاہیے۔'' ڈورس نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشارتاً زیڈ کو نکلنے کا عندیہ دیا تو وہ سر جھٹکتا وہاں سے نکل گیا۔

''زیڈ۔'' کیتھی ماں کو خفگی سے دیکھتی اس کے پیچھے لپکی تو پال نے اونچی آواز میں اسے پکارا مگر وہ سب کچھ نظر انداز کیے دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی جہاں وہ تیزی سے نیچے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

''زیڈ..... پلیز..... رکو۔'' کیتھی اونچی ہیل پہنے ہوئے تھی، تیزی سے اترنے کی کوشش میں ہیل کی ٹک ٹک پوری عمارت میں گونج رہی تھی۔

''آرام سے آؤ۔ میں یہیں کھڑا ہوں کیتھ! گر مت جانا۔'' وہ نہ رکتا لیکن کیتھی کے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے گر جانے کے خوف سے وہ مجبوراً رک گیا۔ اس تک پہنچ کر کیتھی بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

''آئی لو یو زیڈ..... آئی رئیلی لو یو..... حالات چاہے کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔'' کیتھی نے چہرہ اوپر کر کے اسے دیکھا۔ اور آج پہلی بار یہ اعتراف کیا۔

''وہ خبیث ہے..... لیکن میرا کزن ہے تو سب اسے اہمیت دیتے ہیں۔''

''میں آج اس کا منہ توڑ دیتا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی تمہیں چھونے کی۔''

وہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ کیتھ کو خوشی ہوئی کہ وہ اس کے لیے پوزیسو اور پروٹیکٹو (محافظ) تھا۔ زیڈ نے اسے نرمی سے خود سے الگ کیا۔

''اب گھر جاؤ..... وہ پتا نہیں کیا بکواس کر رہا ہوگا۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔ تو اس کی آنکھیں بھی مسکرا اٹھیں۔

''لفٹ ٹھیک ہو چکی ہے..... تم لفٹ کے ذریعے جا سکتے ہو۔'' وہ شرارت سے بولی۔ تو وہ لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے مسکرا دیا۔ لفٹ میں داخل ہو کر وہ اس کی طرف پلٹا۔

''لو یو ٹو کیتھ!''

اس کی مسکراتی ہوئی آواز میں لفٹ کا دروازہ بند ہوتے ہوئے کیتھی نے اس کا اعتراف محبت سنا تو وہ سرشار سی ہوگئی۔ پھر کچھ یاد کر کے اس کی خوب صورت پیشانی پر بل پڑے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔

''پوچھو اس سے..... اپنے زخمی منگیتر کو چھوڑ کر یہ اس خبیث شخص کے پیچھے کیوں بھاگی تھی۔'' اسے دیکھتے ہی مارک نے کینہ توز انداز میں کہا۔ کیتھی کو اس کی سوجی ہوئی ناک دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

''میرے دوست کے سامنے تم میری مرضی کے بنا مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرو گے تو وہ تو اپنی دوست کے لیے ری ایکٹ تو کرے گا نا۔'' وہ اطمینان سے بولی لیکن پال قطعاً خوش نہیں تھا۔

''اگر وہ ہمارا مہمان نہ ہوتا تو یہاں سے ہاتھ پاؤں تڑوا کر ہی جاتا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔ کیتھی نے خفگی سے باپ کو دیکھا۔

''اس نے پہلے زیڈ پر حملہ کیا تھا، اس نے تو صرف جوابی پنچ مارا ہے۔''

''آج کے بعد وہ لڑکا اس گھر میں تو کیا مجھے اس بلڈنگ کے آس پاس بھی دکھائی نہیں دینا چاہیے۔'' مارک کو سمجھا بجھا کر بھیجنے کے بعد پال نے قطعی انداز میں اعلان کیا تھا۔

''ڈیڈ..... فار گاڈ سیک..... مارک کی تنگ نظری سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔'' کیتھی جھنجلائی۔

''لیکن تمہارے دوست کی حرکت مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ تمہارا اور مارک کا معاملہ تم دونوں کو آپس میں سلجھانا چاہیے تھا۔'' پال نے غصے سے کہا۔

''او کے ڈیڈ! میں سمجھا دوں گا کیتھ کو..... ریلیکس۔'' ڈینیل نے آنکھ کے خفیف سے اشارے سے کیتھی کو اندر کمرے میں جانے کو کہا تو وہ خاموشی سے کھسک گئی۔

''گریجویشن مکمل ہوتے ہی ان کی شادی کر دینی چاہیے، اس سے پہلے کہ درمیان میں کوئی غلط فہمیاں آئیں۔'' پال نے اپنا فیصلہ سنایا تو ڈورس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ ڈینیل کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نرمین! یہ کیا گیم کھیل رہی ہو تم..... کل کو ابا تمہیں اپنے لفظوں سے پھرنے نہیں دیں گے۔ اگر یہ مذاق تھا تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب تم بری طرح پھنس چکی ہو اماں ابا کل ہی جا کر پھپھو کو شادی کی تاریخ دے آئیں گے۔'' اماں کے جاتے ہی حریم اس پر چیخی تھی۔

''تو.....؟'' نرمین نے دکھتے سر کو دباتے ہوئے بے تاثر لہجے میں پوچھا تو حریم اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''تو.....؟ تو یہ کہ کیا تم واقعی میں زلفی سے شادی کرو گی؟'' حریم نے بے یقینی سے پوچھا۔ کل تک تو وہ بیانگ دہل زلفی کو گالیاں دیا کرتی تھی۔

''میں نے جو کہنا تھا، اماں سے کہہ دیا ہے حری! اب میرا دماغ مزید مت دکھاؤ۔''

''سب ٹھیک تو ہے نا مینو!؟'' حریم کا دل کسی گہری کھائی میں ڈوبا۔ ''تم تو عباد کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں؟''

''نام مت لو اس کا۔'' نرمین نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔

''کسی کی ناراضی اور ضد میں فیصلہ مت کرو نرمین اکل کو پچھتا کر فیصلہ بدلو گی تب تک دیر ہو چکی ہوگی۔''

حریم کو پکا یقین ہوا کہ عباد سے کسی بات پر لڑنے کے بعد ناراض ہو کر نرمین یہ فیصلہ کر رہی ہے۔

''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ تمہاری بہت مہربانی ہوگی اگر تم یہ بک بک چھوڑ کر چائے کا ایک کپ

بنالاؤ گی۔"

نرمین نے خشک لہجے میں کہا تو حریم ناچاہتے ہوئے بھی وہاں سے ہٹ گئی اور بس..... تنہائی سے کیسی شرم..... نرمین کے کب سے رکے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

وہ کسی کی بھی ضد میں آکر خود کو تباہ و برباد کر دینے کی حد تک فیصلے کرنے والی خصلت رکھتی تھی۔ محبت اور نفرت میں شدت پسند..... فوری فیصلے کرنے والی عجلت پسند۔

"مر جاؤ تم اللہ کرے عباد وسیم! تم نے میرے سارے خواب توڑ ڈالے جس کا تم کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔"

تکیے میں منہ چھپا کر وہ بے آواز بلک اٹھی۔

☆☆☆

زلفی پر تو شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ نرمین شادی کے لیے مان گئی ہے۔ نرمین کی اکڑ غرور اور تنتاز زلفی کو یقین دلاتا تھا کہ وہ کسی طور اس رشتے پر راضی ہونے والی نہیں تھی لیکن آج اچانک ماموں، مامی کا مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ آنا اور دو ماہ بعد کی شادی کی تاریخ دے کر جانا اسے بے یقینی بھری خوشی کا شکار کر گیا تھا۔

"اب آئے گی قابو میں..... سا....." وہ زیر لب گالی بکتے ہوئے سرشار بھی تھا۔ نرمین جیسی پڑھی لکھی طرح دار اور مکھن ملائی جیسی لڑکی کا یوں بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجانا اس جیسے ویلے نکمے کے لیے کروڑوں کی لاٹری نکلنے کے برابر تھا۔

"اب اپنے انداز ٹھیک کر لے پوستی! وقت پہ اٹھ کر اسٹور پر جایا کر۔" نصرت نے اپنی خوشی دباتے ہوئے اسے لتاڑا تو وہ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے ہنسا۔

"ارے اماں! اب ہی تو عیش کے دن آرہے ہیں۔"

"بکواس مت کر..... خود گھر بیٹھ کر بیوی کی کمائی کھائے گا کمبخت۔" نصرت نے اسے گھرکا۔

"میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں اماں! مل کر گاڑی چلے گی تو ہی گھر چلے گا۔" وہ مطمئن تھا۔

"اب پتا نہیں بھائی صاحب موٹر سائیکل کا سوچتے ہیں جہیز میں یا نہیں..... بھئی ہمیں تو لالچ ہے نہیں، ان ہی کی بیٹی کو آنے جانے میں آسانی ہوگی۔"

"دیں گے کیوں نہیں..... اتنے سالوں سے میری بیوی کما رہی ہے، جمع تو کرتے ہی رہے ہوں گے۔"

وہ ایسے ٹھسکے سے بولا جیسے واقعی نرمین اس کی بیوی ہو۔ جبکہ نصرت کو خوب صورت بہو کے ساتھ گھر بھر کے جہیز کی آس بھی لگ گئی تھی۔ زلفی کے ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ نے گھیراؤ کیا ہوا تھا۔

"اب اس الو کے پٹھے سے، کہو سنجیدہ ہو جائے۔ کام کاج سنبھالے تاکہ نکھٹو بن کر بیوی کی کمائی پر نہ پڑا رہے۔" پھپھا کو بیٹے کے کرتوت بالکل بھی پسند نہ تھے۔

"بھئی۔ ان دونوں کا آپسی معاملہ ہے اور دنیا کا دستور ہے میاں! بیویاں اپنے شوہر کی کمائی کھاتی آئی ہیں کیا حرج ہو جائے گا جو ہمارے زلفی نے چار پیسے اپنی بیوی سے لے لیے۔ حق بنتا ہے اس کا۔" نصرت نے مدبرانہ انداز میں کہا تو وہ کینہ توز نظروں سے بیوی کو دیکھنے لگے۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، یہ بے حیا کس پہ گیا ہے..... پھر میں تجھے دیکھ لیتا ہوں۔" پھپھا نے دانت پیسے تو وہ ٹھٹھا لگا کر ہنسیں۔

"بڑے مذاقیہ ہو آپ بھی۔" پھپھا بکتے جھکتے گھر سے نکلے تھے۔

''ہونہہ..... بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔'' وہ میاں کے جانے کے بعد ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ ''جب بہو رانی آ کر گھر کا آدھا خرچا اٹھالے گی تو سب سے پہلے یہی سکون میں آئیں گے اور مجھے شاباش دیں گے۔''

☆☆☆

شادی کی تاریخ رکھتے ہی گھر میں شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اماں نے نرمین کے لیے رکھی ساری چیزیں اٹھا کر حریم کے لیے رکھ دیں۔

''میری شہزادی کی ہر چیز اس کی پسند کی ہوگی۔'' انہوں نے نرمین کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دل مر چکا تھا، خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔ ایک حریم ہی تھی جو نرمین کی خاموشی سے ہولتی رہتی تھی۔ اور پھر نرمین نے جاب سے استعفیٰ دے دیا لیکن چونکہ وہ جاب چھوڑنے سے دو ماہ پہلے کمپنی کو انفارم کرنے کی پابند تھی، اس لیے اسے شادی تک آفس جانا ہی تھا۔ شاپنگ کے لیے وہ ایک دن بھی بازار نہیں گئی تھی۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟'' ایک دن تنگ آ کر حریم نے اسے پکڑ ہی لیا تھا۔

''اب کیا ہے؟'' وہ بے زار تھی۔

''کیوں اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہو۔ مجھے خوف آ رہا ہے تمہاری اس بے حسی سے۔'' حریم بے چارگی سے بولی۔

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' وہ اسی طرح خفا تھی۔

''کیا تم دل سے راضی ہو زلفی کے لیے؟'' حریم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اگر وہ اس کا اور عباد کا معاملہ نہ جانتی ہوتی تو شاید اماں کی طرح بے فکر ہو کر نرمین کی شادی کی شاپنگ کرتی ہوتی لیکن عباد جیسے ہر لحاظ سے نرمین کے آئیڈیل بندے کو چھوڑ کر زلفی کے ساتھ شادی کے لیے ہامی بھرنا حریم کو آنے والے کسی خاموش طوفان کی نشان دہی لگ رہا تھا۔

''خودکشی ہی کرنی ہے نا..... زلفی ہی سہی۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولی تو حریم کا دل تھم سا گیا۔ رکی سانس کھینچتے ہوئے اس نے نرمین کو دیکھا۔

''عباد کا کیا بنا؟''

''مر گیا ہے وہ۔'' نرمین نے ضبط سے کہا اور اسے دیکھا۔ تب حریم نے اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھے۔

''بہت برا جھگڑا ہوا ہے کیا؟'' حریم کا دل پگھلا۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا اس کے بارے میں۔'' نرمین نے آنسو پیتے ہوئے کہا تو آواز گلے میں اٹکنے لگی۔ حریم کا دل گویا اچھل کر حلق تک آیا۔

''اب آگے کچھ مت پوچھنا حری! میں خود کو بہت مشکل سے اس زندگی کی طرف لائی ہوں۔ اب میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتی۔'' حریم نے تھوک نگل کر سوکھتا حلق تر کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نرمین نے کروٹ بدلتے ہوئے تکیے میں منہ چھپا لیا۔

''جاتے ہوئے لائٹ آف کر دینا۔'' حریم ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے لائٹ آف کر کے کمرے سے نکل گئی۔ اسے نرمین سے ہمدردی سہی مگر وہ خوش تھی کہ زلفی کا کردار عباد جیسا نہیں تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی نرمین کے سارے دکھ جاگنے لگے اور آنکھوں کی زمین نم ہونے لگی۔ اس دل میں عباد نامی تیر گڑ چکا تھا نہ موت آتی تھی اور نہ ہی زندگی مل رہی تھی۔

''مینو اندر سے خوش تو ہے نا؟'' اماں بھی حریم کی طرح وسوسوں کا شکار تھیں حریم نے گومگو کی کیفیت میں

جواب دیا۔
''اندر کا تو نہیں پتا اماں! اوپر سے راضی ضرور ہے۔''
اماں خاموشی سے اس کی شکل دیکھتی رہ گئیں جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

☆☆☆

جو نہ مل سکا وہی بے وفا
یہ بڑی عجیب سی بات ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج تک میرے ساتھ ہے
کرے پیار لب پر گلہ نہ ہو
یہ کسی کسی کا نصیب ہے
یہ کرم ہے اس کا، جفا نہیں
وہ جدا بھی ہے تو قریب ہے
وہی آنکھ ہے میرے روبرو
اسی ہاتھ میں میرا ہاتھ ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج میرے ساتھ ہے
میرا نام تک نہ جو لے سکا
جو مجھے قرار نہ دے سکا
جسے اختیار تو تھا مگر.....
مجھے اپنا پیار نہ دے سکا
وہی شخص میری تلاش ہے
وہی درد میری حیات ہے
جو نہ مل سکا وہی بے وفا
یہ بڑی عجیب سی بات ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج تک میرے ساتھ ہے

''کہاں ہو؟ ملنا ہے تم سے۔'' وہ ایک اداس سی شام تھی جب زمین سنجیدگی سے خودکشی کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بے حسی کی چادر چیخی تو اسے احساس ہوا کہ وہ زلفی نامی کٹر میں گرنے والی تھی۔ اسے لگا کہ مر جانا اس شادی سے بہتر فیصلہ تھا۔ تجل کے میسج نے اسے جھنجھوڑ سا دیا۔
''زندہ ہوں..... اسی دنیا میں۔'' زمین کو جوابی میسج کرتے ہوئے اسے رونا آ گیا۔ کیا تھی وہ اور کیا بن چکی تھی۔
''اور مجھے کسی سے نہیں ملنا۔''
''تم آ رہی ہو یا میں گھر آ جاؤں؟''
''میں نہیں ملنا چاہتی تجل! کسی بھی پرانے تعلق کو میں اپنی زندگی میں نہیں دیکھنا چاہتی۔'' اس نے آنسو پیتے

ہوئے کہا۔
''بکواس مت کرو اور فوراً آؤ۔ بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے..... یوں سمجھو، زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔''
کجل نے بعجلت کہہ کر اسے مزید کسی سوال جواب کا موقع دیے بنا ملنے کی جگہ بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ نرمین نے گہری سانس کھینچی۔ پچھلے مہینے بھر سے وہ کجل سے ماسوائے واٹس اپ میسجز کے کسی رابطے میں نہ تھی۔ اور آج.....
اس نے ایک نظر اپنے شکن آلود کپڑوں پر ڈالی اور الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔
''کہاں جا رہی ہو؟'' حریم اندر آئی تو اسے میرون کلر کے گرم سوٹ پر گرے کوٹ اور مفلر اوڑھے بالوں میں برش کرتے دیکھ کر خوش گوار سے حیرت سے پوچھا۔ بہت دنوں بعد اس کا سوگوار سا حسن میرون رنگ میں کھلا ہوا دیکھا تو بہت اچھا لگا تھا۔
''یونہی..... کجل نے بلایا ہے۔ سوچا چکر لگا لوں۔'' وہ بال لیکچر میں جکڑ کر مفلر لپیٹتی تیار تھی۔ حریم طمانیت سے مسکرائی۔
''بہت اچھی بات ہے۔ کب سے سڑی بسی پڑی رہتی ہو، کھلی ہوا میں طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔''
وہ سرہلاتی موبائل بیگ میں ڈالتے ہوئے اماں کو بتا کر گھر سے نکل آئی۔ رکشہ میں بیٹھ کر قریبی ریسٹورنٹ کے فیملی کیبن میں پہنچنے تک کئی بار اس نے راستے سے واپس لوٹ جانے کے متعلق سوچا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ کے ہال پر طائرانہ نظر ڈالتی فیملی کیبن کی طرف آ گئی۔ شولڈر بیگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ کرسی پر گر سی گئی۔ کرسی سے سر ٹکائے آنکھیں موندے وہ نجانے کن تکلیف دہ سوچوں کی زد میں تھی کہ ٹیبل کی سطح کو کسی نے کھٹکھٹایا تو وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔
''ہیلو۔'' اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ مسکراتا ہوا اس کے سامنے عباد وسیم کھڑا تھا۔ نرمین کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔
''جھوٹ بول کر ملنے کے لیے بلایا ہے تمہیں، لیکن معذرت بالکل بھی نہیں کروں گا۔''
وہ بشاشت سے کہہ رہا تھا اور نرمین کے حلق میں کڑواہٹ بھرتی جا رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے جانے کے لیے اٹھی اور اپنا بیگ تھام کر کندھے پر ڈالا لیکن اپنے ہاتھ کو عباد کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں پا کر وہ غصے سے بولی۔
''ہاتھ چھوڑو میرا..... اور میرا نہیں خیال کہ تم ساری زندگی میرا سامنا کرنے کے قابل رہے ہو۔''
''اور اگر میں کہوں کہ یہی ہاتھ مانگنے آیا ہوں تم سے تو؟'' عباد نے پرسکون انداز میں کہا تو وہ ناسمجھی کی سی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔
''شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے بیوٹی فل گرل! تم جیسی قیمتی سوچ رکھنے والی لڑکی میں اپنی زندگی سے نفی نہیں کر سکتا۔'' وہ بڑے جذب سے کہہ رہا تھا اور نرمین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پروپوزل پر اسے رونا چاہیے یا ہنسنا۔

☆☆☆

''یہ لو بھئی..... شادی کارڈز کے ڈیزائن ہیں جو پسند ہو مینو کو، وہ الگ کر لینا۔'' ابا نے شادی کارڈز کی کیٹلاگ اماں کو تھمائی تو حریم اشتیاق سے کتاب ان کے ہاتھ سے لے کر کارڈز کے ڈیزائن دیکھنے لگی۔ طوبیٰ بھی اس کے ساتھ جھک آئی۔
''ابھی تو تین ہفتے پڑے ہیں مینو کے ابا! شادی کی تیاریاں ختم نہیں ہوئیں اور آپ کو شادی کے کارڈ چھپوانے کی فکر لگ گئی ہے۔'' اماں جز بز ہوئیں۔ تو وہ مسکرا دیے۔

''تیاریاں تو آخری دن تک چلتی رہتی ہیں کارڈ چھپنے میں بھی وقت لگتا ہے..... پھر بانٹنے تو اپنی مرضی سے ہیں جب جی چاہے گا، تب بانٹ دیں گے۔ چھپ جائیں گے تو ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔'' ابا نے تفصیل سے سمجھایا تو وہ مسکرا دیں۔

''رشتے داروں کی لسٹ بھی بنانی ہے ابا! کس کس کو بلانا ہے اور کتنے کتنے بندے بلانے ہیں۔'' حریم کو ایک اور اہم کام یاد آیا۔

''بھئی۔ میرے گھر کی پہلی شادی ہے میں تو سب کو ہی بلاؤں گا اور پوری پوری فیملی کو بلاؤں گا۔'' ابا واقعی بہت خوش تھے۔ اماں کا دل گھبرانے لگا۔

''پتا نہیں کیا بات ہے... سب کام سیدھے سیدھے ہو رہے ہیں پھر بھی میرا دل جیسے کسی شکنجے میں کسا ہوا ہے۔'' آج نہ چاہتے ہوئے بھی اماں نے اپنے دل کی گھبراہٹ اگل ہی دی تھی۔ ابا خوب ہی ہنسے۔

''تم عورتیں بھی نا..... بہت خوب ہوتی ہو۔ جب کوئی مسئلہ ہو تب بھی سکون نہیں اور جب کوئی مسئلہ نہ ہو تب بھی ٹینشن کہ کوئی مسئلہ نظر نہیں آ رہا خدا خیر کرے۔''

حریم بھی ان کی بات سن کر ہنسنے لگی تو اماں جھینپ سی گئیں۔

☆☆☆

اس روز نرمین گھر آئی تو بہت خوش تھی۔ اتنی خوش جتنی کہ اس شادی کے طے ہونے سے پہلے خوش اور مطمئن ہوا کرتی تھی۔ حریم رات سونے کے لیے کمرے میں آئی تو اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی اور ساتھ شادی کارڈز کی کیٹلاگ بھی۔

''یہ لو۔ اپنی شادی کا کارڈ پسند کر لو۔'' حریم مسکرائی تو وہ دودھ ختم کر کے خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے حریم کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تم نے کبھی سزائے موت کے قیدی کی موت کی سزا کو پھانسی کے پھندے کے قریب جا کر معاف ہوتے دیکھا ہے حری!'' نرمین کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ حریم کا دل خفیف سا لرزا۔

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو..... کارڈ پسند کرو شادی کے لیے۔'' حریم نے زبردستی کی بشاشت سے کہا۔ تو وہ کھل کر مسکرائی۔

''پہلے شادی کے لیے لڑکا تو پسند کر لوں۔''

وہ اطمینان سے کہتی حریم کے اردگرد گویا دھماکہ کر گئی۔

''عباد نے پروپوز کیا ہے مجھے حری! وہ اپنی مما کو ہمارے گھر بھیجنا چاہتا ہے میرے رشتے کے لیے۔'' وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ حریم کو لگا اس کے دماغ کے پرخچے اڑ گئے ہوں۔

شادی والے گھر میں شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو جانے والی تھیں۔ شادی کے کارڈز چھپنے والے تھے اور دلہن اپنے لیے نیا بر تلاش کر آئی تھی۔

دروازے میں کھڑی تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی گفتگو سنتی اماں اپنے دل کے اوہام کو سچ ہوتے دیکھ چکرا کر گریں تو دھڑام کی آواز نے حریم اور نرمین دونوں کو ہڑبڑانے پر مجبور کر دیا۔ اماں کو کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر بے سدھ گرے دیکھ کر حریم بے اختیار چیختی چلی گئی۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

شازیہ الطاف ہاشمی

غلط فہمی

ایک دھند بھری صبح رافیہ ساگ کے شبنم آلود گٹھڑ کو دوپٹے میں باندھ رہی تھی کہ اماں چلی آئیں۔

"اے راتی! یہ کیا کر رہی ہے؟"

"اماں! مس نادیہ نے ساگ لانے کا کہا تھا اور وہ بھی تازہ۔ یہ دیکھو، میں نے بہت سارا ساگ تو توڑا ہی ہے، ساتھ یہ گلاب کے پھول بھی توڑ لائی ہوں اپنی مس کے لیے۔ اگر تم انہیں دیکھو ناں تو دیکھتی

رہ جاؤ گی۔ سچ میں وہ بہت اچھی ہیں۔"

"وہ اچھی تو ہے مگر اتنی ٹھنڈ ہے، خدانخواستہ جو تجھے ٹھنڈ لگ جائی پھر۔"

اماں فکر مند ہو گئیں۔ اس کے دوپٹے اور سر پر شبنم کے بے شمار قطرے پڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد مالٹے، کدو، انار کے پھول، کچے پکے انار، لسی بہت کچھ گھر سے ـــ جاتا رہا تھا اور گرمی سردی کسی رکاوٹ کی پروا نہیں کی گئی تھی۔

رانی بھی ان ساری لڑکیوں میں شامل تھی۔ جنہیں اپنی ٹیچر سے بے انتہا محبت ہوتی ہے۔ اس محبت کا آغاز ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔

☆☆☆

مس نادیہ نے رافیہ کی اماں کو بلوایا تھا، اسکول میں انہوں نے کہا تھا کہ رانی انگلش میں بہت کمزور ہے۔ اگر ٹیوشن پڑھے گی تو اچھے نمبر آسانی سے لے سکتی ہے۔ آپ اسے ٹیوشن ضرور پڑھائیں۔ کوئی اتنی فیس بھی نہیں ہے، یہ بہت ضروری ہے۔

کلاس ٹیچر کے سامنے رافیہ دم سادھے ان کی بات سنتی انتہائی ادب سے کھڑی تھی۔ اماں نے اپنی چادر درست کی اور ان کی پوری بات سن کر بولیں۔

"میڈم جی! اپنا زمیندارہ ہے۔ زمین، فصلیں بہت ساری ہیں۔ رانی آٹھویں پاس کر لے تو بہت ہے۔ اسے پہلے ہی اسکول آنے کی اجازت بڑی مشکل سے ملی ہے۔ گھر میں سو کام ہوتے ہیں ہمارے۔ ہمیں بچی کو پڑھانے لکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گھر داری سیکھ کر اگلے گھر رخصت کر دیں گے بس اور اس کے ابا کرم دین تو پہلے ہی پڑھائیوں لکھائیوں کے سخت خلاف ہیں۔"

رانی کا خیال تھا کہ آج اس کا اسکول میں آخری دن ہوگا۔ چوہدری کرم دین کا فیصلہ لوہے پر لکیر جیسا تھا مگر اس زنگ آلود لوہے سے غلط فیصلے کی لکیر لمحوں میں مٹ چکی تھی۔

اماں نے مس نادیہ کی کہی ہوئی ساری باتیں ابا کو کہہ سنائیں۔ بڑی راضیہ آپا اور بھائی طفیل بھی مان گئے تھے۔

"سچ ہے ابا جی، علم سے وڈی کوئی دولت نہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن ہے، آندھی ہو کہ طوفان، بارش یا پھر زلزلہ زمین الٹ کر رکھ دے، مارے باندھے پڑھنے والی رانی نے پڑھ کر دکھایا اور چھٹی نہ کی۔

مس نادیہ کو ایک ایک لفظ رٹ کر سنایا یا پھر سمجھ کر سنایا ضرور تھا۔

رانی محبت نبھانے والوں میں سے تھی، سچی بڑے دل والی۔ جب رانی نے آٹھویں پاس کی تو اسے رزلٹ کارڈ کے نمبروں سے زیادہ مس نادیہ کے لفظوں کا انتظار رہا کہ وہ کن الفاظ میں رانی کو سراہیں گی اور کیسے اس کے حوصلوں کو پر لگا کر عزم کے عظیم وسیع آسمان پر اڑنا سکھائیں گی۔

مس نادیہ کا روشن چہرہ اس کا آئیڈیل بنتا گیا۔ وہ محنت کرتی رہی۔ نویں دسویں اور پھر کالج کا پہلا دن وہ کون سے مضامین رکھے گی۔ کس کالج میں داخلہ ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ مس نادیہ کی ہر بات حرف آخر، ان کا ہر فیصلہ صادق۔

"رانی تو نے آج کیا کھانا ہے۔ یہ تیری میڈم نے بتایا تجھے۔"

"ہاں تو پوچھ لوں گی ناں ان سے۔ ویسے وہ تو صبح سویرے اورنج جوس پیتی ہیں۔ اب میں کہاں سے پیوں بھلا، لے دے کے یہی دیسی گھی کے پراٹھے، کبھی، دیسی مرغ کے سالن اور یہ بڑے بڑے مالٹے..... پہلے چھلکا اتارو پھر پھانکیں کھاؤ۔ اف کاش میں اورنج جوس پی سکتی روزانہ۔"

رانی حسرت سے بہت کچھ کہہ گئی۔

"ہمارے اپنے تازہ مالٹے آتے ہیں باغ سے، اس اورنج جوس سے سوگنا اچھے۔ درمیان سے کاٹ کر جوس نکال لیا کرو رانی! اس میں اتنی حسرت

کی کیا بات ہے۔‘‘

’’کاش میں مس نادیہ بن سکتی ...... کاش ......‘‘

☆☆☆

رانی! اماں کاشو سے تمہارا رشتہ طے کر رہی ہیں۔‘‘

راضیہ آپا کی شادی کو تیسرا سال تھا۔ ایک چھوٹا سا منا بھی ان کی گود میں کھیلنے لگا تھا۔ طفیل بھائی کی منگنی ہوگئی تھی، خیر سے اس سال دھان کی فصل کی مہکار بساند بھرے پانیوں سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی۔ خوشبوؤں سے بسے لمبے چاول کے دام بھی بہت اچھے نکلے تھے۔ اب رانی کے ہاتھ پیلے کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ چوہدری کرم دین کو اپنے بھتیجے کاشف علی کاشو سے بڑی محبت تھی، بھلے ایف ایس سی میں نمبر اچھے نہ تھے، پر لیے تو تھے ناں، پاس تو ہو ہی گیا تھا۔

مگر اپنے مرحوم باپ کی زمین ماں سمجھ کر بڑے شوق سے گلے لگائی تھی۔ بڑا محنتی بچہ تھا۔ چوہدری کرم دین کو اس پر ہمیشہ بڑا مان رہا تھا۔ اب وہ اسے فرزندی میں لینے کا سوچ رہا تھا بلکہ وہ تو تھا ہی بیٹا، بھر جائی صفیہ نے جھولی پھیلانے کے بجائے بڑی سیدھی بات کہی تھی۔

’’رانی میری نونہہ (بہو) بنے گی بس۔‘‘ کرم دین بڑے دل سے مسکرایا اور بھتیجے کے سر پر پیار دینے لگا۔ رانی کی زندگی میں کاشو چھوڑ کوئی عاشو باشو نہیں آئے تھے سوائے مس نادیہ کے۔ اس وقت بھی مس نادیہ کے خیالوں میں کھوئی ہوئی، اپنے ہائی اسکول کے زمانے کی سال بھر پہلے کی تصاویر نکالے بیٹھی تھی۔

’’مس نادیہ بہت ذہین اور خوب صورت خاتون ہیں۔‘‘

رانی اپنی ساری کلاس فیلوز کو ان کی باتیں بتاتی رہتی۔ اب اس کے پاس مس نادیہ کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔

’’امی میں چاہتی ہوں کہ پہلے میں بی ایڈ کرلوں پھر کسی اچھے سے آدمی سے میری شادی کر دیجیے گا۔‘‘

رانی نے اپنے تئیں بڑا پڑھا لکھا جواب مختصر سا دیا تھا۔

’’پتر! یہ اچھے سے آدمی کا کیا مطلب ہے۔ کیا کمی ہے اپنے کاشو میں اور سن، وہ تجھ سے محبت بھی کرتا ہے اور جو محبت ہے ناں کسی پڑھے لکھے یا ان پڑھ، ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ تیرا نصیب اپنوں میں جڑا ہے اور تو بھلا کوئی بری دھی (بیٹی) ہے کہ کسی اور کی محبت میں خود کو ناحق گھلاتی رہے۔‘‘

’’مجھے کسی سے محبت نہیں ہے امی! مگر وہ مس نادیہ کہتی ہیں کہ پڑھے لکھے انسان سے شادی کرو تو......‘‘

’’ان پڑھ تو وہ بھی نہیں رانی! ماں باپ سے بڑھ کر بھی کوئی تیرے لیے سوچ سکتا ہے۔ یہ جو اتنی ساری کتابیں پڑھی ہیں تو نے، ان سے ہی پڑھ کے دکھادے کوئی ہے اپنی ماں اور اپنے باپ سے بڑھ کر۔ کل تیری میڈم کے گھر چلتے ہیں، اس کی تو مانے گی اور ماننا تو پڑے گا رانی کہ تیری شادی کاشو سے ہی ہونی ہے۔ چلو میڈم جی کا مشورہ بھی سہی۔‘‘

’’ٹھیک ہے امی! بالکل ٹھیک ہے۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے ان کے گلے لگ گئی۔

☆☆☆

گیٹ پر ہی چوکیدار نے بتایا کہ میڈم جی گھر پر نہیں ہیں۔ دونوں ماں بیٹی تانگے پر بیٹھ کے ٹمیالی نہر کے کنارے اگی گھاس کو دیکھتی لوٹ آئی تھیں۔

رانی نے ماں باپ کے فیصلے کو دل سے مان لیا تھا مگر میڈم کو بتانا بھی وہ ضروری سمجھتی تھی۔ میڈم اس کے مزاج کو سمجھتی تھیں، اسے جانتی تھیں۔ اسے درست مشورہ دیتیں۔ وہ رانی کے لیے بے حد اہم تھیں۔

آج اس کا آخری پیپر تھا اور میڈم جی کو شادی کا کارڈ دینے وہ خود آئی تھی۔ یہ تو اس کے لیے اعزاز کی بات تھی کہ وہ اس کی شادی میں شرکت کرتیں۔

گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر اس نے دوسری بیل

دی تھی۔ جب میڈم جی کے چھوٹے بیٹے نے اسے اندر آنے دیا تھا۔ اندر کمروں کی لمبی لائن، درمیان سے میڈم کی پیاری سی بڑی بیٹی خدیجہ نکلی اور اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھنے لگی تھی۔

''مما گھر پر نہیں ہیں۔''

''میڈم کہاں گئی ہیں خدیجہ۔''

''وہ لاہور گئی ہیں اور آنے کا بتا کر نہیں گئیں۔''

پتا نہیں کیوں خدیجہ کا لہجہ اسے عام نہیں لگا تھا۔

''اچھا انہیں بتا ضرور دینا کہ رانی آئی تھی اور یہ کارڈ انہیں دے دینا۔''

پتا نہیں پھر کبھی آنا ہو بھی کہ نہیں۔ کاش وہ انہیں آخری بار دیکھ سکتی۔ کسی ہلکی سی امید کا سرا تھام کر وہ پھر سے خوش فہم ہونا چاہتی تھی کہ وہ میڈم جی کو ضرور یاد ہوگی۔ وہی جوان کے لیے ساگ لایا کرتی تھی جسے وہ دوسری ٹیچرز میں بھی تقسیم کیا کرتی تھیں۔

جب ہی درمیان والے کمرے سے نکل کر کوئی دوسرے کمرے میں گیا تھا، استری اسٹینڈ کے پاس سے گزرتی ہوئی وہ کوئی اور نہیں میڈم نادیہ ہی تھیں جنہیں اس کی بات میں یقیناً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے پاس پڑھ کر جانے والیوں کی تعداد اتنی تھی کہ انہیں ان میں سے رانی یاد نہ رہی تھی۔

☆☆☆

''اماں! یہ زرد سوٹ آج پہننا ہے ناں۔''

آج اس کی مہندی کی تقریب تھی۔ بہت سارے میٹھے پکوان رواج کے مطابق تیار ہو رہے تھے۔ اسے خوش کرنے کے لیے بھی کچھ ہلکے پھلکے میٹھے بھی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

''رانی! آج اتنی اداس کیوں لگ رہی ہے۔''

ماں کا موم دل ایک دم سے پگھلنے لگا تھا، وہ کیا بتاتی کہ میڈم جی اسے بھول گئی ہیں اس لیے بات بنا کر بولی۔

''سب کو چھوڑ کر جو جانا ہے۔''

''تو چھوڑ کر نہیں جائے گی، یہیں رہے گی میری آنکھوں کے سامنے۔ یہاں تک کہ ہماری آنکھیں بند ہو جائیں گی۔''

اماں رو پڑی تھیں۔ ماں بیٹی کے آنسو آپس میں گھل مل گئے تھے۔

''اپنی میڈم جی کو نہیں بلایا تم نے۔''

''نہیں اماں! رہنے دو۔ ان کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اسے کیا ضائع کرنا۔'' وہ اداسی سے مسکرا دی۔

اماں کی محبت کتنی سچی تھی اور اس کی محبت کتنی کچی تھی۔ ہر کسی سے محبت کرنا بھی کوئی محبت ہوتا ہے۔ زندگی کے سفر میں تو بہت سارے لوگ ملتے ہیں۔ ہر کسی سے متاثر ہونا اور دل سے لگا لینا کہاں کی عقل مندی ہے بھلا۔ تو وہ غلطی پر تھی۔ اس نے سوچا۔

☆☆☆

''رانی! یہ تمہارے لیے۔'' وہ ایک بھاری پیکٹ تھا۔ ''یہ تمہاری سال دوم کی کتابیں، کچھ کم پڑیں تو لکھ کر دے دینا۔ چچا جان نے بڑا سخت حکم دیا ہے کہ تمہاری پڑھائی متاثر نہ ہو۔''

دلہن بنی رانی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور لب مسکرانے لگے۔

''اور کوئی حکم ہو تو سائیں حاضر ہوں۔ اور تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری میڈم جی کا بھی غلام ہوں۔''

''نہیں تم صرف میرے.....''

''ہیں..... صرف تمہارا غلام..... مطلب ہوں تو غلام ہی ناں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔''

پتا نہیں کون سا دکھ چپکے سے آنکھوں سے ٹپک کر دوپٹے میں جذب ہو گیا تھا۔

میں کچھ نہیں تھی
مگر اس کی "سب کچھ" تھی

میں تو اک عام سی لڑکی تھی مگر اس کی نظروں کے ارتکاز نے مجھے خاص الخاص بنا دیا تھا۔ جب وہ مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا آنکھیں جھک جھک جاتی تھیں۔ قدم ڈول ڈول جاتے تھے۔ زمین زمین نہ رہتی، آسمان بن جاتی۔ میں بادلوں پہ سوار جھولتی، گاتی، مسکاتی اکیلے میں سرگوشیاں کرتی۔

"کیا محبت ایسا بے خود کرنے والا جذبہ ہے عاشی؟" میں اپنی چھوٹی بہن سے سوال کرتی۔ وہ افسوس بھری نظروں سے مجھے دیکھتی۔

"آمنہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ مانا کہ تمہاری قاسم سے بات پکی ہونے والی ہے۔ مگر ابھی ہوئی تو نہیں۔ خدا کے لیے آمنہ! خود کو اتنا ہلکا مت کرو۔ مانا کہ تمہاری ہونے والی ساس ہماری تائی ہیں۔ مگر مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ دیکھا نہیں کتنی مغرور ہیں؟"

"ایسے مت کہو عاشی!" میں بلبلا کر بولتی۔

"ہاں وہ تھوڑی الگ طبیعت کی ہیں مگر مغرور تو نہیں۔"

"وہ مغرور ہیں۔" عاشی ہٹ دھرمی سے کہتی۔

میں افسوس بھری نظروں سے اپنی بہن کو دیکھتی۔

"عاشی! کیا قاسم تمہیں برا لگتا ہے؟"

"نہیں۔" عاشی ترنت جواب دیتی۔ میرا دل خوشی سے جھوم جاتا، مگر اگلے لمحے عاشی جواب دیتی۔

"مگر اچھا بھی نہیں لگتا۔"

"عاشی اس میں برائی کیا ہے۔" عاشی کہتی۔

"آمنہ وہ ایک خود پسند، خود غرض شخص ہے۔ ایسے

تحسین گل

لوگ صرف اور صرف اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا نہیں کہ وہ اپنی بہنوں سے کس لہجے میں بولتا ہے؟"

"گھر کا اکلوتا لڑکا ہونے کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ عاشی اکلوتے بیٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"نہیں، آمنہ! کبھی کبھی اکلوتے بیٹے بیوی کے لیے آزمائش بن جاتے ہیں۔" میں تھک ہار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میری محبت عاشی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

"یا اللہ میری مدد کریں۔"

☆☆☆

میں پندرہ سال کی تھی جب ایک دن آنگن میں کھیلتے کھیلتے میں نے تائی کی آواز سنی۔ وہ امی سے کہہ رہی تھیں۔

"عالیہ میں تو آمنہ کو اپنے قاسم کی دلہن بناؤں گی۔" امی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا تو دھیمی سی آواز میں بولیں۔

"بھابھی بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرتے۔" اور مجھے ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا۔ میں وہاں سے بھاگ آئی مگر تائی کی آواز کو اپنے حواسوں سے نہ بھگا سکی۔ وہ آواز دن رات میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ آہستہ آہستہ قاسم مجھے اچھا لگنے لگا۔ جوانی کی رُت بہت سہانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی خواب حقیقت لگنے لگتے ہیں۔

ابو چار بھائی تھے۔ دادا جان نے چاروں بیٹوں کو ایک ساتھ قطار میں گھر بنوا کر دیے تھے۔ کاروبار مشترکہ تھا۔ فارغ البالی اور خوش حالی نے خاندان میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ تائی کی طبیعت میں دکھاوا زیادہ تھا۔ امی بھی ان سے متاثر تھیں اور خود پسند لوگوں کو اپنے سے متاثر لوگ اچھے لگتے ہیں۔ لہٰذا امی بھی بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کے علاوہ امی ہر کام ان کے مشورے سے کرتی تھیں۔

میں دھیرے دھیرے نوجوانی کی سیڑھیاں چڑھتی جوانی کی طرف جا رہی تھی۔ قاسم کی محبت کا خمار گہرا ہونے لگا تھا۔ اس بات کا احساس اب قاسم کو بھی ہو گیا تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگی ہوں۔ وہ اب معنی خیز باتیں کرنے لگا تھا۔ ایک دن ہم سب کزن اکٹھے بیٹھے تھے کہ شرط لگی موم بتی جلا کر جو تین منٹ تک اپنے ہاتھ اس کے شعلے پر رکھے گا اس کو پانچ سو روپے انعام ملے گا۔

قاسم ہنس پڑا۔

"ارے یہ لڑکیوں کا کام نہیں۔"

میں جوش میں اٹھی۔ موم بتی جلائی اور اپنا ہاتھ اس پر رکھ دیا اور بولی نگاہ گھڑی کی طرف رکھو۔ اپنی نگاہ میں نے موم بتی کی طرف کر دی۔ قاسم کو دیکھنے کی نسبت موم بتی کو دیکھنا آسان تھا۔ آگ نے میرا ہاتھ جلانا شروع کر دیا۔ مگر دل کی تپش زیادہ شدید تھی، ایک دم سے کسی نے مجھے پیچھے کھینچا۔ دیکھا تو عاشی غصے میں بھری کھڑی تھی۔ قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کو شرم آنی چاہیے۔ اگر آپ کی اپنی بہن ہوتی تو کیا آپ برداشت کر لیتے۔" وہ مجھے پکڑ کر کمرے میں لائی اور بولی۔

"آمنہ! تم اپنے آپ کو کتنا گراؤ گی؟"

میں نے کہا۔

"کیوں عاشی! کیا ہوا؟ میں نے کیا کیا؟ میں نے تو صرف شرط لگائی تھی۔"

عاشی دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "کاش آمنہ! تم نے اس وقت اس کی آنکھوں میں دیکھا ہوتا۔ کتنا تمسخر تھا اس کی نگاہ میں۔"

میں دھیمی سی آواز میں بولی۔ "کیسے دیکھتی..... اس کو میں نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتی۔" عاشی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"مرو..... میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔"

رات کو سب کھانا کھا چکے تو دروازے پر بیل بجی۔ میں قریب تھی۔ دروازہ کھولا تو قاسم تھا۔ چاولوں

کی پلیٹ ہاتھ میں تھی، اندر آیا اور بولا۔
''چچی کہاں ہیں؟''
میں نے جواب دیا۔ ''نماز پڑھ رہی ہیں۔''
''اور چچا؟''
''وہ اپنے بیمار دوست کی عیادت کرنے گئے ہیں۔''
پلیٹ اس نے مجھے پکڑائی۔ میں برتن رکھنے باورچی خانے میں گئی تو وہ وہیں اسٹول پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''آمنہ! تم نے آج یہ کیا حرکت کی؟ اپنا ہاتھ جلا ڈالا۔ ذرا دکھاؤ۔''
میں نے ہتھیلی آگے بڑھائی۔ اس نے جلی ہوئی جگہ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ میں گم صم ہوگئی۔ ایک دم سے وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ مجھے کھڑے کھڑے جانے کتنا زمانہ بیت گیا۔ قوس قزح کے رنگ میرے اردگرد پھوٹ رہے تھے اور میں ان دائروں میں گول گول گھوم رہی تھی۔ نجانے کتنی دیر لگی' آہٹ ہوئی تو امی کھڑی تھیں۔
''آمنہ! کیا ہوا بیٹا؟ ایسے کیوں کھڑی ہو اور کون آیا تھا؟''
''وہ..... وہ ..... امی! قاسم چاول دینے آیا تھا..... اور میں..... مجھے وہ چھپکلی نظر آ گئی تو ڈر گئی تھی۔''
امی جانتی تھیں کہ میں چھپکلی سے بہت ڈرتی تھی۔ اتنا کہ جہاں نظر آتی میں جامد ہو جاتی تھی۔ امی ہنس پڑیں اور بولیں۔
''چلو اندر جاؤ، باقی کام میں دیکھ لوں گی۔''
میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور آہستگی سے بستر پر بیٹھ گئی۔
''یا اللہ یہ کیا تھا؟ خواب یا حقیقت۔ کیا میں بھی قاسم کو اچھی لگتی ہوں۔''
ساری رات آنکھوں میں گزر گئی۔ اگلے دن شام کو تائی امی کے گھر گئی تو وہ اپنی الماری صاف کر رہی تھیں۔ میں آگے بڑھی اور بولی۔
''تائی امی! رہنے دیں، میں صاف کر دیتی ہوں۔'' تائی امی خوش ہوگئیں۔ دو گھنٹے لگا کر ان کی الماری صاف کی۔ اتنے میں قاسم بھی آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ اس نے اپنی بہنوں کا پوچھا تو تائی نے جواب دیا کہ وہ دونوں اپنی سہیلی کے گھر گئی ہیں۔ پھر مجھ سے بولیں۔
''بیٹی ابھی جانا مت، میں چائے بناتی ہوں۔ مگر پہلے ذرا کپڑے تبدیل کر لوں۔'' وہ باتھ روم میں چلی گئیں۔ قاسم میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔
''اچھا تو ساس صاحبہ کی خدمت ہو رہی ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔''
اتنے میں تائی باہر نکل آئیں۔ میں بولی۔
''رکیں تائی! میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔''
قاسم بولا۔ ''میرے کپ میں چینی کم ڈالنا۔''
میں مسکراہٹ چھپاتی ہوئی باورچی خانے میں گئی اور پورے مالکانہ حقوق سے چائے بنانے لگی۔
آہستہ آہستہ محبت کا خمار اتنا گہرا ہونے لگا کہ میں اپنے گھر سے زیادہ تائی کے گھر کا کام کرنے لگی۔ تائی بھی بات بات پر مجھے بلا لیتیں۔ آمنہ آج مہمان آنے والے ہیں، ذرا کچن میں کام ہوگا' ہاتھ بٹا دینا۔ اپنے گھر والوں کی نسبت تائی کے گھر والے زیادہ اچھے لگنے لگے۔ عاشی نے مجھے اب میرے حال پر چھوڑ دیا۔
ان ہی دنوں قاسم کی خالہ کینیڈا سے آئی تھیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا بھی ہمراہ تھے۔ بہت ماڈرن اور شوخ مزاج — تائی نے دعوت کا اہتمام کیا تھا اور میں حسب معمول باورچی خانے میں تھی۔ قاسم اندر آیا اور پانی مانگا۔ میں نے گلاس اس کو دیا۔ اتنے میں اس کی کزن سمیرا باورچی خانے میں آئی اور بولی۔
''قاسم کیا آپ مجھے مارکیٹ لے کر جا سکتے ہیں۔ دراصل مجھے کچھ بہت ضروری چیزیں لانی تھیں۔''

قاسم بولا۔ ''کیوں نہیں، آیئے۔''
کیمرا نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ بھی میرے ساتھ جانا پسند کریں گی؟''
میرے جواب دینے سے پہلے ہی قاسم بولا۔
''ارے یہ کوئی مہمان تھوڑی ہے، تم آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' مجھے بہت بے عزتی محسوس ہوئی۔ جلدی جلدی برتن دھوئے اور گھر کی راہ لی۔ ساری رات روتے ہوئے گزر گئی کہ قاسم نے ایسا کیوں کیا۔
کتنے دن سے نہ تائی کی خبر تھی نہ قاسم کی۔ دل کسی طور بہلتا ہی نہیں تھا۔ آخر ایک دن دھماکا ہو گیا۔ تائی، امی کے پاس آئیں اور بولیں۔
''عالیہ میں سوچ رہی ہوں کہ قاسم کی منگنی کر دوں۔''
امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بھابھی! جیسی آپ کی مرضی۔''
تائی بولیں۔ ''ہاں اسی لیے تمہارے پاس آئی تھی کہ مشورہ دو کیا کروں۔ سچی بات کہوں تو مجھے آمنہ بہت پسند ہے۔ مگر قاسم کا رجحان کیمرا کی طرف ہے۔ اب میں کیا کروں۔ تم سے شرمندہ بھی ہوں اور تم پر مان بھی ہے۔ عالیہ! میری مدد کرو۔'' امی خالی خالی نظروں سے ان کو دیکھنے لگیں۔ میں ایک دم آگے بڑھی اور ہنس کر تائی کے گلے لگ گئی۔
''ارے تائی! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ دلہن وہی جو پیا من بھائے۔ آپ کو میں پسند ہوں مگر میں نے تو قاسم کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ اچھا ہے وہ جہاں کہہ رہے ہیں، وہیں شادی کر دیں۔ بہت خوش رہیں گے اور ویسے بھی تائی! میں ساری عمر ان کو دیکھ کر بور نہیں ہونا چاہتی۔ میں تو وہاں شادی کروں گی جہاں میری امی کہیں گی۔ کیوں امی؟'' امی نے ممنون نظروں سے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔
''بالکل بھابھی! آپ بے فکر ہو کر رشتہ پکا کریں۔ ہمارے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔'' تائی نے امی کو شکر گزار نظروں سے دیکھ کر گلے لگا لیا۔
رات کو عاشی میرے پاس آئی اور بولی۔
''آمنہ! میں نے کیا سنا ہے؟''
''ہاں عاشی! تم نے ٹھیک سنا ہے۔ میں نے انکار کر دیا ہے۔''
''مگر کیوں آمنہ! تم تو قاسم سے بہت محبت کرتی تھیں۔''
''نہیں عاشی! وہ محبت نہیں تھی۔ وہ تو کچی عمر کا خمار تھا، جس نے اپنے دائرے میں مجھے قید کر رکھا تھا۔ نہ مجھے تم لوگ نظر آتے تھے، نہ تم لوگوں کی محبت اور نہ ہی اپنی عزت۔ عاشی! تم ٹھیک کہتی تھیں، وہ ایک خود پسند اور خود غرض شخص ہے۔ آج اس کو مجھ سے امیر لڑکی نظر آئی تو اس نے میری ساری خوبیوں کو نظر انداز کر دیا۔ مجھے نظر آ گیا ہے وہاں مجھے قاسم کی محبت تو ملے گی مگر عزت نہیں۔ عاشی! مجھے آج پتا چلا کہ عزت محبت سے بڑھ کر ہے۔ آج مجھے امی کی نظروں میں بے بسی اور لاچاری دکھائی دی۔ اگر آج میں چپ رہتی تو امی کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتیں۔ مجھے لگا کہ آج میں نہ بولی تو بہت، بہت برا ہو گا اور دیکھو عاشی! مجھے دکھ نہیں ہوا۔ میں خوش ہوں۔ میری روح ہلکی ہلکی سی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک بوجھ تھا جو میں لادے ہوئے تھی۔ آج میں اس بوجھ سے آزاد ہوں، اگر یہ محبت تھی تو کیسی تھی؟ نہیں، یہ محبت نہیں تھی۔ ہم لڑکیاں کتنی نادان ہوتی ہیں، خواب دیکھتی ہیں۔ مگر ان کی بھیانک تعبیر سے انجان ہوتی ہیں۔ عاشی! عزت محبت سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ آج میں یہ مان اور جان گئی ہوں۔ امی ابو میرے لیے جو فیصلہ کریں گے مجھے بخوشی قبول ہو گا۔''
عاشی بولی۔
''آمنہ! تمہارے ساتھ جو ہو گا اچھا ہی ہو گا۔ تم صاف نیت رکھنے والی لڑکی ہو اور قاسم جیسا بدنیت تمہارے قابل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسی لیے اس سے بچا لیا۔ میری بہن! اداس مت ہونا۔ اللہ نے تمہارے لیے بہترین فیصلہ مقرر کر رکھا ہے۔ اٹھو، اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔''
اور ہم دونوں شکرانے کے نفل پڑھنے کے لیے اٹھ گئے۔

☆

نمرہ احمد

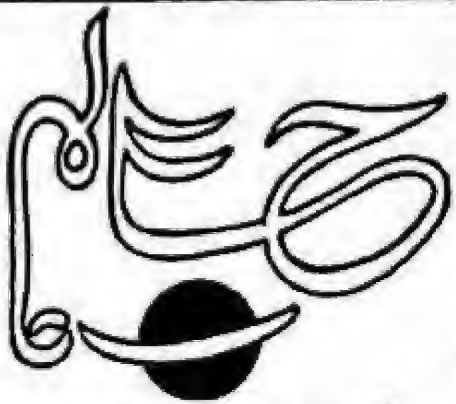

حالم

ستائیسویں قسط

وہ سائے میں نظر آ رہا تھا۔ تیز روشنی اس کی پشت پہ تھی۔ اس لیے وہ کھڑا ہوا تو اس کے چہرے کے تاثرات دھندلانے لگے۔

"کیونکہ میں ایک بات جانتا ہوں۔ پرانی عادتیں نئے ارادوں سے پختہ ہوتی ہیں۔ آپ کو سیدھے دروازوں کی عادت نہیں ہے۔ آپ کے قدم خود بخود چور راستوں کی طرف اٹھتے ہیں۔ آپ جتنی کوشش کرلیں.... اپنے اصل سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔ آپ کی زبان جھوٹ کی عادی ہے۔ آپ کے ہاتھ نقب لگانے میں ماہر ہو چکے ہیں۔ جلد یا بدیر آپ کے سامنے دوبارہ سے وہی ترغیبات آئیں گی۔ خواہش یا خوف سے مجبور ہو کے آپ کے قدم آپ کو ایک دفعہ پھر اسی راستے پہ لے جائیں گے۔ آپ کی انگلیاں ممنوعہ تالوں کی طرف بڑھیں گی اور آپ سوچے سمجھے بغیر ان کو کھولنا چاہیں گی۔ میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔"

وہ تنبیہہ کے انداز میں کہتا پلٹا تھا۔

"آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں ایمان داری سے اپنی نئی زندگی نہ شروع کروں؟ آپ مجھے فیل ہوتے کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟"

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ وہ چبھتی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ رکا اور مڑ کے اسے دیکھا۔

اب وہ روشنی اور اندھیرے کے کھیل سے دور

تھا' اس لیے اس کا چہرہ چھاؤں میں تھا اور کرخت تاثرات واضح تھے۔

''میں نے ساری زندگی پہلے پولیس اور پھر انٹیلی جنس سروس میں ایمان داری سے اپنے ملک کی خدمت کی ہے۔ میں نے آپ سے بڑے بڑے کرمنلز کو جیل میں ڈالا ہے۔ میں کبھی بھی کرمنلز کے ساتھ ڈیلز کرنے اور ان کو امیونٹی دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ اوپر سے آئے احکام کے باعث میں مجبور تھا۔ مگر ایسی ڈیلز لاء انفورسمنٹ کو ہمیشہ ناخوش رکھتی ہیں۔ میں ناخوش ہوں۔ میرا ڈیپارٹمنٹ ناخوش ہے اور ہم سب آپ سے دوبارہ کسی دوسرے حال میں ملنے کے منتظر رہیں گے' چے تالیہ۔'' سر کو جنبش دے کر سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

تالیہ نے گہری سانس لی۔

وہ کبھی دوبارہ اس آدمی کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی' اور یقیناً اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بنے گی۔ وہ غلط کہہ رہا تھا۔ تالیہ کبھی دوبارہ کوئی جرم نہیں کرے گی۔ اس نے اپنا عزم خود سے دہرایا تھا۔

☆☆☆

کے ایل کے اس متوسط طبقے کے علاقے میں بنا وہ گھر اور اس کا باغیچہ سرما کی دھوپ سے خوب روشن نظر آ رہا تھا۔ گھاس پہ کرسی ڈالے بیٹھا ایڈم سورج کی جانب کمر کیے ہوئے تھا۔ وہ گھٹنوں پہ جرنل جمائے' قلم سے اس پہ کچھ لکھتا۔ پھر کاٹتا۔ اس کے بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور شیو ذرا بڑھی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ شدید اداس ہے۔

''تمہارے چوزے کہاں گئے؟''

آواز عقب سے آئی تھی۔ ایڈم کا قلم تھاما ہاتھ منجمد ہو گیا۔

اس آواز نے سرما کی دھوپ کو ایک دم مزید سنہرا کر دیا تھا۔

وہ بے یقینی سے اٹھا اور پلٹا۔

گھاس پہ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

اسکرٹ پہ سفید منی کوٹ پہنے' سفید ہیٹ سر پہ ترچھا جمائے' وہ مسکرا رہی تھی۔

ایک دم سارے کے ایل کو اس کی رعنائی واپس مل گئی تھی۔ تالیہ واپس آ گئی تھی۔

وہ چند لمحے دم سادھے کھڑا اسے دیکھے گیا۔ کسی کو ایک دم یوں دیکھ لینے سے دل اس طرح بھی سنبھل جاتا ہے' اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا۔

''آپ..... کب آئیں؟ مجھے آہٹ تک سنائی نہیں دی۔''

تالیہ مبہم سا مسکرائی۔ ''بنا چاپ کے چلنا بھی ایک آرٹ ہے۔ میں سیکھ رہی ہوں۔''

پھر خاموشی ہوئی۔ دونوں چند لمحے چپ کھڑے رہے۔

''کیا ہم دوبارہ سے دوست ہیں' چے تالیہ؟'' اس نے امید اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے پوچھا۔ ''ہم نے آپ کے لیے وہ نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا' یا جو آپ کرتیں' مگر ہم واقعی یہ سمجھے تھے کہ.....''

''دوست جسم کی ہڈیوں کی طرح نہیں ہوتے کہ ان کے درمیان فریکچر ہو تو ان کو زبردستی جوڑ کے باندھ کے رکھا جائے تو وہ تندرست ہو جائیں گے۔ دوستوں کے فریکچر مختلف ہوتے ہیں۔ جب دراڑ پڑے تو دونوں کو الگ ہو جانا چاہیے اور ایک دوسرے کو اسپیس دینی چاہیے تاکہ جب وہ دوبارہ ملیں تو ان کی ہیئت مختلف ہو۔ وہ ایک دوسرے سے پہلے والے پوائنٹس پہ نہ جڑیں بلکہ اپنے تعلق کو اس دفعہ نئے پوائنٹس پہ جوڑیں۔

کیونکہ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کتنے اہم تھے اور کتنے نہیں تھے۔''

''میرا سوال اب بھی وہیں ہے۔ تمہارے چوزے کہاں گئے؟'' ہیٹ والی لڑکی کی مسکراہٹ سادہ تھی۔ وہ پرانی باتوں کو دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

ایڈم نے گہری سانس لی۔

''ان کو ایک ظالم بلی نے مار ڈالا۔''

''اوہ۔ آئی ایم سوری۔'' اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ''تم تو بہت دکھی ہوئے ہو گے۔''

''مجھ سے زیادہ ماں دکھی ہے۔ میرے غم دوسری طرح کے ہیں۔''

پھر اسے خیال آیا تو جلدی سے جرنل میز پہ رکھا اور دوسری کرسی اٹھا کے سامنے بچھائی۔

''آپ داتن سے ملیں؟''

''نہیں۔ مگر مل لوں گی۔'' وہ دونوں اب دھوپ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''آپ کی نیلوفر کے خلاف مہم دلچسپ تھی۔'' وہ پہلی بار مسکرایا۔ ''اس نے ڈسپریٹ ہو کے امیزون پہ آج کتاب شائع کر دی ہے مگر لوگ اس ٹاپک سے اتنے بور ہو چکے ہیں کہ اس کی کتاب کی ایک ہیڈ لائن بھی نہیں بنی۔''

''یہ میری آزادی کی قیمت تھی' ایڈم۔''

''اب وہ آپ کو نہیں پکڑ سکتے' ہے نا؟'' وہ امید سے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ نے مسکرا کے سر ہلایا۔ دھوپ کے باعث اس نے ہیٹ مزید ترچھا کر لیا تھا اور اس کی آنکھیں سنہری لگ رہی تھیں۔

''تم بتاؤ۔ ان لیکس کی تحقیق کی تم نے؟ میں تو آج نیلوفر کی کتاب سے فارغ ہوئی ہوں۔''

''جی۔ میں جتنی تحقیق کر سکتا تھا' کر چکا ہوں۔ آپ کے نام پہ نیشنل بینک میں ایک نیا اکاؤنٹ کھلا ہے اور اس کے جاری کردہ کریڈٹ کارڈ سے یہ کیک خرید کے روز بھیجے جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ کون کر سکتا ہے؟''

''عصرہ!'' تالیہ کو یقین تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم کیسے اور کیوں' مگر صرف وہی میری دشمن ہے۔''

''اب آپ کیا کریں گی؟'' وہ فکر مند تھا۔

''تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔'' وہ مسکرا دی تو ایڈم نے گہری سانس لی اور موبائل پہ ایک فائل کھول کے اسکرین اس کے سامنے کی۔

''اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''میں یہ فائلز تمہاری ای میل میں دیکھ چکی ہوں' ایڈم۔ تم نے اس آف شور کمپنی کے بارے میں فاتح سے دریافت کیا؟''

''جی اور وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''پھر وہ سچ کہہ رہے ہوں گے۔ لیکن تمہاری تسلی کے لیے میں ان سے خود بات کروں گی۔''

''آپ کے پاس چار دن ہیں' چے تالیہ کیونکہ اس کے بعد میں اس فائل کو اپنی کتاب میں چھاپنے پہ مجبور ہوں گا۔''

تالیہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ''تم کیسے اسے چھاپ سکتے ہو جبکہ وان فاتح اس کمپنی سے انکاری ہیں؟''

''میں نے جن لوگوں کی آف شور کمپنیز پہلے منکشف کی تھیں' ان سے ان کا اقرار یا انکار نہیں مانگا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اشاعت کے بعد تردید کے لیے نہیں آیا۔ اگر وان فاتح کے پاس کوئی ثبوت ہے اور وہ اشاعت کے بعد لے آئیں تو میں اگلے ایڈیشن سے ان کا نام خارج کر دوں گا۔''

''وہ تمہیں کورٹ لے جائیں گے' ایڈم۔''

''میری فائل ثبوتوں کے ساتھ ہے۔ ان کے پاس جو ثبوت کورٹ کے لیے ہے' وہ مجھے ابھی دکھا دیں۔'' وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے انصاف کرنا تھا۔ سب دولت چھپانے والوں کے ساتھ ایک ہی برتاؤ کرنا تھا۔

''میں ان سے بات کروں گی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی بے اختیار ساتھ ہی اٹھا۔ ایک دم سے دھوپ میں اداسیاں گھل گئی تھیں۔

''لیکن تم میری آخری بات سنے بغیر ان کا نام کتاب میں نہیں ڈالو گے۔ ٹھیک؟''

وہ اب بھی اسی کا دفاع کر رہی تھی۔ ساری

ناراضیاں رنجشیں ایک طرف وہ اب بھی اپنے لیڈر کو تحفظ دے رہی تھی۔ ایڈم اداسی سے مسکرایا۔

"اگر آپ اس فائل کو جعلی ثابت کر دیں تو میں بہت خوشی سے اسے اپنے مسودے سے خارج کر دوں گا۔ آپ کے پاس چار دن ہیں۔"

تالیہ نے پرس اٹھاتے ہوئے ایک آزردہ نظر اس کے جرنل پہ ڈالی۔

یہ اس کتاب کا مسودہ تھا جو وان فاتح کا سیاسی کیریئر داغ دار کر سکتی تھی۔

ایک دفعہ پھر ان تینوں کی زندگیاں ایک کتاب سے متاثر ہونے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ سہ پہر اتر رہی تھی جب تالیہ نے اپنی کار باہر کھڑی کی۔ ہیٹ اتار کے فرنٹ سیٹ پہ رکھا' بال پونی میں جکڑے اور کوٹ کی شکنیں درست کرتی باہر نکلی۔

اس نے گھنٹہ پہلے واٹس ایپ پہ فاتح کو پیغام بھیجا تھا۔ "میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ ابھی۔ اسی وقت۔"

ایک مان سا تھا کہ وہ فوراً اس کے لیے وقت نکال لے گا۔ وہ جو اس کے پیچھے اس کے گھر آتا تھا۔ جو اس کے لیے خط لکھتا تھا۔ جو اس سے ای میلز میں پوچھتا تھا کہ وہ کب آئے گی' وہ اس کے لیے وقت ضرور نکالے گا۔

اس کا جواب دو منٹ کے اندر موصول ہوا تھا۔

"میں گھر پہ ہوں۔ ابھی آ جاؤ۔"

اس کے دل کی حالت تب سے عجیب ہی تھی۔ وہ گیٹ تک پہنچ گئی تھی مگر عجیب ہیجان میں مبتلا تھی۔

کیا پہلے کہنا تھا؟ گلہ؟ شکوہ؟ رکھائی کا اظہار؟ اور کیا نہیں کہنا تھا؟ کیا وہ بیگار ایا ملایو کا ذکر کرے گا؟ کیا اس کو کچھ یاد آیا ہو گا؟ وہ اتنے دن بعد اس سے ملنے جا رہی تھی' دل عجیب سا ہو رہا تھا۔

گارڈ نے اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ بٹلر اسے خوش آمدید کہتا سیدھا اندر لے آیا۔

"فاتح صاحب نے مجھے بلایا تھا۔" اس نے خوامخواہ وضاحت دی۔ بٹلر سر ہلا کے اسے سیڑھیوں کی طرف لے آیا۔

"آپ اوپر اسٹڈی میں بیٹھیں۔ میں ان کو بھیجتا ہوں۔"

وہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے زینے چڑھنے لگی۔

ان سیڑھیوں' ان دیواروں کے درمیان وہ کتنی دفعہ آئی تھی۔ عصرہ کی دوست سے لے کر فاتح کی چیف آف اسٹاف تک کا سفر اس نے کیسے طے کیا تھا' یوں لگتا تھا زمانے بیت گئے ہوں۔

اسٹڈی سرد تھی حالانکہ موسم میں ٹھنڈ واجبی سی تھی۔ وہ چپ چاپ کرسی پہ جا بیٹھی اور مقابل رکھی خالی بھوری سیٹ کو دیکھتے ہوئے جملے ترتیب دینے لگی۔ وہ وہاں کیوں آئی تھی؟ وہ خود بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ وہ نہیں پلٹی۔ پھر اس نے کن انکھیوں سے نووارد کو میز کے ایک طرف سے گزر کے اپنے سامنے آتے دیکھا تو وہ چونک کے اٹھی۔

"عصرہ!" تعجب سے ابرو اٹھائے۔ عصرہ محمود اپنی ازلی مسکراہٹ سجائے اس کرسی پہ براجمان ہو چکی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنائے' گردن میں موتی پہنے' وہ اب کرسی سے ٹیک لگائے سامنے کھڑی تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔

"کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو نا۔ آخر تم مجھ سے ملنے آئی ہو۔"

"میں...." وہ رکی۔ "فاتح صاحب نے مجھے بلایا تھا۔"

"نہیں۔ تم نے مجھے ٹیکسٹ کر کے ملاقات کا وقت مانگا تھا۔" عصرہ نے جتا کے کہتے ہوئے موبائل دکھایا جس پہ تالیہ کی ٹیکسٹ کھلی تھی۔

"یہ نمبر پچھلے ایک ہفتے سے میں استعمال کر رہی

ہوں۔ فاتح نے نمبر بدل لیا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

تالیہ نے ضبط سے گہری سانس لی۔ فاتح ہر دو ماہ بعد نمبر ضرور بدلتا تھا۔ مگر پہلی دفعہ اس کا پرانا نمبر عصرہ استعمال کر رہی تھی۔

"بیٹھو نا۔ ورنہ مجھے لگے گا کہ مجھے فاتح کی جگہ دیکھ کے تم پریشان ہو گئی ہو تالیہ۔"

"دراصل مجھے آپ سے بھی بات کرنی تھی۔" وہ گردن سیدھی رکھے واپس کرسی پہ بیٹھی۔ "اچھا ہوا موقع مل گیا۔"

"اوہ تمہارے کیکس کا شکریہ جو تم ہر روز بھیجتی ہو۔" عصرہ کو جیسے یاد آیا۔ تالیہ کے ابرو ناگواری سے بھنچے۔

"میں آپ کو کوئی کیک نہیں بھیجتی' مسز عصرہ۔ مجھے معلوم ہے میرے نام پہ کیک کون بھیج رہا ہے اور میں ضرور پولیس میں شکایت درج کرنے جاؤں گی۔" "اچھا۔ تم نہیں بھیجتیں؟ نام تو تمہارا ہی ہوتا ہے ان پہ۔" عصرہ پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جیسے مطمئن تھی۔ اس کا رویہ تالیہ کو الجھا رہا تھا۔

"میں ان کیکس کی تحقیق اور پولیس رپورٹ تو کروا دوں گی۔ کیوں نا ابھی ہم آریانہ کے بارے میں بات کر لیں۔"

عصرہ کے مطمئن تاثرات برقرار رہے مگر تالیہ نے دیکھا' وہ میز پہ رکھے ہاتھ کے ناخن سے لکڑی کھرچنے لگی تھی۔

"آریانہ کا کیا؟"

"مسز عصرہ....! آپ نے آریانہ کا قتل کیا تھا۔ ہم دونوں جانتے ہیں۔"

"کتنا بڑا الزام لگا رہی ہو تم مجھ پہ!" وہ افسوس سے بولی۔

"آریانہ کا خون آپ کے ہاتھ پہ ہے۔ خود پہ رحم کھائیں اور وان فاتح کو اپنے منہ سے بتا دیں۔ شاید وہ آپ کو معاف کر دیں۔ نہیں تو میں ان کو بتا دوں گی۔ ثبوت کے ساتھ۔"

وہ ٹھنڈے انداز میں بولی۔ نظریں عصرہ کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

"تالیہ تمہیں لگتا ہے تم یہ کر کے مجھ سے کچھ چھین لو گی؟ تم غلط ہو۔ تم پہلے ہی مجھ سے سب کچھ چھین چکی ہو۔ اب میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا۔"

پھر عصرہ اٹھی اور میز کے پیچھے سے نکل کے دروازے تک آئی۔ دروازہ پورا کھول دیا۔ پھر اسی اطمینان سے دیوار میں نصب شیلف تک آئی۔ ایک کرسٹل کا ڈیکوریشن پیس اٹھایا اور پلٹی۔

"تم میرے شوہر کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہو۔" وہ ایک دم غرائی تھی۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ تالیہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

"میں چاہتی ہوں آپ اپنے شوہر کو سچ بتا دیں۔"

عصرہ نے ہاتھ میں پکڑا پیس زور سے چوکھٹ

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

پہ دے مارا۔ وہ باہر سیڑھیوں کے پاس فرش سے ٹکرایا اور چکنا چور ہو گیا۔

"تم میرے شوہر کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہو؟"

اس نے دوسرا پیس اٹھایا اور اس طرف پھینکا۔ وہ تالیہ کی طرف چیزیں نہیں پھینک رہی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے کرسٹل کے پیس دروازے کے باہر پھینک رہی تھی۔

تالیہ نے تعجب سے اس کے انداز کو دیکھا۔

"میں تحمل سے بات کر رہی ہوں اور آپ....."

"نکل جاؤ تم یہاں سے اور میری زندگی سے۔ گیٹ لاسٹ تالیہ۔" وہ اونچی آواز میں چلا رہی تھی۔ ساتھ ہی چیزیں زوردار آواز کے ساتھ فرش پہ پھینک رہی تھی۔ البتہ یہ سب کرتے ہوئے اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

تالیہ نے تیزی سے پرس اٹھایا۔ "آپ جو بھی ڈراما کر رہی ہیں' آپ اس میں کامیاب نہیں ہوں گی۔" اور دروازے کی طرف بڑھی۔ عصرہ نے ہاتھ فضا میں روک لیا۔ جب وہ باہر نکل گئی اور سیڑھیاں اترنے لگی' تب عصرہ نے آخری پیس دیوار پہ دے مارا۔

تالیہ گلابی چہرے کے ساتھ زینہ اتر رہی تھی۔ ملازم لاؤنج میں اکٹھے ہوئے گردن اٹھائے سراسیمگی کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی کو بھی دیکھے بنا زینہ پھلانگتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

اوپر موجود عصرہ موبائل ہاتھ میں لیے سیڑھیوں کے دہانے پہ آ رکی اور نمبر ملا کے فون کان سے لگایا۔ ملازم ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ مگر اسے آتا دیکھ کے گڑبڑا کے تتر بتر ہونے لگے۔ البتہ انہوں نے جاتے وقت اپنی مالکن کی بھیگی آواز ضرور سنی تھی۔

"ہیلو..... دولت بھائی۔ کیا آپ ابھی میرے پاس آ سکتے ہیں؟ جی میں گھر پہ ہوں۔ ایمرجنسی ہے۔ مجھے... مجھے لگتا ہے کہ... تالیہ.... فاتح کی ایکس چیف آف اسٹاف... تالیہ مراد.... مجھے لگتا ہے... وہ فاتح کی جان لینا چاہتی ہے۔"

تیز سانسوں کے درمیان وہ بے ربط انداز میں کہہ رہی تھی۔

اس کی آواز نے فضا میں عجیب سا خوف بکھیر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر آئی تو دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ فاتح کا نیا نمبر اس کے پاس نہ تھا۔ البتہ ای میل ایڈریس موجود تھا۔ کیا وہ اسے ای میل کر دے؟ مگر پہلے اسے سب سے ضروری کام کرنا تھا۔

وہ پولیس اسٹیشن گئی اور ان کیکس کے خلاف رپورٹ لکھوا کے آئی۔ بینک کا ٹائم ختم ہو چکا تھا' اس لیے اس نے بینک جا کے درخواست دینا کل پہ موخر کیا اور گھر آ گئی۔ پھر سارے دروازے کھڑکیاں بند کر لیں اور کچن ٹیبل پہ اندھیرے میں موم بتی جلا کے بیٹھ گئی۔

اب ہر طرف تاریکی تھی اور درمیان میں موم بتی کا شعلہ چمک رہا تھا۔ وہ اس شعلے کو دیکھ کے سوچنے لگی۔

جیسے اسے مراد راجہ نے سوچنا سکھایا تھا۔ سارے خیالات کو ذہن سے جھٹک کے صرف اس شعلے پہ نگاہیں مرکوز کرنا اور ایک معاملے کو ہر زاویے سے دیکھنا۔

عصرہ کو وہ ڈراما کر کے کیا ملے گا؟

اگر وہ کیکس عصرہ ہی فاتح کو بھیج رہی تھی تو تالیہ کا نام لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

بدترین چیز کیا ہو سکتی تھی؟

شاید کیکس زہریلے تھے!

وہ چونکی۔

آف کورس۔ کیکس زہریلے تھے۔ سلو پوائزن۔ اگر وان فاتح مر جائے تو پارٹی کا صدر کون بنے گا؟

وہی جو نائب صدر ہے۔ یعنی عصرہ محمود۔

اگر وان فاتح مر جائے تو اگلا وزیر اعظم کون

بنے گا؟

بی این کے 'شہید' لیڈر کی بیوہ جو کہ پارٹی صدر ہوگی۔

وہ وان فاتح کی موت کے باعث ہمدردی کا ووٹ لے گی۔ وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کے پردھان منتری بنے گی اور کوئی اس پہ شک نہیں کرے گا کیونکہ کیک تو تالیہ مراد نے بھیجے تھے۔

اس نے ماتھے کو چھوا۔

تالیہ جیل جائے گی۔ فاتح قبر میں۔ اور عصرہ وزیر اعظم کی کرسی پہ براجمان ہوگی۔ پلان واضح تھا۔

اس نے پھونک مار کے موم بتی بجھائی اور اٹھ کے پردے کھول دیے۔ اندھیرے لاؤنج میں باہر جلے اسٹریٹ پولز کی مدھم روشنی اندر آنے لگی۔ اب وہ کیا کرے۔

پہلے اس نے فون نکالا اور فاتح کو ای میل بھیجی۔

''وہ کیکس میں نے نہیں بھیجے۔ ان کو مت کھائیں۔ میں آپ سے مل کے وضاحت کروں گی مگر پلیز ڈونٹ ایٹ دیم۔ وہ زہریلے ہیں۔''

سارے شکوے دور ہو گئے تھے۔ بلکہ بھول گئے تھے۔ اس کی پریشانی ہر گزرتے لمحے بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا اور ای میل کا جواب نہیں آیا۔

اسے کچھ کرنا تھا۔ وہ صبح تک کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

تالیہ مراد کو انتظار کرنا نہیں آتا تھا۔ اسے عصرہ کے پلان کو ابھی فیل کرنا تھا۔ وقت نہیں تھا۔

سارے کھیل وقت کے ہی تھے۔

وہ اپنے کمرے میں آئی اور الماری کھولی۔ سامنے اس کا جمپ سوٹ ہینگر پہ ٹنگا تھا۔ اس نے وہ سوٹ نوچ کے اتارا۔

(میں ایک بات جانتا ہوں۔ پرانی عادتیں نئے ارادوں سے پختہ ہوتی ہیں۔)

سیاہ جمپ سوٹ کے اوپر اس نے سیاہ ہڈ پہنی اور ٹوپی سر پہ ڈال دی۔ اب اس کا چہرہ اندھیرے میں آ گیا تھا۔

(آپ کو سیدھے دروازوں کی عادت نہیں ہے۔ آپ کے قدم خود بخود چور راستوں کی طرف اٹھتے ہیں۔)

ایک دراز سے اس نے چمک دار پھل والا خنجر نکالا اور جھک کے اسے پنڈلی سے باندھا۔ ٹائیٹس نیچے برابر کی اور بیڈ سر پہ گرائے وہ باہر نکلی۔

(آپ جتنی کوشش کر لیں' آپ اپنے اصل سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔)

باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ سرما کی بارش کے ایل کی ٹھنڈ میں اضافہ کر رہی تھی۔

اس نے ٹیکسی وان فاتح کی اسٹریٹ سے دو گلیاں چھوڑ کے روک دی تھی۔ وہ باہر نکلی تو بوندا باندی تیز ہو چکی تھی۔

(آپ کی زبان جھوٹ کی عادی ہے.....)

تیز قدموں سے چلتی وہ وان فاتح کی اسٹریٹ کے دہانے پہ آئی تو وہاں دن کی روشنی کا سماں تھا۔ تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ باہر پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینس کھڑی تھی۔

(آپ کے ہاتھ نقب لگانے میں ماہر ہو چکے ہیں.....)

وہ تیزی سے واپس بھاگی۔ اس کا رخ پچھلی گلی کی طرف تھا۔ وان فاتح کے گھر سے عین پچھلے گھر کی دیوار تک وہ آ رکی۔ یہ گھر خاموشی میں ڈوبے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

(جلد یا بدیر آپ کے سامنے دوبارہ سے وہی ترغیبات آئیں گی۔)

اس نے پچھلے گھر کی دیوار پھلانگی اور بیرونی زینے پہ کسی بلی کی طرح چڑھتی گئی۔ گھر کی چھت پہ پہنچ کے وہ بھاگتی ہوئی اس کونے تک آئی جو فاتح کے گھر سے ملتا تھا۔ صرف ایک کونا.... اور درمیان میں دو فٹ کا فاصلہ۔

(خواہش کے ہاتھوں یا خوف سے مجبور ہو کے

آپ کے قدم آپ کو ایک دفعہ پھر اسی راستے پہ لے جائیں گے۔)

اندھیرے میں کسی ہیولے کی طرح سیاہ بلی دوسری چھت پہ کود گئی۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ فاتح کے لان کے عین اوپر چھت پہ آرکی۔

(آپ کی انگلیاں ممنوعہ تالوں کی طرف بڑھیں گی اور آپ سوچے سمجھے بغیر ان کو کھولنا چاہیں گی۔ میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔)

لان میں پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ چند ملازم بھی افسوس اور شاک سے منہ پہ ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ کسی نے کسی کو کچھ بتایا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے انا للہ پڑھا۔

''موت کی وجہ کیا ہے؟''

''موت؟ مجھے تو یہ قتل لگتا ہے۔ قتل۔''

ٹوٹی پھوٹی سرگوشیاں کانوں میں پڑیں۔ اس کا دل جیسے اوپر حلق میں آنے لگا۔ وہ چھت سے نیچے کھلنے والے دروازے کی طرف دوڑی۔

دروازہ بند تھا مگر وہ جانتی تھی کہ لاک کس نوعیت کا ہے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے پن اندر ڈالی اور کھولنے لگی۔ بارش مسلسل تیز ہو رہی تھی۔ پانی کے باعث اس کے ہاتھوں سے پن بار بار پھسل رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بھی بہنے لگے تھے۔ کیا اسے دیر ہو گئی تھی۔ کیا عصرہ اپنا کام کر چکی تھی؟

دروازہ کھلا تو وہ بنا آہٹ کے اندر داخل ہوئی۔ یہ کاریڈور ویران اور خاموش پڑا تھا۔ بتی البتہ روشن تھی۔ اس نے ایک بتی بند کی (اور باقی جلی رہنے دیں تاکہ نیچے کسی کو علم بھی نہ ہو اور وہ اندھیرے میں رہے)۔ کاریڈور کے دہانے پہ سیڑھیاں تھیں۔ وہ چھت کے دروازے کے ساتھ دیوار سے لگی ریلنگ کی طرف بڑھنے لگی۔

جہاں سے ریلنگ شروع ہوتی تھی، وہاں تالیہ رکی۔ اور سر ذرا سا جھکایا۔

نیچے لاؤنج میں مجمع لگا تھا۔ دائرے کی صورت چند افراد وہاں کھڑے تھے۔ تالیہ نے بے چینی سے ایک ایک کا چہرہ دیکھا۔

ایک دولت تھا۔ اس کے ساتھ موجود دو افراد کو وہ نہیں پہچانتی تھی۔ وہ ایک اسٹریچر کے گرد کھڑے تھے۔ اسٹریچر پہ رکھی باڈی پہ سفید کپڑا پڑا ہوا تھا۔ تالیہ نے لبوں پہ سختی سے ہاتھ جما لیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' اسے اشعر کی آواز سنائی دی۔ گردن مزید جھکائی تو وہاں سر جھکائے کھڑا ہکا بکا سا اشعر دکھائی دیا۔

دولت نے سر جھکائے باڈی کے چہرے سے کپڑا سرکایا۔

''زہر دینے کا کیس لگتا ہے۔'' دولت نے اپنے سامنے کسی کو مخاطب کیا۔ تالیہ مخاطب کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے مزید آگے سرکی۔ اور تب اسے وہ نظر آیا۔

وان فاتح ..... جو دولت کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ کسی تھکے ہارے انسان کی طرح زرد تھا اور وہ جیسے بہت ہمت سے وہاں کھڑا تھا۔

''زہر؟'' فاتح نے بھنویں بھینچے ضبط سے دہرایا۔ اسی اثناء میں دولت نے نعش کے چہرے سے کپڑا الٹ دیا۔

''ان کے چہرے سے یہی لگتا ہے کہ مسز عصرہ کو کسی نے زہر دے کر مارا ہے۔''

تالیہ کا لبوں پہ جما ہاتھ بے یقینی سے نیچے جا گرا۔ وہ بالکل سن رہ گئی تھی۔

نیلاہٹ مائل سفید چہرے اور بند آنکھوں والی عصرہ کی نعش اسٹریچر پہ بے سدھ پڑی تھی۔

''کاکا کے ساتھ کون کر سکتا ہے یہ؟'' اشعر کا سر دونوں ہاتھوں میں گرا تھا۔

''ایک ہی نام ذہن میں آتا ہے۔'' دولت نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔ ''ملازم کا کہنا ہے کہ مسز عصرہ نے صبح ایک چاکلیٹ کیک کھایا تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے وہ کس نے بھیجا تھا؟''

اشعر نے چونک کے سر اٹھایا "کیک؟ وہ تو شاید تالیہ بھیجتی تھی۔"

"بالکل۔ اور مسز عصرہ کو شک تھا کہ وہ وان فاتح کو مارنا چاہتی ہے۔ مگر وہ غلط تھیں۔ تالیہ کا پلان وہ نہیں تھا جو میں سمجھا تھا۔"

وہ غلط تھی۔

عصرہ کا پلان وہ نہیں تھا جو وہ سمجھی تھی۔

"میرا خیال ہے کیک زہریلے تھے۔" دولت انکشاف کر رہا تھا۔

(وہ غلط تھا۔ کیک زہریلے نہیں تھے۔ زہر کیکس کے اندر نہیں تھا۔)

"مگر وہ کیک تو میں نے بھی کھائے تھے۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔" فاتح کی درشت آواز سنائی دی تھی۔

"ہمیں آپ کا بھی چیک اپ کروانا پڑا گا۔ ہوسکتا ہے آپ کو ابھی تک زہر نے اس طرح سے متاثر نہ کیا ہو مگر مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے خون سے بھی ضرور ملے گا۔"

ہاں... زہر اس کے خون سے بھی ملے گا مگر بہت تھوڑا.... کیونکہ عصرہ کو وان فاتح کی جان نہیں لینی تھی۔

اس ایک لمحے میں تالیہ مراد کو پلان سمجھ میں آ گیا تھا۔

کیک زہریلے نہیں تھے۔ وہ زہر روزمرہ کی چیزوں میں ہلکا سا فاتح کو اور زیادہ سا خود کو دے رہی تھی۔ صرف آخری کیک شدید زہریلا تھا جو وہ فاتح کے گھر آنے سے پہلے کھا چکی تھی۔ اس کے بچوں نے بھی کیک نہیں چکھے تھے، اس لیے ان کے خون سے زہر نہیں ملے گا۔ وہ اپنے بچوں کو کیک نہیں چکھنے دیتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ کیکس میں زہر تھا۔ وہ زہریلی چیز یوں سامنے کبھی نہیں رکھے گی۔ بلکہ اس لیے کہ جب بچوں کے خون سے آرسینک کے اثرات نہ ملیں تو اس کی وجہ سب کو یہی لگے کہ بچوں نے کیک نہیں کھائے تھے۔

عصرہ محمود کو وہ جان لیتا تھی جو اس کو سب سے زیادہ محبوب تھی۔

عصرہ محمود کی اپنی جان۔

دولت اب سپاٹ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

"مسز عصرہ نے آخری گفتگو میں تالیہ مراد پہ شک کا اظہار کیا تھا۔ ان کا یہ بیان قانونا ثبوت کے طور پہ استعمال کیا جائے گا۔ میں تالیہ مراد کے اریسٹ وارنٹ نکلوا رہا ہوں مگر مجھے امید ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھر نہیں ملے گی۔ آج سے وہ ایک fugitive ہے۔"

وہ اپنی ٹیم کو ہدایت دے رہا تھا اور وہ سن سی اوپر کھڑی تھی۔

اور تبھی فاتح کی نظر اوپر اٹھی۔ وہ اس کا گھر تھا۔ کسی کی موجودگی کا احساس اسے سب سے پہلے ہوا تھا۔ اس نے گردن ہلائے بغیر اوپر دیکھا جہاں وہ کسی سائے کی طرح کھڑی تھی۔

ایک لمحے کو ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تالیہ نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اپنی بے گناہی کی گواہی اور کس طرح دے؟

اور فاتح..... اس نے ایک نظر نعش کو دیکھتے دولت کو دیکھا اور دوسری اوپر تالیہ پہ ڈالی۔ پھر آنکھوں سے ایک مخفی سا اشارہ کیا۔

جیسے کہہ رہا ہو۔ "بھاگ جاؤ' تالیہ۔ بھاگ جاؤ۔"

اس کے قدم پیچھے کو اٹھنے لگے۔

لباس سے بارش کے قطرے فرش پہ گرے۔

گیلے سیاہ ربڑ کے جوتوں سے چیں چیں کی آواز آنے لگی۔

تالیہ نے گردن جھکا کے اپنے جوتوں کو دیکھا۔ ٹخنے پہ لگے کمان صورت زخم پہ کھرنڈ بن چکا تھا۔

چیں چیں کی آواز پہ چونک کے دولت نے سر اٹھایا اور اوپر دیکھا۔

"اوپر کون ہے؟" ایک ساتھ سب کی گردنیں

اونچی ہوئیں۔
وہ کونا اب خالی تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔
''دولت... مجھے عصرہ سے ہونے والی آخری گفتگو کے بارے میں بتاؤ۔'' وان فاتح نے اسے نخی سے مخاطب کیا تو دولت کا دھیان اوپر سے ہٹا۔ وہ اب فاتح کو دیکھتے ہوئے سارا قصہ دہرانے لگا تھا۔
''دوپہر میں مجھے عصرہ کی کال آئی تھی۔ انہوں نے مجھے بلایا تھا۔ اور جب میں آیا تو...''
باہر اندھیری رات میں سیاہ بلی کسی چھلاوے کی طرح ایک چھت سے دوسری چھت پھلانگ رہی تھی۔
اس کے آگے صرف تاریکی تھی اور نیچے گہری کھائی۔

☆☆☆

''ساکوراہانامی''
"The Viewing of Cherry Blossom Season
اس نے دیکھا.....
وہ گھاس پہ نصب بنچ پہ بیٹھا ہے.....
سڑک کنارے دور تک چیری بلاسم کے درختوں کی قطار ہے...
اور وہ گلابی نرم پھولوں سے لدے ہیں....
نیچے گھاس پہ بھی گلابی پنکھڑیوں کی تہہ بچھی ہے...
سامنے ایک جاپانی بچہ باپ کی انگلی پکڑے چل رہا ہے.... اس کے ہاتھ میں کاٹن کینڈی ہے جس کی اسٹک کو وہ گھما رہا ہے.... اس کے جوگرز سے چلتے وقت گھنگھرو کے چھنکنے کی آواز آتی ہے...
وہ اس کے ساتھ بنچ پہ آ کے بیٹھتی ہے تو وہ چونکتا ہے۔
بنچ پہ رکھی کافی اٹھانے لگتا ہے جو چھلک جاتی ہے... گرم مائع گھاس پہ گرے ایک پھول کو داغ دار کر دیتا ہے...
اسی پل بنچ کے پیچھے کھڑا چیری بلاسم کا درخت ہوا کے جھونکے کے ساتھ ڈھیروں پھول ان دونوں پہ گرا دیتا ہے...
کچھ پھول اس کے کوٹ پہ گرتے ہیں اور کچھ عصرہ کے بالوں پہ.....

☆☆☆

عصرہ بنت محمود کی موت سے دو روز قبل۔
بی این کے چیئرمین آفس کی کھڑکیوں کے بلائنڈز ہٹے ہوئے تھے اور اندر سرما کی دھوپ پھیلی تھی۔ کنٹرول چیئر پہ وان فاتح آگے کو ہوئے بیٹھا' ایک فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ آنکھوں پہ چشمہ لگائے' وہ جیل سے بال دائیں طرف جمائے' سرمئی سوٹ میں ملبوس کام میں مصروف نظر آتا تھا جب دروازہ دستک کے بعد کھلا۔ فاتح نے عینک کے اوپر سے صرف نگاہ اٹھا کے دیکھا۔
اس کی سیکرٹری ایک فولڈر اٹھائے اندر آئی تھی۔
''سر..... میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی مگر آپ نے نمبر بدل لیا ہے تو آپ کے دوست ڈاکٹر..... (فولڈر سے نام پڑھا) ڈاکٹر دین جمال کی مجھے کئی دفعہ کال آئی ہے۔ ان کو آپ کا نیا نمبر دے دوں؟''
''ہاں دے دو۔ بلکہ اسے کال بیک کر کے مجھے ملا دو۔'' میز پہ رکھے فون کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کے مڑی تو فاتح بولا۔
''تالیہ کی کال تو نہیں آئی؟''
''تالیہ مراد؟ نہیں سر۔''
''اگر آئے تو اس کو میرا نیا نمبر دے دینا۔'' تاکید کی تو وہ سر کو اثبات میں خم دے کر مڑ گئی۔
فون کی گھنٹی بجی تو فاتح نے عینک اتاری اور ریسیور کان سے لگایا۔
''میں تمہیں کال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ تم نے مجھ سے میڈیکل سائنس کے معجزے کا وعدہ کیا تھا۔'' وہ اب کرسی پہ پیچھے کو ہو کر بیٹھا مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

''اور میں اپنے وعدے اور دعوے پہ قائم ہوں۔ میں نے تمام پروسیجر کی تیاری کر لی ہے۔ تمہارے ہرے سگنل کا انتظار ہے۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ میری اس ایک رات کی یادداشت واپس آسکتی ہے؟'' وہ گہری سانس خارج کر کے مسکرایا۔

''ہاں البتہ.....'' وہ ہچکچایا۔ ''یہ عمل خطرناک بھی ہوسکتا ہے اور.....''

''بے فکر رہو۔ میں ہر طرح کا consent فارم سائن کر دوں گا۔''

وہ جانتا تھا کہ ہر ڈاکٹر کی طرح اس کا سب سے بڑا خدشہ یہی ہوسکتا تھا۔

''میرے لیے وہ رات بہت اہم ہے اور اس کو واپس لانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''فاتح!'' ڈاکٹر دین نے گہری سانس لی۔ ''اس عمل کو صرف اپنے سکون اور ذہنی شفی کے لیے کرو۔ اس کو ایک محبت کا شکار مرد کی طرح نہ کرو۔ اگر وہ لڑکی تمہاری زندگی سے چلی گئی ہے اور تمہیں کال تک نہیں کر رہی تو وہ اس رات کو یاد کرنے سے تمہیں واپس نہیں مل جائے گی۔''

فاتح کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا۔ پھر وہ دوبارہ فائل نہ اٹھا سکا۔ بلکہ کافی منگوائی اور کرسی کا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا اور باہر پھیلی سرما کی دھوپ دیکھنے لگا۔

''سر..... ڈاکٹر دین نے آج سہ پہر کا وقت فائنل کیا ہے۔ ٹھیک ہے؟'' سیکرٹری کارمن کی آواز عقب میں سنائی دی۔

''ہاں دے دو۔'' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھے چیئرمین نے باہر جھانکتے ہوئے ناک سے مکھی اڑائی۔ اس کے ماتھے پہ بل سے پڑ گئے تھے۔

''کچھ اور جو میں کر سکوں سر؟'' اس کو الجھن میں دیکھ کے کارمن نے پوچھا۔ وہ گول چہرے اور سفید رنگت والی چینی لڑکی تھی جو گلابی لپ اسٹک کے ساتھ گلابی اور سفید رنگ کا اسکرٹ بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔

''محبت کا شکار آدمی کیسا ہوتا ہے؟'' رک کے اضافہ کیا۔ ''تمہارے نزدیک۔''

''محبت' محبت میں فرق ہوتا ہے' سر۔ اس کو اکثر لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے۔''

اس کی بات پہ وہ ہلکا سا مسکرایا اور کرسی کا رخ اس کی طرف موڑا۔ جیسے استاد کو کسی نئے شاگرد کی اپنے قد سے اونچی بات نے محظوظ کیا ہو۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی آرٹسٹک ہو۔ تم بی این میں کیا کر رہی ہو؟''

کارمن نے افسوس سے گہری سانس خارج کی۔ ''یہی تو مسئلہ ہے' سر۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاسی عہدوں پہ پہنچنے والے محبت کا شکار نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ کی نظر میں یہ جذبہ انسان کو کمزور بناتا ہے۔''

''کیا یہ درست نہیں ہے؟'' اس نے شانے اچکائے۔ ''جب تم میری عمر اور میرے تجربے کو پہنچو گی تو جانو گی کہ اس مقام پہ انسان کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔'' وہ سادگی سے کارمن کی آنکھوں کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

''اس مقام پہ کیا ہوسکتا ہے پھر؟''

فاتح نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ''کوئی آپ کے لیے اہم بن سکتا ہے۔ اس کی حفاظت اور خوشی اہم بن سکتی ہے۔ اس کی فکر کرنا ترجیح ہوتا ہے۔ ایک اچھی دوستی۔ بس۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

''سر!'' وہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ''تو محبت اس کے علاوہ ہوتی ہی کیا ہے؟''

وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکا۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

''میرے نزدیک محبت کا شکار آدمی وہ ہوتا ہے کارمن! جو اندھا دھند کسی کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ بے چین ہو۔ باقی ساری دنیا سے غافل۔ صرف ایک انسان کا حصول اس کا مقصد ہو۔''

"وہ جنون ہوتا ہے سر۔ اور جنون کا شکار لوگ محبوب کے حصول کے لیے ہر حد پار کر لینے کو محبت سمجھتے ہیں۔"

"اور محبت کیا یہی نہیں ہوتی؟"

"نہیں سر۔ محبت ایسی نہیں ہوتی۔ وہ تو انسان کو بدل دیتی ہے۔ اسے نرم بناتی ہے۔ اسے دوسرے انسانوں کی قدر کرنا سکھاتی ہے۔ انسان کو اچانک دنیا کی ہر شے میں خوبصورتی دکھائی دینے لگتی ہے۔ پھولوں کے رنگوں میں۔ بادلوں کی نرمی میں۔ تب احساس ہوتا ہے کہ خدا نے سب کچھ کتنی محبت سے بنایا ہے۔"

"اور؟" وہ دلچسپی سے چینی لڑکی کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے کھڑی مسکرا کے بتا رہی تھی۔

"اور وہ محبت میں گرفتار دوسرے انسانوں کو پہچاننے لگتا ہے، ان کے لیے خوش ہوتا ہے۔ وہ ہر حد پار کرنا سیکھ جاتا ہے لیکن کسی کو پانے کے لیے نہیں..... بلکہ دوسرے کو آرام دینے کے لیے، اس کو خوش اور محفوظ رکھنے کے لیے۔ محبت خودغرض نہیں ہوتی۔ آبسیشن خودغرض ہوتا ہے۔ جنونی کو اپنے محبوب کی توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ ہر وقت۔ محبت تو کیئرنگ ہوتی ہے۔ صرف دوسرے کی فکر کرنے والی..... دوسرے کے لیے زندگی کو آسان بنانے والی....."

وان فاتح نے مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے کافی کا کپ اٹھایا۔ "گرل..... یو آر ان لو!"

اس نے جیسے فیصلہ سنایا تھا۔ کارمن نے مسکرا کے ٹرے اٹھائی۔ "میں نے کہا نا، صرف محبت میں گرفتار شخص ہی کسی دوسرے محبت کرنے والے کو پہچان سکتا ہے۔" اور واپس مڑ گئی۔ فاتح کی مسکراہٹ مدھم پڑی۔ ایک دم ساری فضا اداس ہو گئی تھی۔

اس نے فون اٹھایا اور کارمن سے کہا کہ وہ ڈاکٹر دین کا نمبر ملائے۔

"دین!" رابطہ ملنے پہ وہ قدرے سپاٹ انداز میں کہنے لگا۔ "آئی ایم سوری مگر میں کسی سائنسی تجربے کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔"

"مگر..... تم نے کہا تھا کہ تم اس رات کو یاد کرنا چاہتے ہو۔"

"اس سے کچھ نہیں بدلے گا۔ شاید چیزیں مزید خراب ہو جائیں۔ اس رات کو بھول جانے میں ہی عافیت ہے۔"

اس رات عرصے بعد اس نے عجیب سا خواب دیکھا۔

وہ پولیس اسٹیشن سے نکلتا ہے..... اس نے گردن میں کوئی بھاری لاکٹ پہن رکھا ہے۔ اس سے ایک سنہری پنکھ نکل کے اس کو راستہ دکھاتا اڑتا جا رہا ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں قدم اٹھا رہا ہے۔ منظر دھندلا ہے مگر ایک چیز واضح ہے..... اس نے ایک سنسان گلی کا موڑ مڑا ہے۔ یہ گلی جلال مسجد کے دائیں جانب ہے..... نیلی اینٹوں کی دیواریں..... باہر ایک ٹوٹا ہوا گملا..... وہ ایک گھر کے دروازے تک جاتا ہے..... وہاں سنہری پنکھ ڈور میٹ پہ گر جاتا ہے..... وہ نظریں اٹھا کے گھر کا نمبر دیکھتا ہے..... دھندلی بصارت کے باوجود اسے آدھا نمبر نظر آ جاتا ہے.....

وہ چونک کے اٹھا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کے سائیڈ لیمپ جلایا تو مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ عصرہ کروٹ لیے سو رہی تھی۔ فاتح اٹھ بیٹھا اور اپنی پیشانی چھوئی۔ اسے پسینہ آ رہا تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس رات کی کوئی ایسی یادداشت اس کے ذہن سے ٹکرائی تھی جس کا حقیقت سے تعلق لگتا تھا۔ باقی سب تو عجیب سے خواب تھے۔ جنگل میں تالیہ کے ساتھ..... کبھی قید خانے میں زخمی حالت میں موجود ہونا..... مگر یہ..... یہ جگہ یہ گلی وہ پہچانتا تھا۔ اگر وان فاتح اس رات کہیں گیا تھا تو وہ یہ گھر تھا۔

کسی معمول کی طرح وہ اٹھا اور بتی جلائی۔ جب تک عصرہ کی آنکھ کھلی، وہ تیار کھڑا بیگ میں کپڑے ڈال رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

''تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟''

''ملاکہ۔'' وہ سر جھکائے اب والٹ میں اپنے کریڈٹ کارڈز دیکھ رہا تھا۔ عصرہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''ایک دم وہاں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''ضروری کام ہے۔''

وہ تھکا ہوا بھی لگتا تھا جیسے کچی نیند سے جاگا ہو۔ بار بار گردن کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ عصرہ اٹھ بیٹھی اور چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہاں تالیہ ہے کیا؟''

فاتح کے بیگ کی زپ چڑھاتے ہاتھ رکے۔ چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

''اگر ہے بھی تو؟'' اسے جیسے یہ بات ناگوار گزری تھی۔

''تم کب تک اس کے پیچھے بھاگتے رہو گے؟''

فاتح سیدھا کھڑا ہوا اور گہری سانس لی۔ جیسے غصہ آیا ہو مگر ضبط کر گیا ہو۔

''عصرہ.... میری زندگی تالیہ کے گرد نہیں گھومتی۔ میں اس سے ہٹ کے اپنے کام کے لیے بھی کہیں جا سکتا ہوں۔''

''اپنے دل سے پوچھو۔ اس کام کا تعلق بھی کہیں نہ کہیں تالیہ سے جڑا ہوگا۔'' اس کی فاتح پہ جمی آنکھوں میں گلابی نمی تیرنے لگی۔ ''ہمیں کیا ہو گیا ہے فاتح؟ ہمارے گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے؟''

وہ چند لمحے وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا' پھر کندھے ذرا سے اچکائے۔

''ہم ویسے ہی ہیں جیسے اتنے سالوں سے تھے۔ کیا بدلا ہے؟''

''ہاں اور اتنے سالوں سے ہم ایک مردہ زندگی ہی گزار رہے ہیں۔''

''میں جاؤں؟'' وہ ذہنی طور پہ کہیں اور الجھا تھا۔ بیگ اٹھائے بولا تو وہ بستر سے اتری اور ایک دم اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''مجھے معلوم ہے تم اسے ڈھونڈنے جا رہے ہو۔ تم کب تک اس کے پیچھے جاتے رہو گے' فاتح۔''

''میں اپنے کام سے جا رہا ہوں' عصرہ۔'' اب کے اس نے تحمل سے کہا تھا۔ مگر عصرہ کی اس پہ جمی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔

''کیا نہیں ہے تمہارے پاس؟ بیوی' بچے۔۔۔ اور بہت جلد حکومت بھی۔۔۔ تم اس سب کو اس عورت کے لیے داؤ پہ لگا سکتے ہو؟''

''میں نے ایسا کیا کیا ہے جو مجھے یہ سب کھونا پڑے گا؟'' اس نے ماتھے کو چھوا۔

''تم آدھی رات کو اس کے پیچھے اچانک سے سب چھوڑ کے جانے لگو گے تو میں خوفزدہ ہوں گی' فاتح۔''

وان فاتح نے گہری سانس بھری اور افسوس سے اسے دیکھا۔ ''میں نے اپنی یہ زندگی (اطراف میں نگاہ دوڑائی) برسوں کی محنت سے بنائی ہے۔ میں اس زندگی کو نہ تالیہ کے لیے چھوڑوں گا' اور نہ ہی تمہارے لیے۔'' سختی سے کہا اور ابرو سے اسے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ نہیں ہٹی۔ ضدی' گیلی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

''مت جاؤ۔ آج مت جاؤ۔ پلیز۔'' آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ ''میرے لیے آج یہ سارے کام ترک کر دو!''

''ہم ایک دوسرے کے لیے ایسی قربانیاں کب سے دینے لگے ہیں' عصرہ؟'' وہ زخمی انداز میں بولا تو عصرہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔ گال سرخ دہکنے لگے۔

''میں نے تمہارے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اپنا کیریئر چھوڑا ہے۔ تمہارے بچوں کو پالا ہے۔ تمہاری بہن کو پالا ہے۔ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟''

''اور کیا میں نے تمہیں پارٹی کی نائب چیئرمین کا عہدہ نہیں دیا؟ گھر نہیں دیا۔ عزت نہیں

دی؟"

"تم نے مجھے محبت نہیں دی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تو فاتح نے گہری سانس لی۔

"وہ تو میں نے خود کو بھی عرصہ ہوا نہیں دی۔" وہ ایک طرف سے نکلا اور آگے بڑھ گیا۔ عصرہ نے بھیگی آنکھوں سے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"اسے تو دی ہے۔ نہ دی ہوتی تو روز تمہارے لیے وہ تحفے نہ بھیجتی۔"

"وہ کیک تالیہ نہیں بھیجتی۔" وہ عام سے لہجے میں کہتا لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عصرہ محمود کا سانس اور آنسو ایک ساتھ رکے۔ وہ چونک کے پلٹی۔

"تمہیں کیسے معلوم؟"

وہ دروازے تک پہنچ کے رکا اور مڑ کے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔ "وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی... میری میلز کا جواب نہیں دے رہی.... تو وہ مجھے ایسے گیفٹس کیوں بھیجے گی جب کہ اسے معلوم ہے کہ مجھے اتنا میٹھا نہیں پسند؟"

سادگی سے بتا کے وہ مڑ گیا۔ اس کے گھر روز فینز اور دوستوں کی طرف سے تحائف آتے تھے۔ زیادہ تر مفاد پرست عزیز و اقارب کی طرف سے ہوتے تھے۔ اس کو پرواہ نہیں تھی کہ کوئی تالیہ کے نام سے کیک کیوں بھیجتا ہے۔ اسے صرف ایک پہیلی کو حل کرنا تھا۔

اس رات وہ کس کے گھر گیا تھا؟

دروازہ بند ہونے کی آواز پہ عصرہ نے آنسو ہتھیلی کی پشت سے رگڑے۔ اس کی رنگت سفید پڑنے لگی تھی۔

وہ چند دن قبل تالیہ کے منہ سے یہ اعتراف سن کے کہ وہ فاتح کی پہلی بیوی ہے، اپنا سب کچھ کھو چکی تھی اور اسے لگا تھا کہ یہ سب آسان ہوگا جو وہ کرنے جا رہی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اسے دکھ نہیں ہوگا۔

مگر وہ ہر روز فاتح کو نئے سرے سے کھو دیتی تھی۔

وہ جو بھی کر لے وہ اس کے ہاتھ سے پھسل جاتا تھا۔ بلکہ اب تو سارا کھیل اس کے ہاتھ سے پھسل رہا تھا۔

وہ وہیں دیوار کے ساتھ نیچے بیٹھتی چلی گئی اور سر گھٹنوں پہ گرا لیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ شاید اسے یہ نہیں کرنا چاہیے۔ شاید اسے کچھ اور کرنا چاہیے۔ مگر اب شاید دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ملاکہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کے گیا تھا۔ وہی سمندر کی وجہ سے فضا کا نم ہونا.... وہی چائے خانوں کی خوشبو.... وہی بازاروں کا شور.... وہ تنہا گاڑی چلاتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ سیدھا اپنے گھر نہیں گیا۔ اس کا رخ اس مسجد کی طرف تھا جو اس نے اس خواب میں دیکھی تھی۔

آگے کا راستہ آسان تھا۔ وہ ان گلیوں سے شناسا سا تھا۔ اس شہر میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ یہاں قریب ایک دکان تھی جہاں وہ بہت آیا کرتا تھا۔

کار ایک جگہ روک کے فاتح باہر نکلا تو عام دنوں سے مختلف نظر آتا تھا۔ سیاہ پینٹ پہ سیاہ جیکٹ پہنے' اس کے بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور متلاشی نظریں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اندھیری سڑک کو پولز کی روشنی نے منور کر رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ آگے قدم اٹھانے لگا۔

بہت عرصے بعد وہ اپنی سیکیورٹی کے بغیر یوں باہر نکلا تھا۔ ملاکہ میں مجمعے کے اندر سے کتاب نکالنے والے دنوں کے بعد وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ کے ایل کے شور ہنگامے سے دور یہ پرسکون شہر اس کے دل کو عجیب طرح سے کھینچتا تھا۔ جانے کیا تھا جو اس شہر میں کھویا تھا۔ کیا تھا جس کا گواہ سمندر کا پانی تھا اور آسمان تھا، یہ راستے تھے.... مگر صرف وہی نہیں جانتا تھا....

مطلوبہ دروازے پہ وہ رکا اور ڈورمیٹ کو دیکھا۔ آج وہاں کوئی سنہری پنکھ نہیں تھا۔ باقی سب ویسا ہی تھا۔ آدھی رات کو وہ کسی کے گھر دستک کیسے

دے؟ فجر کا انتظار کرے؟ وہ سوچ ہی رہا تھا جب دروازہ کھل گیا۔ فاتح نے تعجب سے ابرو اٹھائے۔

چوکھٹ میں ایک لمبی قمیص اور کرتا پہنے' کمر پہ کپڑا باندھے' چمکتی آنکھوں والا آدمی کھڑا تھا۔ وہ جیسے اس کے انتظار میں تھا۔

"خوش آمدید' وان فاتح۔ آج آپ کو کیا چیز میرے دروازے پہ دوبارہ کھینچ لائی؟" وہ مسکرا کے پوچھ رہا تھا۔

"دوبارہ؟" وان فاتح کے دل میں کچھ ڈوب کے ابھرا۔ اس کو اس گمشدہ رات کا پہلا اشارہ ملا تھا۔ وہ واقعی اس گھر میں آیا تھا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں کیا؟" تیوری چڑھائے سپاٹ سے انداز میں پوچھا تو جادوگر نے راستہ دے دیا۔

اس گھر میں اگربتیوں کی عجیب سی مہک تھی۔ جگہ جگہ موم بتیاں روشن تھیں۔ جو ایک آدھ بلب جل رہے تھے وہ باہر سے نمک کے بنے تھے۔

"میں ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آیا تھا؟"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں فرشی نشست پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے اور درمیان میں لکڑی کی چوکی نما نیچی میز تھی۔

"جی' وان فاتح۔ آپ سولہ جولائی کی رات کو میرے پاس آئے تھے۔" آدمی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

فاتح نے جواب میں پہلے ایک طائرانہ نظر دیوار کی طرف دوڑائی جہاں مختلف شیلف بنے تھے اور ان میں بوتلیں رکھی تھیں۔ پھر اس آدمی کو دیکھا۔

"کون ہو تم؟ اور تمہارے پاس میں کیوں آیا تھا؟"

"میں تالیہ کا ایک عزیز ہوں۔ اس کے بچپن کا دوست اور آپ مجھے اس کے لیے ایک پیغام دینے آئے تھے۔ آپ کو ڈر تھا کہ صبح تک آپ یہ بات بھول جائیں گے۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہیں تالیہ کے لیے کوئی پیغام دیا تھا؟"

آدمی نے سر اثبات میں ہلایا۔

"اور مجھے کیوں لگتا تھا کہ میں وہ بھول جاؤں گا؟"

آدمی نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیے۔ "میں نہیں جانتا۔"

چند لمحے کے لیے پراسرار دیوان خانے میں خاموشی چھا گئی۔ موم بتیاں قطرہ قطرہ پگھلتی رہیں۔ اگربتیاں سلگتی رہیں۔

"کیا پیغام دیا تھا میں نے؟"

جواباً اس آدمی نے چوکی پہ رکھا دستہ اٹھایا۔ پہلے صفحے پہ قلم سے کچھ لکھا اور پھر صفحہ پھاڑ کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ فاتح نے اچنبھے سے اسے تھاما۔ اس پہ چند ہندسے لکھے تھے۔

"ان نمبرز کا کیا مطلب ہے؟"

"اگر آپ چاہتے کہ میں اس پیغام کو سمجھ لوں تو کبھی اس کو ہندسوں کی صورت نہ لکھتے۔"

وہ چند لمحے کے لیے اس کاغذ کو دیکھتا رہا۔

"دیٹس اِٹ؟"

"دیٹس اِٹ!"

"کیا تم نے اسے یہ پیغام دیا تھا؟"

"جی۔ میں نے امانت پہنچائی تھی۔" اس آدمی کی چمکتی نظریں فاتح کے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔ اسے اس ماحول سے عجیب اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ یہاں نہیں بیٹھنا چاہتا تھا مگر ایک سوال ابھی اسے مزید پوچھنا تھا۔

"اس رات کیا ہوا تھا؟"

"میں آپ کی اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا' وان فاتح۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا اسے صاف انداز میں جانے کو کہہ رہا ہو۔ وہ باہر آیا تو گلی تاریک پڑی تھی۔ اردگرد مخروطی چھتوں والے گھر تھے اور سرمئی نیلی اینٹوں والی دیواریں تھیں۔

وہ اس چٹ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

"کیا آپ کو اس کی بات پہ یقین ہے؟"

آواز پہ وہ رکا۔ آہستہ سے گردن موڑی تو سفید فراک والی بچی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ بہت دن بعد فاتح کھل کے مسکرایا تھا۔

"ہاں..... کیونکہ ایسا پیغام میں ہی لکھ سکتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے؟"

وہ دونوں اس ٹھنڈی رات میں ساتھ ساتھ قدم اٹھانے لگے۔

"جی ڈیڈ۔ یہ شفٹ سائفر ہے جس میں میں آپ کو پیغام لکھا کرتی تھی اور آپ کے کمرے میں چھپا دیتی تھی۔"

اتنے عرصے بعد اسے ایسی سکون آور تنہائی ملی تھی۔ وہ سڑک کنارے ایک چوکی پہ بیٹھا اور موبائل نکالا۔ اسکرین آن کی تو نیلی روشنی نے اس کا چہرہ منور کر دیا۔ وہ اب ایک ایک ہندسے کے مطابق حروفِ تہجی موبائل میں لکھ رہا تھا۔ پورا فقرہ مکمل ہوا تو اس نے ہر لفظ کو پہلے ایک ہندسہ پیچھے شفٹ کر کے دیکھا۔ وہ مبہم رہا۔ اس نے ایک حرف آگے شفٹ کیا تو یک دم پورا فقرہ ترتیب سے بنتا گیا۔

"اس کا قاتل اس کی پسندیدہ فیری ٹیل میں ہے۔"

وہ اچنبھے سے اس کاغذ کو دیکھ رہا تھا۔ کسی لڑکی کی بات ہو رہی تھی۔ وہ تالیہ کو کسی کے قاتل کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"یہ کس کے بارے میں ہو سکتا ہے؟" ساتھ بیٹھی آریانہ نے کندھے اچکائے اور چہرہ ہتھیلیوں کے پیالے میں گرا دیا۔

"کس کو فیری ٹیلز پسند تھیں ڈیڈ؟"

"کیا مجھے اس رات کسی کے قتل کے بارے میں علم ہوا تھا اور میں تالیہ کو کچھ بتانا چاہتا تھا؟ اتنے مہینے تک تالیہ اس کے لیے کام کرتی رہی اور اس نے ایک دفعہ بھی اس پیغام کا ذکر نہیں کیا۔ کیوں؟"

اس کا ذہن ملا کہ جواب تلاش کرنے آیا تھا۔ یہاں آ کے وہ مزید الجھ گیا تھا۔

سفید ہیئر بینڈ والی لڑکی ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی۔ "کس کو فیری ٹیلز پسند تھیں ڈیڈ؟"

☆☆☆

وہ چٹ اگلی صبح کے ایل میں اپنے آفس میں بیٹھے فاتح کی جیب میں مڑی تڑی حالت میں رکھی تھی۔ وہ ایک کے بعد ایک میٹنگ اٹینڈ کرتا اور تیس سیکنڈ کے درمیانی وقفے میں اس چٹ کو نکال کے پڑھتا' پھر واپس رکھ دیتا۔ کس کا قاتل؟ کون سی فیری ٹیل؟

جواب ایک ہی تھا جو بار بار وہ رد کر دیتا تھا۔

آریانہ کو فیری ٹیلز پسند تھیں اور وہ خود کو اسنو وائٹ سے تشبیہہ دیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا.... اس کی زندگی کے سارے کردار اسنو وائیٹ جیسے ہیں۔ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور اس کی ایک سوتیلی ماں بھی ہے۔ ملکہ۔

"مگر تمہاری ماں ایول کوئین جیسی تھوڑی ہے؟" وہ دونوں صوفے پہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب عصرہ مسکرا کے کہتے ان کے ساتھ آ کے بیٹھی۔ آریانہ پھیکی پڑ گئی۔

"ظاہر ہے' نہیں۔" اسے تب لگا تھا کہ وہ شرمندہ ہوئی ہے۔ اس نے نظر انداز کیا تھا۔ وہ کیا کچھ نظر انداز کرتا آیا تھا؟

کارمن کافی دینے آئی تو اس نے اسے پکارا۔

"تم نے اسنو وائیٹ پڑھی ہے' کارمن؟"

وہ سادہ سی لڑکی مسکرائی۔ "کس نے نہیں پڑھ رکھی؟"

"اس میں اسنو کو کس نے مارا تھا؟" اسے لگا وہ کچھ بھول رہا ہے۔

"اس کی سوتیلی ماں نے.... بادشاہ کی بیوی.... ملکہ بدنے...." وہ رکی اور بولی۔ "مگر ملکہ اس کو مارنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے جنگل میں اس کے لیے شکاری کو بھیجا تھا مگر....."

"ہاں ٹھیک ہے۔ جاؤ۔" وہ ہاتھ جھلا کے بولا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگا تھا۔

پہیلی عجب صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اسے حل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابھی صبح دوپہر میں نہیں بدلی تھی جب عصرہ کا فون آنے لگا۔ ایک ڈیلکیٹ ابھی آفس سے اٹھ کے گیا تھا۔ فاتح کے پاس پانچ منٹ تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر فون کان سے لگایا۔

''کہو عصرہ۔''

''تم رات گھر نہیں آئے۔''

''میں ملاکہ میں رک گیا تھا۔ صبح فجر کے بعد واپس نکلا اور سیدھا آفس آ گیا۔''

''کل ہم نے جس نوٹ پہ بات ختم کی' تمہارے پاس اس کا اثر زائل کرنے کو دو منٹ بھی نہیں تھے؟''

وہ گھر نہ آنے کا شکوہ کر رہی تھی۔

''عصرہ میں جھگڑے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میری آج بیک ٹو بیک بہت سی میٹنگز ہیں' شام میں سیمینار ہے' اور....''

''کیا تم اس سے ملے؟'' اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''کس سے؟'' وہ انجان بن گیا۔

''وہی جس کے تعاقب میں تم ملاکہ گئے تھے۔''

''نہیں۔ میں اس سے نہیں ملا۔'' اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ وقت کم تھا۔ اسے کانفرنس روم میں پہنچنا تھا۔

''فاتح.... کیا میں یہ ڈیزرو کرتی تھی؟ تمہارا یہ سرد رویہ' تمہاری بے وفائی؟''

''میں نے کبھی تم سے بے وفائی نہیں کی' عصرہ..... تم خود ہی اپنے شک کے ہاتھوں ہمارا تعلق برباد کر رہی ہو۔'' وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اٹھا۔ فون کان اور کندھے کے درمیان تھا۔

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم شروع سے ہی ایسے تھے۔'' وہ ایک دم غصے میں تیز تیز بولنے لگی تھی۔ وہ اس وقت درست نہیں لگ رہی تھی۔ ''وان فاتح کو کبھی بھی عصرہ محمود سے محبت نہیں تھی۔ فاتح کو صرف فاتح سے محبت ہے۔''

''تھینک یو۔ میں میٹنگ میں جا رہا ہوں اس لیے....'' وہ آفس سے باہر نکل آیا تھا۔

''یا تمہیں آریانہ سے محبت تھی۔ وہ گئی تو تم نے صرف اپنے بچوں سے محبت کی یا پھر تالیہ سے۔ میں تو کہیں بھی نہیں تھی۔'' وہ اس پہ ایک دم چلانے لگی تھی۔ وہ اس کے انداز پہ اکتانے کے بجائے پریشان ہو گیا تھا۔ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے ایک دم اپنی سرد مہری پہ افسوس ہوا۔

''عصرہ تم ٹھیک ہو؟ میں شام میں گھر آتا ہوں تو.....''

''کبھی میں سوچتی تھی کہ آریانہ نہ مرتی.... اس کو ہم اس روز چیئر لفٹ پہ نہ لے کر جاتے.... نہ وہ نینی اور اس کا شوہر اس کو اغوا کرتے اور نہ وہ مرتی.... تو ہماری زندگی مختلف ہوتی۔ تم ابھی بھی میرے ہوتے مگر نہیں۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''تم تب بھی اسی طرح مجھ سے بے وفائی کر جاتے' فاتح۔ تم تب بھی کسی تالیہ کو ڈھونڈ لیتے۔ ہمارا تعلق آریانہ کے جانے سے مردہ نہیں ہوا۔''

وہ وہیں کاریڈور میں کھڑا رہ گیا۔ بالکل ساکت۔ پتھر کا بت۔

''فاتح؟ سن رہے ہو؟ یا کال کاٹ دی ہے؟ فاتح؟'' وہ چلائی تھی۔

''تمہیں کیسے معلوم وہ آدمی نینی کا شوہر تھا؟''

ساری دنیا وہاں رک گئی تھی۔ اسی کاریڈور میں۔ ایسا لگتا تھا کہ آتے جاتے لوگ اپنی جگہوں پہ نمک کے مجسمے بن گئے ہوں۔

اور دوسری طرف عصرہ کا سانس بھی تھم گیا تھا۔

''کیا؟ کون؟'' اس کی آواز دھیمی ہوئی۔ پھر اس نے دوبارہ سے غصہ کرنے کی کوشش کی۔ ''میں تم سے تالیہ کی بات کر رہی ہوں اور تم....''

''نو نو۔ گو بیک۔ گو بیک۔'' وہ تیزی سے بولا۔ ''تم نے کہا نینی کا شوہر.... تمہیں کیسے معلوم وہ

اس کا شوہر تھا؟"

"میں.... پتا نہیں...." وہ گنگ رہ گئی۔ "پولیس رپورٹ میں تھا شاید.... ظاہر ہے وہ اس کا شوہر' بوائے فرینڈ کچھ ہوگا' مگر...."

"پولیس رپورٹ میں اس آدمی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ ان دونوں کی لاشیں میں نے دیکھی تھیں صرف۔ میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا سوائے تمہارے اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس آدمی کا نینی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور تم نے کہا تھا تم نہیں جانتیں۔"

"فاتح.... تم کیا کہہ رہے ہو' میں تو غصے میں مثال دیتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ...."

سامنے کھڑا اس کا چیف آف اسٹاف اسے میٹنگ کے لیے بلا رہا تھا۔ وقت کم تھا۔

اس کا ذہن جیسے الفاظ کے سمندر کے بھنور میں گھوم رہا تھا۔

"عصرہ.... میں تم سے فارغ ہو کے بات کرتا ہوں۔" اس نے فون رکھ دیا۔

کاریڈور میں اس کے اٹھتے قدم بھاری تھے۔ بے حد بھاری۔ وہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ ساری دنیا اردگرد سلوموشن میں رواں دواں نظر آ رہی تھی۔ آوازیں بھاری ہو کے سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں چند الفاظ ذہن میں گونج رہے تھے۔

"اس کا قاتل اس کی پسندیدہ فیری ٹیل میں ہے۔"

کانفرنس روم کے دروازے پہ وہ اسے کھڑی نظر آئی تھی۔ ہیئر بینڈ پہنے' اداس لڑکی جس کے سفید فراک پہ سامنے کو خون لگا تھا۔ اس کی کنپٹی سے بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ گلہ آمیز نظروں سے دروازے کے قریب آتے فاتح کو دیکھ رہی تھی۔

"ڈیڈ.... آپ کو میری پسندیدہ فیری ٹیل کیسے بھول گئی؟ ہمیں الگ ہوئے کیا اتنے برس بیت گئے؟"

وہ سفید چہرے کے ساتھ اسے دیکھتا دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ باہر رہ گئی۔ وہ اندر آ گیا۔ مگر اس کا ذہن ابھی تک ماؤف سا تھا۔ جیسے اس میں بہت شور برپا ہو۔

جیسے اس میں خوفناک سی خاموشی چھا گئی ہو۔

میٹنگ میں اشعر کچھ کہہ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے' ہاتھ ہلا کے۔ فاتح کو صرف اس کے لب ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ گال تلے انگلی جمائے اشعر کو دیکھ رہا تھا مگر نظریں اشعر کے پیچھے کھڑی آریانہ پہ جمی تھیں۔

وہ کانفرنس روم کے کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے سینے پہ لگے گھاؤ سے خون ابل ابل کے باہر گر رہا تھا اور وہ بھیگی آنکھوں سے فاتح کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہمیں بچھڑے اتنے برس بیت گئے تھے' ڈیڈ؟"

میٹنگ ختم ہوئی تو وہ ایک لفظ کہے بنا اٹھا اور باہر چلا گیا۔ قدم اٹھا کہیں رہا تھا' پڑ کہیں رہے تھے۔

کاریڈور میں لوگ ادھر ادھر جا رہے تھے۔

فاتح نے چلتے چلتے جیب سے وہی پرچی نکالی اور اس کی سلوٹیں سیدھی کیں۔

"اس کا قاتل اس کی پسندیدہ فیری ٹیل میں ہے۔"

کوئی اور ہوتا تو ایک لمحے میں سب واضح ہو جاتا مگر وہ فاتح تھا اور سامنے عصرہ تھی۔

ایک لمحے میں سب واضح نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے پرچی مروڑ کے جیب میں رکھ دی۔

اسنو وائٹ کے لیے جلاد اس کی سوتیلی ماں نے بھیجا تھا مگر یہاں وہ اس بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ صرف ایک خیال ذہن کو مفلوج کر رہا تھا۔ عصرہ نینی کے شوہر کے بارے میں کچھ جانتی تھی اور اس سے چھپا رہی تھی؟ اتنا عرصہ؟

وہ آفس میں واپس آیا تو کارمن نے چوکھٹ سے جھانکا۔ "سر ابھی دس منٹ میں آپ نے پارلیمان کے لیے نکلنا ہے اور...."

''آؤٹ!'' وہ کرسی کی طرف جاتے ہوئے دھاڑا تھا۔ کارمن گڑبڑا کے پیچھے ہوئی اور جلدی سے دروازہ بند کردیا۔

اس نے ٹائی ڈھیلی کی اور فون اٹھایا۔ وہ اس بات کو کلیئر کیے بغیر اگلا کام نہیں کرسکتا تھا۔

''تم آریانہ کی نینی کے بارے میں اور کیا جانتی ہو جو تم نے مجھے نہیں بتایا؟'' کال ملتے ہی وہ درشتی سے بولا تھا۔ ایک ہاتھ سے فون کان پہ لگا رکھا تھا' دوسرے سے ٹائی ڈھیلی کررہا تھا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' عصرہ سنبھل چکی تھی۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' میرے منہ سے پتا نہیں کیا نکلا کہ.....''

''جب اس آدمی کی کار ملی تھی تو میں نے اور پولیس نے سینکڑوں دفعہ تم سے پوچھا تھا، اس نینی کا کوئی مرد رشتے دار یا دوست اس سے ملنے آتا تھا؟ اور تم نے کہا تھا کہ تم نے چھان پھٹک کے اس نینی کو ہائر کیا تھا۔ اس کا کوئی بوائے فرینڈ تک نہیں تھا۔ تم جانتی تھیں مجھے ایسی نینی نہیں پسند تھی جس کے یوں تعلقات ہوں۔''

''فاتح! مجھے نہیں پتا وہ آدمی اس کا کیا لگتا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ نینی کے ساتھ ایک آدمی کی لاش بھی تھی تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کا شوہر ہوگا۔ تم مجھ پہ کس چیز کا شک کررہے ہو؟''

وہ اس پہ معلومات چھپانے کا شک کررہا تھا۔ اس سے نینی کو ہائر کرنے میں غلطی ہوئی تھی اور ضرور کوئی مشکوک آدمی آتا جاتا ہوگا مگر عصرہ نے اسے نظر انداز کیا اور جب خمیازہ بھگتنا پڑا تو اس نے اپنی غلطی چھپادی۔

''تم جانتی ہو میں تم پہ کس چیز کا شک کررہا ہوں۔''

''وان فاتح!'' وہ درد سے چلائی تھی۔ ''کیا آریانہ کی موت کے علاوہ ہماری زندگی میں کچھ نہیں ہے؟ ہر چیز اتنے برسوں سے اسی کے گرد کیوں گھومتی ہے؟ وہ مرگئی ہے فاتح۔ مگر میں تو زندہ ہوں۔''

''وہ ہماری بیٹی تھی!'' وہ دانت پیس کے غرایا۔

''ہماری نہیں۔ وہ صرف تمہاری بیٹی تھی۔'' وہ بھی برہمی سے چلائی۔ ''میں نے اتنے سال اسے پالا' اس کا خیال رکھا' مگر آخر میں تم نے مجھے یہ صلہ دیا کہ تم مجھ پہ شک کررہے ہو؟''

''میں شک نہیں کررہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے اپنی غلطی کو راپ کی ہے۔''

''تم..... تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس آدمی کو میں نے بھیجا تھا آریانہ کو اغوا کرنے کے لیے؟ تم مجھ پہ اتنا بڑا الزام لگارہے ہو؟''

اور وان فاتح کے کندھے ڈھیلے پڑگئے۔ اس نے مڑی تڑی پرچی نکالی اور اس کی شکنیں سیدھی کیں۔ تحریر واضح تھی۔ جو بات وہ خود سے نہیں کہہ سکا' وہ عصرہ نے اتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔

''بولو..... جواب دو۔'' پھر جیسے اس کی خاموشی پہ وہ بے قرار ہوئی۔ ''فاتح..... تم واقعی مجھ پہ شک کررہے ہو؟ یہ سب تالیہ نے تمہارے ذہن میں ڈالا ہے۔''

''اس کو..... تم نے بھیجا تھا۔'' وہ آہستہ سے بولا تو اس کی آواز مختلف تھی۔ سرد' اجنبی' اندر تک کاٹ دینے والی۔ عصرہ کی روح تک کانپ اٹھی۔

''فاتح...! کیا کہہ رہے ہو..... میری بات سنو.....''

''میں شام میں گھر آؤں گا۔ ہم تب بات کریں گے۔ ایک آخری بات۔ اس کے بعد میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہوں گا۔'' اس نے کال کاٹ دی۔ عصرہ کی دوبارہ کال آنے لگی تو فاتح نے فون آف کردیا۔

پھر وہ پرچی زور سے پھاڑی۔ دو' چار' آٹھ..... اس نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا۔

عصرہ نے کہا تھا۔ ''کیا اسے میں نے بھیجا تھا آریانہ کو اغوا کرنے؟''

اس نے یہ نہیں کہا کہ آریانہ کو مارنے۔

کسی دوسرے کے لیے دونوں باتیں برابر تھیں

مگر وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اسے صرف اغوا کرنے آئے تھے۔ اسے مارنے نہیں۔ عصرہ نے مارنے کی بات نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے بدترین گلٹ کو باہر نکال دیا تھا۔ اس آدمی کو عصرہ نے بھیجا تھا۔ نینی بھی عصرہ نے رکھی تھی۔ آریانہ کی موت کے بعد سب سے زیادہ خوف اور ڈپریشن کا شکار بھی عصرہ ہی رہی تھی۔ سب واضح تھا مگر کون کہتا ہے کہ پہیلی کو حیرت انگیز جواب مل جائیں تو دل فوراً سے مان بھی لیتا ہے؟

دل انکار نہیں کرتا بے شک۔ اسے سارا کھیل سمجھ آجاتا ہے۔ مگر وہ صدمہ..... وہ بے یقینی..... وہ اسے بالکل گنگ کر دیتی ہے۔

وان فاتح نے کس دل سے پارلیمان کا سیشن اٹینڈ کیا۔ صرف وہی جانتا تھا۔ وہ سارا وقت خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں گزرے ماہ و سال کسی فلم کی طرح گردش کر رہے تھے۔

کبھی عصرہ کا آریانہ سے تنگ پڑ جانا اور اس سے سلوک بدل لینا..... کبھی آریانہ کا شکایت کرنا کہ عصرہ فاتح کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ سختی سے پیش آتی ہے..... مگر اسے اپنے سامنے کبھی کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔ عصرہ اس بات کو یوں کور کر دیتی تھی کہ اسے لگتا بچے کی تربیت اور بھلائی کے لیے اگر بحیثیت ماں وہ سختی کر بھی دیتی ہے تو اچھی بات ہے اور پھر آریانہ نے شکایت کرنا چھوڑ دی۔

وہ اپنی کتابوں میں رہنے لگی۔ اس کو اسنو وائٹ کی کہانی سب سے زیادہ پسند تھی۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ وہ اسنو وائٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ خود کو شہزادی سمجھتی ہے بلکہ اس کی بھی ایک ظالم سوتیلی ماں تھی جو اس کے باپ کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ رویہ بدل لیتی تھی۔

اس نے اپنا فون شام تک نہیں کھولا۔ اسے شام کا انتظار تھا جب وہ گھر جائے گا اور عصرہ سے دو ٹوک بات کرے گا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی کال بند ہونے کے کچھ دیر بعد تالیہ نے اس نمبر پہ میسج بھیجا تھا جو عصرہ کے پاس تھا۔ عصرہ اس وقت دیوانہ وار اس کو کال ملاتے ہوئے مضطرب سی گھر میں چکر کاٹ رہی تھی۔ خوف سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ رات جب وہ گھر آئے گا تو جولیانہ اور سکندر کے سامنے ان کی ماں کی حقیقت کھول دے گا۔ سب کھل جائے گا۔ پہلے اس نے فاتح کو کھویا تھا اور وہ اپنے آپ کو دھیرے دھیرے ختم کر رہی تھی مگر وہ اپنے بچوں کو بھی کھو دے گی؟

وہ نڈھال سی صوفے پہ گر گئی۔ اس کے جسم میں درد تھا۔ اس کے اعصاب اب ویسے مضبوط نہ رہے تھے جیسے کبھی ہوتے تھے۔ وہ جس شان سے دنیا چھوڑنا چاہتی تھی، وہ اس سے شام میں چھین لی جائے گی۔ وہ فاتح کی آنکھوں میں دیکھ کے جھوٹ نہیں بول سکے گی۔ بولے گی بھی تو وہ جان لے گا۔

وہ غلطی پہ غلطی کر رہی تھی۔ سارا کھیل ہاتھ سے پھسل رہا تھا۔ اور تب ہی تالیہ کا میسج آیا۔

بس ایک لمحے میں عصرہ کو علم ہو گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ فاتح کو فیس نہیں کر سکتی تھی۔ اسے آج شام سے پہلے اس کھیل کو ختم کرنا ہے۔

آگے کا مرحلہ آسان تھا۔ نوکروں کو گواہ بنانا..... دولت کو بلا کے اس کے سامنے تالیہ پہ شک کا اظہار کرنا..... اور پھر..... کیک کا آدھا ٹکڑا کھانا جس پہ آئسنگ کے طور پہ اس نے بہت سا آرسینک چھڑک رکھا تھا۔ ذرا سا ٹکڑا اس نے بچا دیا..... اور باقی اپنے اندر اتار لیا۔ پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی اور گیلی آنکھوں سے چھت کو دیکھنے لگی۔

اس دنیا میں کوئی بھی اپنی مرضی سے مرنا نہیں چاہتا۔ موت ایک فرار ہے۔ اور عصرہ محمود کو ہمیشہ سے فرار کی عادت تھی۔ اپنا جرم چھپانے کے لیے اول روز سے وہ فاتح کو ملائیشیاء سے واپس امریکہ لے جانا چاہتی تھی۔ اسے فرار چاہیے تھا مگر جب یہ تسلی ہو گئی کہ آریانہ مر چکی ہے تو چند مہینوں کے لیے اسے لگا کہ وہ حکومت کر سکتی ہے۔ وہ نئی زندگی شروع

کر سکتی ہے۔ مگر پھر.... تالیہ نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ تالیہ مراد نے اس سے حکمرانی کی خواہش' اس کا شوہر' اس کے بچے سب چھین لیے۔ اس کا دل مردہ کر دیا۔ اور اب.... اب تالیہ اس کی سزا بھگتے گی۔

عصرہ ایک دیوی کی طرح مرے گی۔ اس کے بچے اس کو ہمیشہ مظلوم سمجھیں گے۔ ایک ہیروئین۔ اور تالیہ اس جال سے کبھی نہیں نکل سکے گی جو عصرہ نے اس کے لیے بچھایا تھا۔

وہ کرسی پہ بیٹھی تھی..... سر پیچھے ٹکا رکھا تھا اور نظریں چھت سے لٹکتے فانوس پہ جمی تھیں۔

اس کی روشنی کو دیکھتے ہوئے اس وقت عصرہ کو عجیب سا احساس ہونے لگا.... اس نے خود کو کیوں مار دیا؟ اس نے میدان تالیہ کے لیے کیوں چھوڑ دیا؟ وہ بی این کی نائب صدر تھی.... اس کے پاس دولت تھی.... گھر تھا.... بچے تھے.... اس نے ان سب کو کیوں چھوڑ دیا؟ نہیں.... یہ سب غلط ہو رہا تھا.... اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا.... اسے لڑنا چاہیے تھا.... اس نے اٹھنے کی کوشش کی.... اسے ناک سے خون نکلتا محسوس ہوا.... اسے وہ خوف محسوس ہوا جو مرنے سے پہلے ہر خودکشی کرنے والے کو ہوتا ہے.... وہ سب کچھ ریورس کر لینے کی آخری خواہش.... تڑپ.... مگر تب تک اس کا جسم مفلوج ہو چکا تھا.... وہ اٹھ نہیں سکی۔ گردن دائیں طرف ڈھلک گئی۔

اسے اب کرسی کے ساتھ.... آریانہ کھڑی نظر آ رہی تھی۔

اس کے سفید لباس پہ خون لگا تھا.... مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ادھ کھایا سیب تھا۔ عصرہ کو دیکھتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے اس سیب کے بائٹ لیتی رہی تھی۔ پھر ہونٹ بند کیے' اسے چباتی جاتی.....

وہ جب تک گھر آیا.... گھر میں ہجوم پہلے سے اکٹھا تھا۔ پولیس' پیرامیڈیکس' اشعر.... اور دولت.... جو شام سے عصرہ کو بار بار کال کر رہا تھا اور ملازم نے جب فون اٹھا کے اس کی بے ہوشی کا بتایا تو وہ فوراً آ گیا تھا۔

مگر سب کو دیر ہو چکی تھی۔ عصرہ محمود جا چکی تھی۔

جب وان فاتح نے اس کی نعش دیکھی.... اس کا سفید چہرہ.... اور اس چہرے کے تاثرات.... تو اس کا دل عجیب ویرانیوں میں گھرتا چلا گیا۔ عصرہ نے آریانہ کے لیے اغوا کار بھیجے تھے عصرہ اتنے سال اس سے جھوٹ بولتی آئی تھی' یہ سب باتیں ثانوی ہو گئیں۔

انسانی موت اپنے اندر خود اتنی بڑی ٹریجڈی ہے جو کسی بھی زندہ انسان کا دل دہلا دیتی ہے۔ ایک احساس زیاں' ایک خلا..... ایک ملال سا رہ جاتا ہے۔ عصرہ محمود، فاتح کو فیس کیے بنا... اس سے معافی مانگے بنا... ایک ہی لمحے میں اپنے لیے اس کی معافی لکھوا گئی تھی.....

وہ ان لوگوں کے ساتھ اسٹریچر کے گرد شکستہ سا کھڑا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ موت کی وجہ..... زہر..... یہ وہ.....

اور تبھی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے اوپر کوئی ہے۔ اس نے نگاہ اٹھائی تو وہ وہاں کھڑی تھی۔ سیاہ ٹوپی اور سیاہ لبادے میں اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ آنکھیں بے یقینی سے کھلی تھیں۔ ان کی نگاہیں ملیں اور وان فاتح کی ساری حسیات جاگنے لگیں۔

(بھاگ جاؤ تالیہ!) اس نے اسے اشارہ کیا تھا۔

اور اگلے ہی لمحے وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رات خوف ناک حد تک خاموش تھی۔ تاریک آسمان خاموشی سے شہر کی گلیوں میں بھاگتی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ٹیکسی سے دوسری بدلتی' ایک گلی سے دوسری میں مڑتی.... وہ بھاگتی بھاگتی اپنے گھر تک آ پہنچی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے گھڑی پہ وقت دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پولیس یہاں ہو گی۔ اسے جو کرنا تھا اسی وقت میں کرنا تھا۔

تالیہ مراد نے کئی سال تک اس بات پہ تحقیق کی تھی کہ پولیس اس کے گھر تک کتنی جلدی پہنچ سکتی ہے۔ کون سا اسٹیشن یہاں سے کتنا دور ہے۔ ایک خوف سا

تھا کہ کبھی وہ دن آئے گا جب اسے پولیس سے بھاگنا پڑے گا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ بے گناہ ہونے کے باوجود ایسا ہوگا۔ مگر یہ معلوم تھا کہ اگر ایسا ہوا تو کیا کرنا تھا۔ اور جو اسے معلوم تھا اسے آج اپنی جان بچانی تھی۔

اس نے گیلے جوتے ڈور میٹ پہ اتارے اور اپنے ٹریژر شوز میں پہنے۔ پھر بیسمنٹ میں کھلنے والے دروازے تک آئی۔ فنگر پرنٹ سے اسے کھولا اور سیڑھیاں پھلانگتی نیچے کودی۔

بیسمنٹ کو عرصہ ہوا وہ خالی کر چکی تھی۔ اپنے پچھلے اعمال کے تمام ثبوتوں اور نشانیوں سے پاک۔

اب وہاں صرف ایک شے موجود تھی۔

اس نے بھاری میز دھکیلی۔ فرش سے ایک لکڑی کا پلینک اٹھایا اور نیچے ہاتھ ڈالا۔ خفیہ خانے میں ایک سیاہ بیگ رکھا تھا۔ تالیہ نے وہ بیگ اٹھایا اور زپ کھولی۔

اندر تین پاسپورٹ تھے۔ نوٹوں کے چند بنڈل' گن' چاقو' ایک کپڑوں کا جوڑا' دو کریڈٹ کارڈ' چند دستاویزات رکھے تھے۔ وگ' لینز' گلاسز' نیا فون' چارجر' پاور بینک' اور چاکلیٹ بارز۔

یہ اس کا گو بیگ تھا۔

برسوں سے وہ اس لمحے کے لیے تیار تھی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا مگر کسی ریہرسل شدہ عمل کی طرح تمام اعضاء تیزی سے کام کر رہے تھے۔

اس نے بیگ کندھے پہ ڈالا' گھر کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ پولیس کے سائرن پس منظر میں سنائی دے رہے تھے۔

اب وہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ ہڈ سر پہ گرائے' آنکھوں پہ نظر کا چشمہ پہنے' اس نے ماحولیاتی آلودگی سے بچنے والا سبز ماسک ناک پہ جما رکھا تھا۔ یہاں کے ایل میں بہت سے لوگ ماسک پہنے گھوما کرتے تھے۔

ایک فون بوتھ پہ وہ رکی اور ریسیور اٹھا کے ایک نمبر ملایا۔ حسب متوقع آگے سے وائس میل آن تھا۔

''داتن۔'' وہ پھولے تنفس کے درمیان کہہ رہی تھی۔ ''پولیس میرے پیچھے ہے۔ اس لیے تمہارے ریگولر نمبر پہ کال نہیں کر سکتی۔ وہ ٹیپ ہو رہا ہوگا۔ اب میری بات دھیان سے سنو۔'' وہ دائیں بائیں احتیاط سے دیکھتی سرگوشی میں کہنے لگی۔ ''وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے عصرہ کو مارا ہے۔ مگر میں نے اسے نہیں مارا۔ تمہیں کوئی کچھ بھی کہے' اس کی بات کا اعتبار مت کرنا۔ اپنے دل کی سننا۔ میں مشکل میں ہوں۔'' اس کی آواز بھیگنے لگی۔ چند گہری سانسیں اندر کھینچیں۔

''کاش میرے پاس وقت کی چابی ہوتی تو میں.... میں وقت میں تین چار ماہ آگے نکل جاتی.... اس ملک سے دور.... شاید جاپان کی طرف.... مگر ابھی.... ابھی مجھے سنگاپور جانا ہے۔ مجھے ایک کلین پاسپورٹ چاہیے۔'' وہ ہدایت دے رہی تھی۔ ''تم صبح گیارہ بجے تک اپنے گھر سے نہیں نکلو گی۔ ٹھیک گیارہ بجے تم اپنے گھر کے باہر والے ہمارے مخصوص ڈراپ باکس میں پاسپورٹ رکھ دو گی۔ میں وہاں سے اٹھا لوں گی۔ مگر میں تم سے مل نہیں سکوں گی۔ اور دھیان کرنا' پولیس کو نہیں علم ہونا چاہیے۔ اس کے بعد تم بھی ملک چھوڑ دینا اور میں.... میں سنگاپور سے آگے نکل جاؤں گی مگر.....'' وہ گیلی آواز سے مسکرائی۔ ''کبھی ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔ کسی اور زمانے.... کسی اور موسم میں.... سمندر کنارے کچی مچھلی کا شکار کرتے.... ہم ضرور ملیں گے داتن۔'' اس نے فون بند کیا۔ آنکھیں رگڑیں۔ ہڈ برابر کی اور تیزی سے بس کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

حالم کا بنگلہ رات کے اس وقت روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ باہر کھڑی پولیس موبائلز کی جلتی بجھتی روشنیوں اور آوازوں نے ساری اسٹریٹ کو خوف و ہراس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دروازے کھلے تھے۔ سیڑھیوں سے اوپر نیچے پولیس اہلکار آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، چند منٹوں میں انہوں نے تالیہ کا سارا گھر الٹ کے رکھ دیا تھا۔

لاؤنج کے وسط میں دولت کھڑا تھا۔ ہاتھ پہلوؤں پہ جمائے' شرٹ کے کف موڑے' وہ ناخوش

نظر آتا تھا۔اس کے کندھوں سے کمر تک بیلٹ سے بندھا ہولسٹر اور پستول واضح نظر آرہا تھا۔

''گھر کلیئر ہے سر!'' ایک اہلکار نے آ کے اطلاع دی تو دولت نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔

''ظاہر ہے اسے معلوم تھا ہم آرہے ہیں۔وہ بھاگ چکی ہے۔بات سنو سب۔الیوری ون۔''

اس نے تالی بجائی تو اوپر نیچے پھیلے اہلکار ہاتھ روک کے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میری ابھی وزیرِاعظم صاحبہ سے بات ہوئی ہے۔عصرہ محمود ایک ہائی پروفائل خاتون تھیں اور ان کی موت کوئی عام بات نہیں ہے۔پردھان منتری نے تالیہ مراد کی فوراً گرفتاری کا حکم دیا ہے۔''

وہ دائیں بائیں سر گھماتا ایک ایک کو دیکھتا سختی سے کہہ رہا تھا۔

''ایک گھنٹے میں پولیس کے ہر ناکے' شہر کی ہر اینٹری، ایگزٹ' ہر تھانے' اور ائیر پورٹ پہ تالیہ کی تصاویر بھیج دو۔شہر کی ہر پولیس پٹرول یونٹ کو اس کا حلیہ اور تصویر ملنی چاہیے۔اس کے گھر کے اردگرد سی ٹی وی سے اس کی نقل و حرکت کو ٹریس کرنے کی کوشش کرو۔اس کے تمام دوستوں کے فونز ٹیپ کرو۔وان فاتح کا بھی۔وہ کسی سے رابطہ ضرور کرے گی۔''

وہ اب کنپٹی پہ انگلی رکھے سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔''تالیہ مراد کو اگر میں جانتا ہوں تو اس کا اگلا اسٹیپ....'' اس نے رک کے سوچا۔تالیہ اب کیا کرے گی؟

''فرار.... وہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش کرے گی۔'' وہ مسکرا کے بولا تھا۔''اور ہمیں اس شہر کے ہر دروازے پہ پہرہ لگا دینا ہے۔''

وہ کہہ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔اس نے بات روک کے موبائل کان سے لگایا۔

''بولو زاہد۔'' دوسری جانب اس کا اینالسٹ ہیڈ کوارٹر سے بات کر رہا تھا۔

''سر.... ایک اطلاع ہے۔'' اینالسٹ دبے دبے جوش سے کہنے لگا۔''یاد ہے ہم نے تالیہ کی کیس انویسٹی گیشن کے دوران اس کی دوست لیانہ صابری کی فائل تیار کی تھی۔مجھے اس دوران لیانہ کا ایک ایسا فون نمبر ملا تھا جو اس کے گھر کے علاقے میں مخصوص وقت کے لیے آن ہوتا تھا۔یہ نمبر اس کے نام پہ نہیں ہے' اور....''

''مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ تم نے وہ نمبر کیسے ڈھونڈا۔'' دولت نے اکتا کے بات کاٹی۔''مجھے یہ بتاؤ کہ اس نمبر پہ تالیہ نے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''یس سر۔'' وہ دبے دبے جوش سے بولا۔''وہ نہیں جانتی کہ ہم اس نمبر کو ٹیپ کر رہے تھے۔اس نے واٹس میل میں پیغام چھوڑا ہے۔میں آپ کو سنواتا ہوں۔''

دولت چند لمحے تک اس پیغام کو سنتا رہا جو تالیہ نے داتن کے لیے چھوڑا تھا۔پھر اس نے فون رکھا اور ٹیم کو مخاطب کیا۔

''چینج آف پلان۔ہم اس کے گرد گھیرا تنگ ضرور کریں گے مگر ابھی تالیہ کے ملوث ہونے کی خبر میڈیا پہ نہیں دیں گے۔وہ سب سے زیادہ اس چیز سے ڈرتی ہے۔یہ پتا ابھی ہم اپنے ہاتھ میں رکھیں گے اور لیانہ صابری کو ابھی ہم گرفتار نہیں کریں گے۔وہ تالیہ تک پہنچنے کے لیے ہمارا واحد لنک ہے۔'' وہ آس اور اضطراب کے درمیان کہہ رہا تھا۔''امید ہے کہ تالیہ اس کے گھر کے قریب جائے گی نیا پاسپورٹ اٹھانے۔ہمیں لیانہ کے گھر کے گرد گھیرا تنگ کرنا ہے اور صبح تک اپنی کارروائیوں کو خاموش رکھنا ہے۔تالیہ مراد اس وقت خوف کا شکار ہے اور ایسا انسان غلطی پہ غلطی کرتا ہے۔ہم تالیہ کی غلطی کا انتظار کریں گے۔''

اسے تالیہ کی فون کال میں عرصے بعد وہی خوف محسوس ہوا تھا جو قید کے ان پانچ دنوں میں اس کے چہرے پہ نظر آتا تھا۔وہ جس چیز سے ڈرتی تھی' وہی اس کے سامنے آ گئی تھی۔بہت اچھے۔

وہ تالیہ مراد کے گرد ایسا گھیرا بنانے جا رہا تھا جس کو وہ توڑنے کی کوشش میں غلطیاں کرے گی۔

بلی اور چوہے کا کھیل شروع ہونے والا تھا۔

اگلی صبح آسمان نے دیکھا کہ ایک بڑے سبزہ زار پہ عصرہ محمود کے جنازے کی رسم ادا کی جارہی تھی۔ لوگوں کا ایک منظم ہجوم وہاں کھڑا تھا۔ قطار میں لوگ باری باری آتے' اور مرکزی جگہ پہ کھڑے فاتح سے ہاتھ ملاتے' تعزیت کرتے' دعا دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔

وہ سر کے خم سے ان کی تعزیت وصول کرتا' شکریہ ادا کرتا اور پھر ایک ویران نظر اپنے دونوں بچوں پہ ڈالتا جو اس کے دائیں طرف کھڑے تھے۔ دونوں نے اب زار و قطار رونا بند کر دیا تھا۔ جولیانہ صرف شکل تھی اور سکندر بار بار سر جھکا کے گیلی آنکھیں پونچھتا تھا۔ فاتح ایک ہاتھ لوگوں سے ملاتا تھا' اور دوسرا سکندر کے کندھے پہ جمائے ہوئے تھا۔

جولیانہ کے اس طرف اشعر کھڑا تھا۔ ان سب کے چہرے آج سوگوار تھے۔

خاندان کی ایک خاتون بچوں کو اپنے ساتھ دوسری طرف لے گئیں تو اشعر اس کے کندھے کے برابر آ کھڑا ہوا۔

''آپ ٹھیک ہیں' آبنگ؟''

''ہوں۔''

''میں جانتا ہوں کاکا اور آپ کے اختلافات تھے اور۔۔۔''

''میرے اور عصرہ کے کوئی اختلافات نہیں تھے' ایش۔ وہ ایک بہت اچھی بیوی اور ماں تھی۔ اس نے کبھی کچھ ایسا نہیں کیا جس سے میں ہرٹ ہوا ہوں۔'' اشعر نے نظروں کا رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس نے جیسے سارے حساب کتاب ختم کر ڈالے تھے۔ اشعر کو خیال گزرا کہ آخری دنوں میں وہ دونوں کافی بہتر ہو چکے تھے۔ فاتح نے اسے نائب چیئرپرسن بھی بنا دیا تھا۔ واقعی اب ان کے درمیان کوئی تلخی نہیں تھی۔ وہ واپس تعزیت کرنے والوں کے ساتھ مگن ہو گیا۔

''فاتح۔'' دولت اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تو فاتح نے چونک کے گردن موڑی۔ پھر اس کی شکل دیکھ کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ واپس چہرہ سیدھا کر کے زیر لب بولا۔

''تمہاری تفتیش کہاں تک پہنچی؟'' اسے اس کی آمد شدید ناگوار گزری تھی۔

''بہت جلد تالیہ مراد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوگی۔'' وہ دونوں نامحسوس طریقے سے وہاں سے ہٹ گئے۔ اب تعزیت کرنے والوں سے قدرے فاصلے پہ وہ گھاس پہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''یہ سب تالیہ نے نہیں کیا۔''

''تمہیں کیسے معلوم۔''

''اگر تم تعصب کا چشمہ اتار دو تو تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔'' وہ برہمی سے دولت کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ''وہ یہ نہیں کر سکتی۔ اس کو اس میں پھنسایا جا رہا ہے۔''

''اچھا؟'' دولت طنز سے بولا۔ ''کس نے پھنسایا ہے اسے؟''

''یہ معلوم کرنا تمہاری جاب ہے۔ سرکار اسی کے پیسے دیتی ہے تمہیں۔ جاؤ اور معلوم کرو۔''

ناگواری سے کہہ کے وان فاتح آگے بڑھ گیا۔

دولت نے ضبط سے گہری سانس بھری' پھر گھڑی پہ وقت دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ اسے داتن کے گھر سے چند فرلانگ دور مقررہ جگہ پہ پہنچنا تھا۔ تالیہ مراد اپنا پاسپورٹ اٹھانے آنے والی ہوگی۔

وان فاتح اب قطار میں آئے لوگوں سے تعزیت وصول کر رہا تھا۔ اگلا شخص ایڈم تھا۔ فاتح نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ قریب آ کے آہستہ سے بولا۔

''مجھے بہت افسوس ہوا' سر۔''

''مجھے بھی' ایڈم۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''میں اور میرے بچے اس ٹراما سے کیسے نکلیں گے' مجھے نہیں معلوم۔''

''میں آپ لوگوں کے لیے دعا کروں گا کہ آپ اس سے نکل آئیں۔ اللہ تعالیٰ دل سے مانگی ساری دعائیں پوری کرتا ہے۔'' پھر اس نے چہرہ

آگے کو جھکایا اور پریشانی سے پوچھا۔ ''سر یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ چے تالیہ....''

''یہ اس نے نہیں کیا۔'' فاتح نے سختی سے آہستہ آواز میں دہرایا۔ ایڈم چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آف کورس سر.... میں جانتا ہوں۔'' پھر سر کو خم دے کر آگے بڑھا تو کچھ سوچ کے وان فاتح اس کے پیچھے آیا۔ دونوں ہجوم سے ذرا دور گھاس پہ چلے آئے تو فاتح نے اسے پکارا۔ وہ چونک کے مڑا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کے پیچھے آرہا ہے۔

''ایڈم.... تم تالیہ کو ڈھونڈو۔ لیانہ صابری سے پوچھو یا کسی اور سے۔ کچھ بھی کرو مگر اس کو ڈھونڈو اور.....''

''اور؟''

''اور اس سے کہو کہ وہ روپوش نہ ہو۔ سامنے آجائے۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ وہ گرفتاری دے دیں؟ اس جرم کے لیے جو انہوں نے نہیں کیا؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں کیونکہ بھاگنے سے وہ مزید مجرم لگ رہی ہے۔ ایک دفعہ وہ خود کو قانون کے حوالے کر دے تو میں اس کو بچالوں گا کیونکہ وہ بے گناہ ہے۔''

''میرا ان سے رابطہ نہیں ہے مگر میں ان کو یہ مشورہ نہیں دوں گا۔ پہلے ہمیں اس شخص کو ڈھونڈنا ہے جس نے ان کو پھنسایا ہے۔'' ایڈم کا پلان مختلف تھا۔

''اصل قاتل کے خلاف ثبوت پولیس کو دیتے ہیں تاکہ چے تالیہ کا نام کلیئر ہو جائے اور وہ واپس آسکیں۔'' پھر وہ رکا۔ ''آئی ایم سوری..... اگین۔''

''جو میں نے کہا ہے وہ اس تک پہنچا دو۔'' اس نے دوٹوک کہہ کے بات ختم کر دی۔

وہ واپس آیا تو اشعر نے ناگواری سے اس کے قریب سرگوشی کی۔

''آپ اس لڑکی کا دفاع کیوں کر رہے ہیں؟ اس نے میری بہن کو مارا ہے۔'' اس نے ایڈم اور فاتح کی بات کا کوئی مکالمہ سنا تھا۔

''تالیہ بے گناہ ہے۔ اس نے عشرہ کو نہیں مارا اور اگر تم اس بات پہ یقین نہیں کرنا چاہتے تو مجھ سے دوبارہ اس موضوع پہ بات نہ کرنا۔'' وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا۔

اس نے تالیہ کی ای میل آج صبح پڑھی تھی۔ نہ پڑھتا تب بھی اسے یقین تھا کہ وہ کیک تالیہ نہیں بھیجتی۔ وہ کسی کی جان کبھی نہیں لے سکتی۔ ساری بات یہیں آکے ختم ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

لیانہ صابری کے گھر سے چند فرلانگ دور ایک پینٹرز کمپنی کی وین کھڑی تھی۔ باہر سے دیکھ کے لگتا تھا وہ کسی گھر میں پینٹ کرنے آنے والوں کی وین ہے۔ البتہ اس کے اندر کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ وہاں کرسیاں تھیں، قطار میں اسکرینز نصب تھیں جن کے آگے تکنیکی امور میں ماہر اینالسٹ بیٹھے تھے۔ اور ان کے پیچھے خالی جگہ پہ دولت ٹہل رہا تھا۔ بار بار وہ گھڑی دیکھتا۔

''گیارہ بج کے پانچ منٹ ہو گئے ہیں۔ لیانہ گھر سے نہیں نکلی۔ اب وہ پاسپورٹ کیسے دے گی؟''

''ہم اس کے گھر کے باہر رات سے موجود ہیں۔ وہ رات سے گھر سے نہیں نکلی۔'' ایک اینالسٹ نے گردن موڑ کے اسے بتایا تھا۔ ''اس کے دونوں فونز آن ہیں اور ان کی لوکیشن گھر کے اندر کی ہی آرہی ہے۔ یعنی وہ اندر ہے۔''

''اسے اب تک باہر آجانا چاہیے تھا۔'' دولت خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ شدید مضطرب نظر آتا تھا۔

''اوکے۔ ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔'' وہ رکا اور کان میں لگے آلے پہ اپنی اے ٹیم کو بزور قوت لیانہ کے گھر کے اندر جانے اور اسے گرفتار کر کے لانے کا حکم دینے لگا۔

''سر.... گھر کلیئر ہے۔'' دس منٹ بعد لیانہ کے

گھر کا دروازہ توڑ کے داخل ہونے والا اہلکار بتا رہا تھا۔ ''اس کے دونوں فون بیڈ روم میں پڑے ہیں چارجنگ پہ۔ وہ فرار ہو چکی ہے۔''

دولت نے زور سے کرسی کو بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ ''وہ کب فرار ہوئی؟ تم لوگ رات سے گھر کے چاروں طرف تھے۔''

''ہم تالیہ کے اس پیغام کے قریباً پچیس منٹ بعد یہاں پہنچے تھے۔ وہ اپنے فونز یہیں چھوڑ کے ہمارے آنے سے پہلے ہی فرار ہو چکی ہوگی سر۔'' اس کا اینالسٹ مایوسی سے بتا رہا تھا۔

''لیکن اب وہ تالیہ کو پاسپورٹ کیسے دے گی؟'' ایک دوسرے اینالسٹ نے کہا تو دولت چونکا۔ ٹھوکر مارنے سے اس کا پیر درد کرنے لگا تھا مگر اس ایک فقرے نے اسے سب بھلا دیا۔

''تالیہ مراد کو پاسپورٹ کیوں چاہیے تھا؟''

''ملک سے بھاگنے کے لیے سر!''

''اس نے پہلے سے ہنگامی صورتحال کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ پاسپورٹ، پیسے، نئی شناختیں۔ اس کے پاس اس کا اپنا گو بیگ ہر وقت ہونا چاہیے تھا۔ ایک منٹ.... وہ ریکارڈنگ.... وہ دوبارہ چلاؤ۔''

وہ تیزی سے ماتحت کی کرسی کے قریب آیا اور جھک کے اس کی اسکرین پہ جھانکا۔

ماتحت نے چند بٹن پریس کیے تو رات والی کال کی ریکارڈنگ چلنے لگی۔ پہلے دولت نے اس ریکارڈنگ میں جس شے پہ سب سے زیادہ غور کیا تھا وہ تالیہ کی آواز تھی۔ بھیگی، خوف سے لبریز آواز جس میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک صیاد کو شکار کی ایسی آواز سن کے لطف آتا تھا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر اب.... اب وہ الفاظ سن رہا تھا.....

''تمہیں کوئی کچھ بھی کہے، اس کی بات کا اعتبار نہیں کرنا۔'' تالیہ کی آواز اسپیکرز میں گونج رہی تھی۔ دولت نے بے دردی سے اپنا لب کاٹا۔ (کیا اس کی باتوں کا وہی مطلب تھا جو وہ نظر آتا تھا؟)

''کاش میرے پاس وقت کی چابی ہوتی تو میں وقت میں تین چار ماہ آگے نکل جاتی۔ جاپان....''

''کبھی ہم دوبارہ ضرور ملیں گے.... کسی اور زمانے میں.... کسی اور موسم میں..... سمندر کنارے مچھلی کا شکار کرنے.... پرانے وقتوں کی طرح.... ہم ضرور ملیں گے، داتن۔''

دولت ماتھے پہ بل ڈالے سیدھا ہوا۔ ''اس نے کہا.... وقت کی چابی۔''

ماتحت نے مڑ کے اسے دیکھا۔ ''سر آپ کو معلوم تو ہے۔ بچے تالیہ کی تھیوری جو انہوں نے پراسیکیوٹر احمد نظام کو بتائی تھی کہ وہ وقت میں پیچھے گئی تھیں اور.....''

''اونہوں۔ پیچھے نہیں.... اس نے کہا، وہ وقت میں آگے جانا چاہتی ہے۔'' وہ پہلوؤں پہ ہاتھ جمائے کرسیوں کے پیچھے ٹہلنے لگا۔

''اس نے لیانہ کو پاسپورٹ کے لیے فون نہیں کیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ہم کال ٹیپ کر رہے ہوں گے۔ اس کو صبح یہاں نہیں آنا تھا۔''

''تو پھر اس نے یہ کیوں کیا؟''

''اگر ہم یہ کال نہ سنتے.....'' مڑ کے گھور کے اینالسٹ کو دیکھا۔ ''اگر تم مجھے یہ کال نہ سنواتے تو میں اسی وقت لیانہ صابری کی گرفتاری کا حکم دے رہا تھا۔ میں تالیہ کے فرار کی خبر ہر جگہ چلانے جا رہا تھا مگر اس کال نے ہمیں روک دیا۔ دونوں کو موقع پہ پکڑنے کی خواہش نے ہمیں روک دیا۔ وہ لیانہ کو بھاگنے کا وقت دے رہی تھی۔''

وہ جانتی تھی کہ دولت کا خواب کیا ہے۔ تالیہ کو خوفزدہ دیکھنا۔ کون دومن نے اس کو ایک خواب دکھایا۔ ایک دلفریب سراب جس کے تعاقب نے اس کو جھانسہ دے ڈالا۔

''یعنی سر.... تالیہ مراد نے لیانہ سے نہیں ملنا تھا؟''

اور اس سوال پہ ٹہلتا ہوا دولت رکا۔ اسے ایک عجیب سا خیال آیا۔

''اونہوں۔ تالیہ کے پاس لیانہ سے رابطے کے لیے یہی ایک نمبر تھا۔ اسے اس سے بات بھی کرنی تھی اور اسے خوف بھی تھا کہ پولیس اسے ٹیپ کر رہی ہوگی۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ وہ واقعی کال میں لیانہ کو ملاقات کے لیے بلا رہی تھی مگر کہاں؟''

وہ خود دوبارہ اسکرین تک آیا اور جھک کے بٹن پریس کیا۔ ریکارڈنگ پھر سے چلنے لگی۔

''کاش میرے پاس وقت کی چابی ہوتی....تو میں وقت میں تین چار ماہ آگے چلی جاتی۔ جاپان۔''

اس نے اسٹاپ کا بٹن دبایا اور دھیرے سے سیدھا ہوا۔ ''چار ماہ کے بعد جاپان میں کیا ہوتا ہے؟''

''چار ماہ بعد؟'' اینالسٹ نے انگلیوں پہ حساب کیا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ چار ماہ بعد اپریل ہے سر۔ اور....''

بس اس ایک لمحے میں پزل کے سارے ٹکڑے اپنی جگہ پہ آن گرے۔

''ساکورا ہانامی۔'' دولت بڑبڑایا۔ ''مارچ اپریل میں جاپان میں 'ساکورا ہانامی' شروع ہو جاتا ہے۔''

وین میں خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ دولت نے البتہ کراہ کے کنپٹی چھوئی تھی۔

''اسے جاپان نہیں جانا تھا۔'' دولت نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اسے دی کیوب میں بلا رہی تھی۔''

''دی کیوب؟ وہ جاپانی ریستوران؟'' ایک اہلکار نے چونک کے کہا۔

''ہاں' کیونکہ اس نے کہا وہ لیانہ کے ساتھ کچی مچھلی کا شکار کرنا چاہتی ہے۔'' اس نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں۔ اینالسٹ نے بے اختیار سر پہ ہاتھ مارا۔

''آف کورس۔ دی کیوب دو چیزوں کے لیے مشہور ہے۔ سوشی (کچی مچھلی کی ایک جاپانی ڈش) اور ہانامی۔ اس ریستوران کے جاپانی مالک نے اس کو ہانامی کے رنگوں سے سجا رکھا ہے اور وہاں دیواروں پہ جاپان کے ہانامی کے مناظر تھری ڈی پہ چلائے جاتے ہیں۔ وہاں جا کے لگتا ہے کہ.....''

''کہ آپ وقت میں چار ماہ آگے جاپان میں چلے گئے ہیں اور آپ کے اردگرد چیری بلاسم کے پھول گر رہے ہیں۔ ڈیم اٹ۔'' دولت نے تلخی سے کہتے ہوئے دوبارہ کرسی کو ٹھوکر ماری۔ اب کے خالی کرسی الٹ کے پرے جا گری۔

''میں ابھی ایک ٹیم اس ریستوران بھیجتا ہوں۔'' ماتحت نے جلدی سے فون اٹھایا مگر دولت نے افسوس سے سانس بھری۔

''ضرور بھیجو مگر وہ کئی گھنٹے پہلے لیانہ سے ملاقات کر کے وہاں سے روپوش ہو چکی ہوں گی۔ تالیہ مراد ہم سے ہمیشہ ایک قدم آگے رہتی ہے۔''

☆☆☆

چند گھنٹے قبل پچھلی رات میں واپس جاتے ہیں۔

داتن کے لیے پیغام ریکارڈ کروا کے تالیہ فون بوتھ سے نکلی' سر پہ ہڈ برابر کی' آنسو پونچھے اور اندھیرے میں بس کی طرف بڑھ گئی۔

بس میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تالیہ کی آنکھوں میں اب سپاٹ سا تاثر تھا۔ وہ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتی تھی۔ اگر اس کا اندازہ درست تھا تو داتن آدھے گھنٹے تک دی کیوب پہنچ جائے گی۔ پولیس اگر کالز ٹیپ کر رہی تھی اور پیغام کوڈی کوڈ بھی کر لے تب بھی ان کے دی کیوب پہنچنے تک وہ دونوں وہاں سے جا چکی ہوں گی۔

کے ایل کے دل میں واقع یہ ریستوران اندر سے نیم اندھیرا سا تھا۔ ایک گول سا ہال جس کے وسط میں لکڑی کا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ جھونپڑے کے اندر سشنگ ایریا تھا۔

مدھم موسیقی چل رہی تھی اور کھانا سرو کیا جا رہا

تھا۔ دیوار پہ ایک پینٹنگ لگی تھی۔ اس میں جاپان کی ایک سڑک کی تصویر تھی جس کے کنارے چیری بلاسم کے گلابی پھول کرے تھے۔

مارچ اپریل میں اس ریستوران میں "ہانامی فلیورنگ" شروع ہو جاتی تھی اور بوڑھا جاپانی مالک اس جگہ کو گلابی رنگوں سے سجا دیتا تھا۔ مگر ابھی چونکہ سرما تھا' اس لیے یہاں ہانامی کی محض چند ایک نشانیاں موجود تھیں۔

البتہ فی الحال بہار دور تھی۔ سرما ہر سو پھیلا تھا۔ اس لیے ریستوران قدرے خالی خالی سا تھا۔ ہال کے وسط میں بنے جھونپڑے میں بیٹھی تالیہ بار بار گھڑی دیکھتی تھی۔ سر پہ ہڈ گرا رکھا تھا اور انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

دفعتاً بوڑھا جاپانی شیف قریب آیا اور قہوے کی پیالی سامنے رکھی۔ پھر قریب جھکا اور سرگوشی کی۔

"اگر پولیس لیانہ سے پہلے آ جائے تو تم مڑے بغیر کچن میں چلی آنا اور وہاں سے....." اشارہ کیا۔

تالیہ پھیکا سا مسکرائی اور تشکر میں سر ہلایا۔

"شکریہ تاؤ۔ اتنی جلدی پولیس یہاں نہیں آئے گی۔ لیکن اگر آ گئی تو میں تمہیں مشکل میں نہیں ڈالوں گی۔"

تاؤ نے مسکرا کے اس لڑکی کا چہرہ دیکھا جو ہڈ کے ہالے میں زرد سا پڑ رہا تھا۔ پھر اس کی پیالی میں سنہری قہوے کی دھار انڈیلی۔

"کون ہو تم؟ میں تو تمہیں جانتا ہی نہیں۔ اور سی سی ٹی وی صبح سے خراب پڑا ہے۔" وہ مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔

"میں نے سنا تھا تم مجھ سے ناراض ہو۔"

خفا سی آواز سنائی دی تو تالیہ مراد نے گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔

بھاری بھرکم سی گھنگریالے بالوں والی داتن ماتھے پہ بل ڈالے اس کے سامنے کرسی کھینچ رہی تھی۔ اتنے عرصے بعد اسے دیکھا تھا اور وہ اسے ویسی ہی لگی تھی۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں زندگی سے ناراض تھی۔"

داتن نے کہنیاں میز پہ رکھیں اور آگے کو جھک کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "تالیہ..... تم نے سوچا بھی کیسے کہ ہم تمہیں اکیلا چھوڑ دیں گے؟ ہم واقعی سمجھے تھے کہ تم ٹھیک ہو۔ اور میں کچھ دوسرے کاموں میں پھنسی ہوئی تھی۔ میری غلطی ہے کہ میں عصرہ کے دھوکے میں آ گئی اور سمجھی کہ....."

"تم کمزور لگ رہی ہو۔ کیا ہوا ہے؟"

داتن لمحے بھر کو رکی اور پھیکا سا مسکرائی۔

"ڈائیٹنگ کر رہی ہوں۔ خود ہی تو کہتی تھیں کہ وزن کم کرو۔"

تالیہ ہلکے سے ہنس دی۔ آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"مجھے تم سے گلہ نہیں ہے۔ ہر انسان کو اپنے آپ کو خود بچانا پڑتا ہے۔ میں اس سے بھی نکل آؤں گی۔ اور پہلے بھی...."

"تالیہ!" اس نے بات کاٹ کے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ "ہم اس دلدل میں ساتھ گئے تھے۔ ساتھ نکلیں گے۔ تمہارے پاس پاسپورٹ ہے نا؟ ہم آج ہی سنگاپور جا رہے ہیں۔"

"نہیں داتن۔ صرف تم سنگاپور جا رہی ہو۔"

تالیہ کا انداز قطعی تھا۔

داتن نے ابرو بھینچے۔ "ہمارا فرار کا پلان کئی سالوں سے وہی ہے تالیہ۔ پہلے سنگاپور اور وہاں سے دبئی۔ سب تیار ہے۔ ہم ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ میں اپنی فیملی کو وہیں بلا لوں گی اور....."

"مگر میری فیملی نہیں ہے۔ ایڈم یہاں ہے۔ دان فاتح یہاں ہیں۔ میں ملک نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے صرف....." وہ آگے کو جھکی اور آواز مدھم کی۔ "کے ایل میں ٹھہرنے کو جگہ چاہیے۔"

"کوئی سیف ہاؤس؟ ہاں ایک دو جگہیں ہیں لیکن اگر پولیس کو علم ہو گیا تو....."

''میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں' داتن!''

بوڑھا تاؤ پھر سے ان کے قریب آیا اور پوچھا۔ ''کیا تم لوگ سوشی کھاؤ گی؟''

''نہیں' تاؤ۔'' تالیہ نے ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اس وقت کچھ بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ خود کو بہادر ظاہر کرنے کے باوجود اس کی رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی۔ اور وہ بار بار اضطراب سے انگلیاں مروڑتی تھی۔

''میں تمہیں یہاں چھوڑ کے نہیں جا سکتی' تالیہ۔'' داتن فکرمندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ تالیہ اداسی سے مسکرائی۔

''میں نے عصرہ کو نہیں مارا۔ مگر میں بھاگ نہیں سکتی۔ صرف چھپنا چاہتی ہوں۔ کچھ دن کے لیے۔''

''اور فاتح؟''

''وہ جانتے ہیں کہ میں بے گناہ ہوں۔ مگر مجھے نہیں معلوم وہ میرے لیے کچھ کر سکیں گے یا نہیں۔'' اس کے انداز میں شک تھا۔ داتن نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا اور سنجیدگی سے بولی۔

''مجھے وان فاتح سے بہت سی باتوں پہ اختلاف ہے مگر تم اپنے دل سے یہ بے یقینی نکال دو تالیہ کہ وہ تمہیں پھر سے اکیلا چھوڑ دیں گے۔ ہم تینوں تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے لیے ہر حد تک جائیں گے۔''

تالیہ کی داتن پہ جمی نگاہیں بھیگنے لگیں۔

''اگر میں اچھائی کا راستہ نہ اپناتی تو یہ سب میرے ساتھ نہ ہوتا۔ میں برائی کے راستے پہ رہتی تو چھپی رہتی۔''

''نہیں' تالیہ..... میں ہمیشہ کہتی تھی کہ انسان اس راستے کو ترک نہیں کر سکتا مگر میں غلط تھی۔ انسان سب کر سکتا ہے۔ تم نے درست کیا جو کیا۔''

وہ اعتراف کر رہی تھی مگر تالیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں زخمی سا تاثر تھا۔

''کیا فائدہ ہوا سب ترک کرنے کا؟ مجھے ایسے جرم میں پھنسایا جا رہا ہے جو میں نے کیا ہی نہیں ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ انسان اچھے راستے پہ آ جائے تو دوسرے انسان بھی اس کی مدد کرتے ہیں مگر اب داتن.....'' اس نے اردگرد دیکھا۔ ''اب مجھے اس دنیا اور اس کے انسانوں کے اندر کی اچھائی سے امید ختم ہوتی جا رہی ہے۔''

لیانہ نے اسے کبھی یوں بے بس اور مایوس نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار لب کاٹ رہی تھی۔ کبھی گردن کی پشت کو ہتھیلی سے دباتی۔ کبھی میز پہ ناخن رگڑتی۔

داتن دھیرے سے پیچھے ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''تالیہ..... کوئی بھی ہمت ہار سکتا ہے۔ مگر تم نہیں۔''

''میری زندگی میں ایک کے بعد ایک مسئلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں اب ان مسئلوں سے ایک ہی دفعہ چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔'' پھر اس نے سر ہاتھوں میں گرا دیا۔ ''مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کروں۔ میرے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔''

''میرے ساتھ سنگاپور چلو۔''

''نہیں۔''

تالیہ مراد نے سر اٹھایا۔ وہ جھونپڑے کے اندر بیٹھی تھی۔ سامنے داتن تھی۔ دونوں کے قہوے کی پیالیاں لبالب بھری تھیں۔

اسی پل تاؤ نے ریستوران کی بتیاں مدھم کر دی تھیں۔

مرکزی دیوار ساری کی ساری اسکرین بن گئی تھی اور اس پہ ایک منظر چلنے لگا تھا۔

ایک طویل سڑک کا کنارا..... وہاں آگے ڈھیروں درختوں کی قطار..... ہلکی چلتی ہوا اور درختوں سے گرتے چیری بلاسم کے گلابی اور سفید پھول..... کوئی مدھم سروں میں پیانو بجا رہا تھا..... دیوار پہ نظر آتی سڑک کے کنارے پھولوں سے بھرتے جا رہے تھے۔

تالیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم.....

تم ٹھیک ہو؟"

اس کے سوال نے لیانہ صابری کو چونکا یا تھا۔ وہ قدرے پیچھے کو ہوئی۔

"مجھے کیا ہوا ہے؟" سامنے اوپن کچن کے کاؤنٹر پہ کھڑا تاؤ سوئی بناتا نظر آرہا تھا۔ فضا میں جھینگے تلنے کی مہک بسی تھی۔

"تمہارے بال پتلے اور کم لگتے ہیں۔ تم ہیئر ایکسٹینشن استعمال کر رہی ہو۔ کیوں؟" نرمی سے پوچھا۔

"کیٹو کر رہی ہوں۔ اس سے بال جھڑ جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی تمہیں پتا چلے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

تالیہ نے موبائل کی اسکرین اس کے سامنے کی۔ اس پہ ان تینوں کی سیلفی نظر آرہی تھی۔ کونے میں میز پہ رکھی دوا کی بوتل کو اس نے زوم کر رکھا تھا۔

"یہ کینسر کی دوا ہے اور یہ بوتل تمہاری ہے۔ تم کینسر کی دوا کیوں لے رہی ہو؟"

چیری بلاسم کے رنگوں سے سجے نیم روشن جھونپڑے میں خاموشی چھا گئی۔ پیانو جیسے رک گیا۔ جھینگے تلنے کا شور تھم ہو گیا۔

"میں سچ سننا چاہتی ہوں' داتن۔ تم بیمار ہو نا۔ اور تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ دکھ سے پوچھ رہی تھی۔ داتن نے قہوے کا پیالہ اٹھایا اور لبوں سے لگایا۔ پھر سنجیدگی سے اسے دیکھ کے بولی۔

"تم سن کے ہرٹ ہو گی۔ اسی لیے میں نے تم سے چھپایا۔ کیا تم واقعی سننا چاہتی ہو؟"

پیانو کی آواز پھر سے تیز ہو گئی۔ کاؤنٹر پہ کھڑا تاؤ تیزی سے سوئی کو رول میں لپیٹ رہا تھا۔ پھر اس نے چھرا اٹھایا اور ٹھک ٹھک رول کے پیس کاٹنے لگا۔ ٹھک ٹھک ٹھک....

تالیہ اٹھی اور سے محض اتنا ہی بولی۔ "چینج آف پلان۔ مجھے ملاکہ جانا ہے۔ وہاں ایک جگہ ہے جہاں میں چھپ سکتی ہوں۔ میری کے ایل سے آج رات نکلنے میں مدد کرو۔ پھر تم سنگاپور چلی جانا۔"

"میرا ایک دوست روز فوڈ ٹرک کے ساتھ شہر سے باہر جاتا ہے۔ اگر ہم ابھی چلیں تو میں تمہیں اس کے ٹرک میں سوار کرا سکتی ہوں۔ اس کی پولیس سے جان پہچان ہے۔ وہ اس کو چیک نہیں کرتے۔" داتن بھی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ البتہ وہ بار بار فکرمندی سے تالیہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"اگر انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے دوست کی جان ایک موذی مرض لینے والا ہے تو وہ کیسے ٹھیک رہ سکتا ہے' داتن؟" اس نے بھیگی آنکھوں سے کہتے ہوئے ہڈ سر پہ گرائی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ملاکہ شہر کا وہ علاقہ رات کی تنہائی میں ویران پڑا تھا۔ کہیں کسی گھر کی کھڑکی روشن تھی تو کسی کی بیرونی بتی جلی تھی۔ فجر میں ابھی گھنٹہ پڑا تھا اور یہ روشنی سے پہلے والی تاریکی تھی جو رات کی ہو یا کسی کی زندگی کی' ہمیشہ تاریک ترین ہوتی ہے۔

نیلا ہٹ مائل سرمئی اینٹوں والی گلی کے ایک گھر کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ گھر کے بیرونی دروازے اور گلی کے درمیان تین اسٹیپ تھے۔ وہ اسٹیپ عبور کر کے دروازے تک آئی اور آہستہ سے دستک دی۔ ہڈ سر کو ڈھانکے ہوئے تھا اس لیے دور سے وہ ایک ہیولہ سا نظر آتی تھی۔

ذوالکفلی نے دروازہ کھولا تو اسے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ "تم یہاں؟ میں نے سنا تھا کہ....."

تالیہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ خود بخود ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر لاک سے اسے مقفل کیا۔ ہڈ اتاری اور گہرا سانس لیا۔ "مجھے تمہاری مدد چاہیے۔"

"جانتا ہوں اور یہ بھی کہ عصرہ محمود کے قتل کے الزام میں تمہاری تلاش جاری ہے۔"

وہ جو دروازے سے کمر ٹکائے کھڑی تھی' ان الفاظ پہ اس کی آنکھوں میں ایک بے بس سا تاثر

ابھرا۔

''ابھی تک یہ بات پبلک نہیں ہوئی۔ صبح جب وہ داتن اور مجھے گرفتار کرنے سے مایوس ہو جائیں گے تب اسے پبلک کر دیں گے۔''

''میرے اپنے تعلقات ہیں' تالیہ۔ تم نے کھانا کھایا؟''

ساحر ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے بولا اور اندر راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ پھر محسوس کیا کہ وہ ابھی تک رکی ہوئی ہے۔ ذوالکفلی نے مڑ کے اسے دیکھا۔ ''اندر آؤ۔''

''گھر میں کوئی اور تو نہیں ہے؟ دیکھو میں اس وقت کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

ذوالکفلی نے اس کے چہرے کو افسوس سے دیکھا جس کی رنگت اڑی اڑی سی تھی۔

''تم خوف زدہ ہو؟''

''نہیں تو۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''شہزادی تالیہ کو ذرا سی پولیس نے ڈرا دیا ہے۔'' وہ استہزائیہ مسکرا کے آگے بڑھا تو تالیہ کے گال سرخ ہوئے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

''تالیہ کو کوئی اتنی آسانی سے نہیں ڈرا سکتا۔ میں بس.....'' لب کاٹتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس گھر میں مدھم زرد روشنیاں پھیلی تھیں جو اسے عجب پراسرار سا تاثر دیتی تھیں۔ وہ دیوان خانے میں آئی اور نیچے چٹائی پہ بیٹھی تو پہلی نظر شیلف پہ رکھی بوتلوں پہ پڑی۔ ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

''وان فاتح کی بوتل سے چند بوندوں کے سوا کچھ غائب نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک اپنی یادداشت واپس نہیں حاصل کر سکا۔''

وہ انہی بوتلوں کو دیکھ رہی تھی جب ذوالکفلی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ تالیہ چونکی۔ پھر بھاپ اڑاتے پیالے کو دیکھ کے کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا اور پیالے کو دونوں کے درمیان چوکی پہ رکھ دیا۔ تالیہ نے جلدی سے اسے قریب کھسکایا۔ سوپ میں تیرتے رامن (نوڈلز) اس وقت شدید اشتہا انگیز لگ رہے تھے۔

''شکریہ۔'' وہ تیزی سے چاپ اسٹکس میں بھر بھر کے نوڈلز کھانے لگی۔ گرم گرم مائع نے زبان جلا دی مگر اس نے ذرا سا وقفہ دیا اور پھر سے کھانے لگی۔ وہ کہنیاں چوکی پہ رکھے اپنی چمکتی آنکھوں سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''میں نے کبھی تمہیں اتنا خوفزدہ نہیں دیکھا۔''

تالیہ چپ چاپ کھاتی رہی۔

''تم نے عصرہ کو زہر دیا ہے کیا؟''

چوپ اسٹکس والا ہاتھ منہ تک جاتے رک گیا۔ تالیہ کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔

''تمہیں لگتا ہے میں کسی کو زہر دے سکتی ہوں؟''

''ہاں۔ دے سکتی ہو۔ لیکن صرف تب جب وہ انسان اس کا اہل ہو۔''

وہ چند لمحے لب بھینچے صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر چاپ اسٹکس نیچے رکھ دیں۔

''میں نے عصرہ کو نہیں مارا۔ مگر سارے ثبوت میرے خلاف جا رہے ہیں۔ میں ملائیشیا نہیں چھوڑ سکتی اور میرے پاس چھپنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں میں تمہارے پاس کیوں آئی ہوں؟'' پھر وہ اٹھنے لگی۔ ''نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''تالیہ..... بیٹھو..... ہم مل کے کوئی حل نکالتے ہیں۔''

''اگر تمہیں میری بے گناہی پہ یقین نہیں ہے تو باقی دنیا کو کیسے آئے گا؟'' وہ کھڑی ہوئی اور ہڈ سر پہ ڈال لی۔ پیروں میں رکھا بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''مجھے تمہاری مدد نہیں چاہیے۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔''

''تالیہ.....'' اس نے پکارا مگر وہ تلخی سے کہتی ہوئی باہر جا رہی تھی۔

''جو دوست تھے' ان کو کبھی میری بے گناہی کا یقین نہیں آئے گا۔ اور جس کو آئے گا' اس کی عمر ختم ہونے والی ہے۔ میں دوستوں کے معاملے میں بہت بدقسمت ہوں۔'' اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

ملاکہ کا ساحل اس گھنے اندھیرے میں ویران پڑا تھا۔ چاند بادلوں میں چھپا تھا اور لہریں قدرے پر سکون تھیں۔ وہ ریت پہ کھڑی تھی' ہڈ پیچھے گرا رکھی تھی اور چھوٹے بال پونی میں مقید تھے۔ وہ خاموشی سے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ لہریں لپک لپک کے آتیں' اس کے پیروں کو بھگو دیتیں' اور واپس پلٹ جاتیں۔ وہ اپنی حد سے جانے کے باوجود نہیں بڑھ سکتی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ پانی میں قدم آگے بڑھانے لگی۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی مایوسی تھی۔ دماغ جیسے کہیں دور الجھا تھا۔ ٹخنے پانی میں ڈوبنے لگے۔ وہ چلتی گئی۔ آگے — اور آگے —

''اب گھر جانے کا وقت ہے' پتری تالیہ۔ اس سے پہلے کہ سورج نکلے اور تمہیں کوئی دیکھے۔'' کسی نے اس کو کہنی سے پکڑ کے روکا تو تالیہ پتھر ہو گئی۔ پھر بے یقینی سے مڑی تو بوڑھا جادوگر سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ویسی چمکتی ہوئی تھیں اور چہرہ سپاٹ تھا۔

''تم — میرے پیچھے آ رہے تھے؟'' وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔

''تم دوستوں کے معاملے میں بدقسمت نہیں ہو۔ تم ملاکہ کی شہزادی تالیہ ہو اور تم یوں مایوس ہو کے اس پانی میں قدم نہیں رکھ سکتیں۔'' وہ درشتی سے بولا تو وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ریت پہ چلتے سڑک کی طرف جا رہے تھے۔

''تم ہمت کیسے ہار سکتی ہو؟ اتنی جلدی؟''

وہ سینے پہ بازو لپیٹے کندھے اچکا کے بولی۔

''میں..... سوچنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ میں صرف پانی میں کھڑے ہونا چاہتی تھی۔''

''تم پانی میں کھڑی نہیں ہو رہی تھیں' تم آگے بڑھ رہی تھیں۔ بنا کچھ سوچے سمجھے۔ اندھا دھند۔'' وہ اس کی طرف گھوما اور افسوس سے اسے دیکھا۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا تمہارے سامنے اتنا بڑا پہاڑ ہے جس پہ تم چڑھ نہ سکو؟''

''اس پہاڑ کو عبور کرنے کے لیے کوئی سڑک نہیں ہے' ذوالکفلی!'' وہ ایک دم دبا دبا سا چیخی۔ وہ دونوں آمنے سامنے ریت پہ کھڑے تھے۔ سیاہ آسمان اور تاریک سمندر خاموشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''تالیہ کے پاس تو ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔''

''اب نہیں ہے۔ میرے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے۔ سر چھپانے کو جگہ تک نہیں ہے۔ میرے دوست تک کھو گئے ہیں اور داتن —'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ''داتن کو کینسر ہے۔ وہ مر رہی ہے اور میں اس کو بچا بھی نہیں سکتی۔ میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی جس میں مجھے خوف کے سائے تلے رہنا پڑے۔ میں تنگ آ گئی ہوں۔''

''تو اپنے خوف کو شکست دو۔''

''میں نے پانچ دن قید میں کاٹے ہیں۔ قید میرا سب سے بڑا خوف ہے اور میں دوبارہ اس میں نہیں جا سکتی۔ میرے پاس چھپنے کے لیے بھی جگہ نہیں ہے۔ میں....'' اس نے پلٹ کر پانی کو دیکھا۔ ''میں اس سمندر میں چھپنے کے لیے جا رہی تھی۔ شاید یہ مجھے اپنے اندر پناہ دے دے۔''

''اگر میں نہ آتا تو...''

''اگر تم نہ آتے' تب بھی میں واپس پلٹ جاتی۔ ڈوب کے مرنے میں سنا ہے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور میں مزید تکلیف نہیں اٹھا سکتی۔'' وہ زخمی سا مسکرائی۔

''تمہیں سمندر کی پناہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ملاکہ میں پناہ گاہیں ختم نہیں ہوئیں۔'' وہ تلخی سے بولا اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

فجر روشن ہو رہی تھی جب وہ دونوں واپس اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ ذوالکفلی سیدھا راہداری

میں آگے آیا اور کونے سے میٹ ہٹایا۔ وہاں ایک لکڑی کا تختہ تھا جو فرش کا حصہ لگتا تھا۔ اس نے احتیاط سے اسے اٹھایا تو نیچے ایک ٹریپ ڈور تھا۔ ذوالکفلی نے اسے کھولا اور سر اٹھا کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ وہ جگہ ہے جہاں تک کوئی پولیس نہیں پہنچ سکتی۔ تم یہاں جتنا عرصہ چاہو رہ سکتی ہو۔ میں کسی کو ادھر داخل نہیں ہونے دیتا لیکن میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتا کہ تم سمندر میں پناہ ڈھونڈو۔"

تالیہ ایک قدم پیچھے کو ہٹی۔ اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔ "میں کسی قبر میں نہیں رہ سکتی۔ میرا سانس گھٹ جائے گا۔"

"کیا تمہارے پاس کوئی بہتر پناہ گاہ ہے پتری تالیہ؟" بوڑھا جادوگر پوچھ رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ٹریپ ڈور کے نیچے لکڑی کا ایک زینہ بنا تھا۔ وہ اسے عبور کر کے نیچے فرش پہ اتری تو اندھیرے میں اتنا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک طویل ہال ہے۔ دیوار پہ بٹن چمک رہے تھے۔ اس نے ایک بٹن دبایا تو مدھم روشنیاں جل اٹھیں اور سارے ہال کو روشن کر گئیں۔

وہ ہال اتنا وسیع تھا جتنا کہ اوپر موجود ذوالکفلی کا سارا گھر۔ وہاں قطار در قطار کتابوں کے ریک رکھے تھے اور ان میں پرانے چمڑے کی جلد والی کتابیں سجی تھیں۔ وہ کتابوں کا ایک عظیم الشان مقبرہ تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ ہال کے دہانے پہ کھڑی حیرت سے بولی۔ ذوالکفلی زینہ اتر کے نیچے آ رہا تھا۔ سادگی سے کندھے اچکائے اور بتانے لگا،

"یہ ممنوعہ کتابیں ہیں۔ اکثر کا تعلق پمبرو سے ہے اور باقی دیگر علوم کی ہیں۔ جادو، ان دیکھی طاقتیں.... علم طب.... یہ میرا ذخیرہ ہے۔ تمہارے کام کا نہیں ہے۔" وہ اب دو ریکس کے درمیان سے گزر کے ہال کے دوسرے سرے تک آیا اور اسے کونے میں موجود ایک کمرا دکھانے لگا جس کے اندر ایک بیڈ تھا۔ ساتھ ایک چھوٹا کچن جس میں بجلی کا چولہا تھا۔ چھوٹا فریج، باتھ روم اور ایک اسٹڈی ٹیبل کرسی سمیت۔ گویا پراسرار لائبریری کے اندر ایک شخص کی رہائش کا سارا بندوبست موجود تھا۔

تالیہ قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ مدھم زرد بتیاں روشن ہوتی گئیں۔ ریکس میں سجی کتابیں خاموشی سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں گرد کی بو بھی تھی اور کوئی عجب سی ویرانی بھی۔

"تم یہاں آرام سے رہ سکتی ہو۔ تمہیں سمندر کی پناہ گاہ کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا اور تالیہ بھی اداسی سے مسکرا دی تھی۔

کتابیں.... وہ ایک دفعہ پھر اس کی پناہ گاہ بن گئی تھیں۔ خاموش دوست۔ محرم راز۔

قید کی ساتھی ہو۔

☆☆☆

تین دن بعد:۔

دوپہر کے باوجود زیر زمین بنے کتب خانے میں نیم اندھیرا پھیلا تھا۔ اس کے تین دن اسی حالت میں گزرے تھے، جو فی الوقت نظر آ رہی تھی۔ کتب خانے کی دیوار میں موجود شیشے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر کمرے میں سنگل بیڈ پہ نیم دراز تھی۔ ہینڈز فری کانوں میں لگائے، وہ موبائل دیکھ رہی تھی۔ ماتھے پہ بل تھے اور آنکھوں میں بے بسی بھرا غصہ تھا۔ لباس وہی تھا۔ اور الجھے الجھے بال پونی میں جکڑے تھے۔

موبائل پہ خبروں کا بلیٹن چل رہا تھا۔

"تالیہ مراد جو کہ وان فاتح کی ایکس چیف آف اسٹاف بھی رہ چکی ہیں، اس کیس میں مرکزی suspect ہیں۔ پولیس کے مطابق چے تالیہ اس وقت لاپتا ہیں اور ان کی تلاش جاری ہے۔ اب ہم اس بارے میں اپنے پینالسٹ سے بات کریں گے۔" نیوز اینکر اب اسٹول پہ گھوم کے اسٹوڈیو میں موجود آدمی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ کے خیال میں چے تالیہ کا عصرہ محمود کے قتل میں کیا موٹیو ہو سکتا ہے؟" اینکر اپنے تئیں

سارے فیصلے سنا کے ملزم کو مجرم تصور کر چکے تھے۔

دانشور تجزیہ نگار نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔

"دیکھیں اگر یہ قتل تالیہ مراد نے کیا ہے تو صاف ظاہر ہے۔ عصرہ محمود بی این کی وائس چیئر پرسن تھیں۔ ان کی جگہ لینے کے لیے....."

"میرا خیال ہے کسی ذاتی رقابت کی وجہ سے....." ایک کے بعد ایک تجزیہ نگار اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔

اس نے زور سے بٹن دبا کے ویڈیو بند کی۔ پھر پیچھے گئی تو اشعر محمود کی ویڈیو کھل گئی۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا رپورٹرز سے بات کر رہا تھا۔

"ظاہر ہے میری بہن کی جان تالیہ مراد نے ہی لی ہے۔" وہ رعونت اور برہمی سے کہہ رہا تھا۔ "میں پولیس کو بتا چکا ہوں اور بار بار سب کو یاد کرواتا رہوں گا کہ عصرہ محمود نے خود ہمیں متعدد بار وہ کیک دکھائے تھے جو تالیہ ان کو بھیجتی تھی۔" سرد انداز، تنفر بھرا لہجہ۔ تالیہ نے لب کاٹتے ہوئے دیکھا۔ اگلی ویڈیو وان فاتح کی تھی۔

وہ چند افراد کی معیت میں کار کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ تیز ہوا سے اس کی ٹائی بار بار پیچھے کو اڑتی۔ وہ ٹائی پن لگانا بھول گیا تھا۔ شاید کوئی یاد کروانے والا موجود نہیں تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا مگر افسردہ لگتا تھا۔

مائیک پکڑے رپورٹرز کا ہجوم اس کے سامنے الٹے قدموں چلتا پیچھے کو آ رہا تھا۔ وہ سب کار پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"سر.... میڈیکل رپورٹ کے مطابق آپ کے جسم سے بھی آرسینک ملا ہے مگر اس کی مقدار بے ضرر ہے۔ کیا یہ اس لیے ہے کہ آپ نے کیک کم تعداد میں کھائے تھے؟"

وہ کار کے قریب رکا، اور سپاٹ سے انداز میں رپورٹر کو دیکھا۔

"میں آن گوئنگ تفتیش کے بارے میں رائے نہیں دے سکتا۔ یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ حقائق سامنے لائے۔"

"سر.... تالیہ مراد کا آپ کی بیوی کو مارنے کے پیچھے کیا مقصد ہو سکتا تھا؟"

فاتح نے دروازے پہ ہاتھ رکھے اسی ٹھنڈے تاثر کے ساتھ رپورٹر کو دیکھا۔

"یہ تالیہ نے نہیں کیا۔ پولیس اپنی نا اہلی چھپانے کے لیے ایک بے گناہ لڑکی کو مجرم بنا کے پیش کر رہی ہے۔ اور اگر بالفرض وہ واقعی اس میں ملوث ہے، تب بھی عدالت کے فیصلے تک ہم ملزم کو بے گناہ تصور کرتے ہیں۔ اس لڑکی کا میڈیا ٹرائل بند کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔" وہ برہم ہوا تھا۔ ایک رپورٹر نے پیچھے سے پکارا۔

"سر اگر ایسا ہے تو تالیہ مراد سامنے آ کے اپنی بے گناہی ثابت کیوں نہیں کر دیتی؟ وہ روپوش کیوں ہیں؟"

وان فاتح نے ابرو اچکائے۔ "ہمیں نہیں معلوم کون کس وقت کس مسئلے میں پھنسا ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی سامنے آ کے خود کو اس الزام سے بری کروا لے گی۔" اور ہاتھ کے اشارے سے "بس" کہہ کے وہ کار میں بیٹھنے لگا۔

"سر.... آپ ان کے باس رہے ہیں.... کیا انہوں نے آپ سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟" کسی نے سوال کیا تھا۔ فاتح نے سن لیا تھا مگر اس نے دروازہ بند کر دیا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔ البتہ اس سوال پہ پہلی دفعہ اس کے سپاٹ تاثرات میں دراڑ سی دکھائی دی تھی۔ جیسے وہ ڈسٹرب ہوا ہو۔ جیسے وہ اداس ہوا ہو۔ اور پھر کار آگے بڑھ گئی اور ویڈیو ختم ہو گئی۔

تالیہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نے فون رکھا اور ہینڈز فری کانوں سے نوچ اتارے۔ وہ گزشتہ تین دن سے خبریں ہی دیکھ رہی تھی۔ سارا ملک اس کو قاتل کہہ رہا تھا۔ نیلوفر کی کتاب سے بنائی چند دن کی شہرت ماند پڑ گئی تھی اور اب وہ عصرہ محمود کی قاتل اور ایک Fugitive بن کے رہ گئی تھی۔

اس نے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ لیے اور

ٹھوڑی ان پہ جمادی۔ جیسے کتابوں کے اس ویران مقبرے میں وہ خود کو اپنے ہی گلے سے لگائے محفوظ کرنا چاہ رہی ہو۔

خوف اور بے بسی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر ایک بات طے تھی۔ تالیہ کبھی دوبارہ پولیس کی پہنچ میں نہیں جائے گی۔ وہ اب کسی نئی جیل کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ ان کے ہاتھ دوبارہ نہیں آسکتی تھی۔

سامنے رکھے بک شیلف پہ ایک کتاب ترغیب دلانے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گہرے نیلے سرورق پہ سفید سفید الفاظ جگمگار ہے تھے۔

''خودکشی کرنے کے لیے تین پین لیس زہر۔''

وہ چپ چاپ اس کتاب کو دیکھنے لگی۔

کوئی شک نہیں کہ وہ کتابیں ممنوعہ تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو چھم سے اس دن کی یاد ان کے سامنے آ ابھری۔

وہ ریسٹوران کے مصنوعی جھونپڑے میں داتن کے سامنے بیٹھی تھی....

اس پل تاؤ نے بتیاں مدھم کی تھیں.... اور خالی دیوار پہ ایک منظر چلنے لگا تھا......

سڑک کنارے درختوں کی قطار...... اور نیچے گھاس پہ گلابی سفید چیری بلاسم کے پھولوں کی بچھی تہہ.... ہوا چل رہی تھی اور پھول گرتے جا رہے تھے......

''تم...... تم ٹھیک ہو داتن؟''

فضا میں جھینگے تلنے کی مہک تھی۔ اور شڑ شڑ کا شور بھی۔ قہوے سے بھری پیالیوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

''یہ کینسر کی دوا ہے' اور یہ بوتل تمہاری ہے۔ تم کینسر کی دوا کیوں لے رہی ہو؟''

پیالو رک گیا۔ جھینگے تلنے کا شور خاموش ہو گیا۔

''تم سن کے ہرٹ ہو گی۔ اسی لیے میں نے تم سے چھپایا۔''

پیالو تیز ہو گیا۔ کاؤنٹر پہ کھڑا تاؤ ٹھک ٹھک سوشی رول کو چھرے سے کاٹنے لگا۔ دیوار پہ ابھی تک پھول گرتے نظر آرہے تھے۔ اور سوشی رول کٹنے کی آوازیں...... ٹھک ٹھک ٹھک......

تالیہ نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کتابوں کے مقبرے میں بیٹھی تھی اور اس کے سامنے رکھی وہ بنا درد کے مار دینے والی زہریلے نسخوں کی کتاب تمسخر سے اسے دیکھ رہی تھی۔

بالآخر تالیہ نے ہاتھ بڑھایا اور دھڑکتے دل سے اس کتاب کو اٹھا لیا۔ ایسا زہر جو درد نہ دے.... کیا یہی اس کا آخری راستہ ہو سکتا تھا؟ آخری پناہ گاہ؟

(باقی آئندہ ماہ)

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Emale: id@khawateendigest.com

فروری 2020 کے شمارے کی ایک جھلک

مرجان

معاشرے میں حوا کی بیٹیاں اب بھی ونی جیسی رسم کا شکار ہیں،

اس لعنت کے خلاف صبا بہار کی کہانی کی چوتھی اور آخری کڑی،

روشنی کی چوری

شہر میں جعلی نوٹوں کو پھیلانے والوں کا اصلی کھیل بہت ہی تباہ کن تھا۔ جس سے بھرپور کہانیوں میں طرح کی آمیزش اور مزاح کی چاشنی بھرکا رانہ کیفیت پیدا کرتی ہے

اس کے علاوہ دیس بدیس کی رومینس، سسپنس اور تجسس سے بھرپور مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

فروری 2020 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

طاہرہ کاظمی

رستہ دیکھتی آنکھیں

پاکستان سے رضا بھائی کا فون تھا!

"آپ کب آ رہی ہیں، دس ماہ ہو گئے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"ابھی تو نہیں سوچا۔" ہم نے کہا۔

"کیوں؟ اتنا وقفہ تو کبھی بھی نہیں آیا۔ آ جائیں، ہم اداس ہیں۔"

ہم سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

کیسے بتاؤں کہ میرے مدار کی کشش کھو گئی ہے۔ وہ جو تڑپ تھی، وہ نہیں رہی۔

بچپن میں جب بھی اسکول سے گھر پہنچتے، داخل ہوتے ہی آواز دیتے، اماں آپ کہاں ہیں؟ میں آ گئی۔ ایک ٹھنڈے سائے جیسی مہربان آواز جواب دیتی۔

"جیتی رہو میری بیٹی، ہاتھ منہ دھو کے آؤ فوراً، تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے۔"

یہ معمول سالہا سال رہا، نہ ہماری پکار بدلی اور نہ ہی جوابی پیار بھری نظر۔

زندگی بدلی اور ہمارا ٹھکانہ لاہور میں میڈیکل کالج کا ہاسٹل ٹھہرا۔ ہر ماہ کے آخر میں گھر جاتے۔ پہلے سے بتایا ہوتا کہ فلاں شام کی ریل سے پنڈی پہنچوں گی۔ بھائی اسٹیشن پہ لینے آتا، گھر قریب آتا جاتا اور دید کی طلب بڑھتی جاتی۔ حسب توقع اماں گیٹ پہ ملتیں۔ میری وہی پکار، اماں! میں آ گئی اور وہی جواب۔

"جیتی رہو، ماں کب سے انتظار کر رہی تھی تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے، چلو نہا دھو کے کپڑے بدل لو۔" اور یہ کھیل ہم نے پانچ برس مسلسل کھیلا۔

وقت اور گزرا۔ ڈاکٹر بننے کے بعد شادی ہو گئی اور ہم صاحب کے ساتھ فوجی زندگی گزارنے پاکستان یاترا پہ نکل کھڑے ہوئے۔ دور دراز کے علاقوں سے سال میں دو تین دفعہ پنڈی جانے کا پروگرام بنتا۔ پہلے سے اطلاع دی ہوتی، جیسے جیسے گاڑی گھر کے نزدیک پہنچتی۔ ہمیں محسوس ہوتا کہ درمیان کے برس منفی ہو چکے اور ایک ننھی سی بچی پھر اسکول سے واپس گھر پہنچنے کو ہے۔

گھر میں داخل ہوتے اب ہماری پکار "اماں میں آ گئی" کے ساتھ کچھ ننھی منی آوازیں بھی شامل ہوتیں۔

"نانی ماں، ہم آ گئے۔"

اماں کا دمکتا چہرہ دکھائی دیتا۔ پہلے ننھے منوں کے منہ پہ بوسے دیے جاتے، ہماری باری بعد میں آتی۔

"اس دفعہ اتنے مہینوں بعد" دبی آواز میں گلہ ہوتا اور پھر وہی "میں نے تم سب کی پسند کا کھانا بنایا ہے، آ جاؤ فوراً، ٹھنڈا ہوا تو مزا نہیں رہے گا" اور پھر وہ کچھ دن ننھے منوں کو زندگی کی ایک شاندار یاد دے جاتے' جواب ان کی کتاب زندگی کا اہم حصہ بن چکا ہے۔

☆☆☆

وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور اب ہم ملک سے باہر تھے۔ ابا رخصت ہو چکے تھے سو اماں کے ہمارے پاس رہنے میں کوئی قدغن نہیں تھی۔ ہم ہسپتال سے جب گھر آتے، اماں اپنی مخصوص کرسی پہ بیٹھی ملتیں۔ ہم برسوں پرانی گرم جوشی سے لپک کے سلام کرتے اور وہ وہی کرتیں جو کرتی آئی تھیں۔ نہ اماں بدلیں اور نہ ہی ہم۔

لیکن کاتب تقدیر نے کسی اور بدلاؤ کا سوچ رکھا تھا۔ زندگی کا وہ حصہ اختتام کو پہنچنے کو تھا اور اماں ایک نئے سفر پہ روانہ ہو کے بدلنے کا آغاز کر چکی تھیں۔ وہ ایک ایسی کہانی لکھنے جا رہی تھیں جس کے بیشتر ورق خالی تھے، ان کے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی نہیں تھا۔

اماں الزائمر جیسے موذی مرض کا شکار ہوئیں اور سب کچھ بھول گئیں۔ وہ خاطر داریاں اور دل داریاں سب خواب ہوئیں۔ اب وہ اماں کی پرچھائی تھی۔

مرض اتنا بڑھا کہ پانچ سال پہلے اماں کا ہمارے پاس آنا ختم ہو گیا۔ ہمیں تو اماں کا چہرہ دیکھنے اور محبت سے سیراب ہونے کی عادت تھی سو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس میں خلل آتا۔ اماں کا آنا محال تھا، ہمارا جانا تو نہیں۔ اماں محبت کے درس بھول چکی تھیں، ہم تو نہیں۔ وہ کسی اور راہ کی بھول بھلیوں میں کھو چکی تھیں، ہم تو وہیں کھڑے تھے اماں کی انگلی تھامے۔

ہمارے ہسپتال کا قاعدہ ہے کہ اگلے برس کی چھٹی کا پروگرام گزرنے والے برس کے دسمبر میں مانگ لیا جاتا ہے تاکہ ہر کسی کی چھٹی شیڈول میں ڈالی جا سکے۔ ہم نے پانچ برس پہلے یہ سوچا کہ ہم ہر تین ماہ بعد ایک ہفتے کے لیے پاکستان جا کے اماں کے ساتھ چھٹی گزاریں گے، سو ہم نے یہی کیا۔

ہمارے سب ساتھیوں کو علم تھا کہ زندگی میں کیسی ہی اتھل پتھل کیوں نہ ہو، ہم ہر تین ماہ بعد پاکستان ضرور جائیں گے۔

صاحب، بچے، بہن بھائی سب ہمارے پروگرام سے آگاہ ہوتے۔ بعض دفعہ ہم پورے سال کے لیے ایک

ہی دفعہ میں چار ٹکٹ خرید لیتے، ہر تین ماہ بعد ایک بار۔ ہم ایرپورٹ اترتے، بھائی موجود ہوتا۔ گھر پہنچنے تک وہی کیفیت ہوتی، جو برسوں پرانی تھی۔ دروازہ کھلتا، وہیل چیئر نظر آتی اور وہیل چیئر پہ وہی مہربان شفقت بھرا چہرا۔ ہم اسی وارفتگی سے ملتے، وہ ماتھا چومتیں، بھی پچھانتیں، بھی نہیں۔ لیکن اس وجود کی موجودگی اور آغوش کی گرمی دل کو ہلکورے لینے پہ مجبور کرتی اور محبت کے نرم گرم احساس سے بھر دیتی۔

☆☆☆

ہماری موجودگی میں دوست احباب ملنے آتے۔ امی اپنی وہیل چیئر پہ اپنی دنیا میں گم اور ہم ان کا ہاتھ تھامے کزنز سے نوک جھونک میں مصروف۔ سب ہمارے اتنی جلد لاہور آنے پہ جملہ بازی کرتے۔ رضا کہتے۔ ''میں تو باجی کے پچھلی دفعہ کے وزٹ کے بعد سے ابھی تک بھائی تک بھی نہیں گیا تھا کہ باجی پھر آ گئیں۔ شفقت کہتے۔ ''سچ سچ بتایئے، آپ پھیری کا کام تو نہیں کرتیں کہ وہی اسی طرح بار بار چکر لگاتے ہیں اور اگر کرتی ہیں تو کیا لاتی ہیں۔''

ہم سب کی باتیں سن کے قہقہہ لگاتے اور کہتے اب میں تم لوگوں کو بزنس سیکرٹ تو بتانے سے رہی۔ ایک دفعہ ایسے ہی کسی مذاق کے دوران ہم نے گولڈ کی کچھ چیزیں بیگ سے نکال کے دکھا دیں جو ہماری ایک دوست نے منگوائی تھیں۔ شفقت کے چہرے پہ پھیلتی حیرانی و پریشانی اور باتوں کے فلک شگاف قہقہے ہم آج تک نہیں بھول سکے۔

اماں اس دوران کھوئی کھوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہتیں۔ اگر یاد کا کوئی جگنو کہیں چمک اٹھتا تو وہ ابا کی کوئی بات کرتیں یا اپنی ماں کو یاد کرتیں اور بچپن کی کوئی بات سناتیں۔

☆☆☆

پانچ برس بیت گئے ہمیں آتے جاتے، سفر کرتے، پاکستان کے سارے موسم دیکھتے، لیکن اماں سے ملنے کی ہڑک ختم نہ ہوئی۔ ہر دفعہ وہی اشتیاق وہی طلب۔ ذہن میں ایک خیال ضرور رہتا کہ نہ جانے کب یہ چاند چہرہ اوجھل ہو جائے گا؟ نہ جانے کتنی مہلت باقی ہے؟ سوائے دل بے تاب، دیدار کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ کر۔

اور پھر بالآخر وہ دن آن پہنچا۔ اماں نے ہم سے منہ پھیر کے رب کائنات کے بلاوے پہ لبیک کہا۔ اماں نے دنیا چھوڑی اور ہم نے اماں کے رخصت ہونے کے ایک ہفتے بعد ملک چھوڑ دیا۔

واپس آئے، چھٹی کا شیڈول دیکھا۔ 2019 میں جنوری، اپریل، اگست اور نومبر میں چھٹی منظور ہو چکی تھی۔ جنوری کی چھٹی میں اماں سے آخری ملاقات درخشتی ہو چکی تھی۔ سوچا، اب یہ اپریل، اگست اور نومبر کا کیا کریں؟ کشش کا مدار ٹوٹ چکا تھا، وہ جو ایک قوت کھینچتی تھی، آسمان کی وسعتوں میں گم ہو چکی تھی۔ اب کس کے لیے؟ کس کے لیے؟ ہم نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کہیں کوئی جواب نہیں تھا، اپنی ہی آواز کی بازگشت تھی۔

چھٹی کینسل کروانے کی درخواست دے دی۔ خریدے ہوئے ٹکٹ کینسل کروا دیے۔ وہ سفر، وہ ملاقاتیں، ماضی کا حصہ بننے جا رہی تھیں۔

دس ماہ گزر چکے، تین سہ ماہیاں!

رضا بھائی اور فائزہ بھابھی کا کہنا ہے کہ ان کے گھر سے اماں کی رخصتی کے ساتھ سب رونقیں بھی رخصت ہو گئیں۔ وہ جو اماں کی عیادت کے لیے آتے تھے، نہیں آتے۔ جو چاہت میں آتے تھے ان کا مدار ٹوٹ گیا۔

وہیل چیئر خالی ہے۔ اگر ہم جائیں بھی تو دروازہ کھلنے پہ وہ پُرنور محبت بھرا چہرا تو نہیں ہوگا۔ لیکن پھر سوچتے ہیں کہ شاید کہیں اور، گھر سے دور ایک خاموش بستی میں کسی کو انتظار ہو۔ کسی کا دل چاہتا ہو کوئی آئے، پھولوں کی چادر چڑھائے اور اسی طرح لپک کے پکارے۔

''اماں! میں آ گئی۔''

اور پرسکون سوئی اماں مسکرا اٹھیں اور زیر لب کہیں۔

''اتنی دیر لگا دی، میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔''

''میں ٹریول ایجنٹ کو فون کر رہی ہوں۔''